رجسٹرڈ نمبر ال ۳۰

جولائی سنہ [illegible]

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمن (مرتب)

۵۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (مرتب)

بکثرت اضافوں کے ساتھ دو کتابوں کے نئے اڈیشن

بزم تیموریہ جلد اول

اس جلد میں شروع کے تین مغل بادشاہ بابر، ہمایوں، اور اکبر کے علمی ذوق اور اُن میں سے ہر ایک کے دربار سے متوسل علماء، فضلاء، شعراء کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، بعد کی جلدوں میں جو زیر ترتیب ہیں، بعد کے مغل سلاطین اور اُن کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ

قیمت:- ۱۴-۲۵

بزم صوفیہ

تیموری عہد سے پہلے کے تمام ممتاز صاحب تصانیف صوفیہ کرام، مشائخ عظام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ اجمیری، بختیار کاکی، قاضی ناگوری، نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات تعلیمات و ملفوظات جس میں آٹھویں صدی کے مشہور شیخ طریقت عبدالحق نوشہ ردولوی کے حالات کا مستقل اضافہ ہے،

قیمت:- ۱۶-۲۵

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۲۱ ویں جلد

جولائی ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن   عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۱

ماہ جولائی ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۱

ماہ جولائی ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۱ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۷ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہمارے وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی کو اس وقت بڑی مقبولیت حاصل ہے، وہ نہ صرف اپنی سیاسی جماعت کے قابل قدر رہنما ہیں، بلکہ عام لوگوں میں بھی مقبول ہیں جن کے دلوں کی تسخیر کے لئے بار بار کہہ رہے ہیں کہ اس ملک کی جمہوریت کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کا ہر شہری نڈر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہے،

اس سے اردو بولنے والوں کو بھی نڈر ہو کر کچھ بولنے کا موقع مل گیا ہے، ہمارے دستور میں ہر زبان کو ترقی کرنے کا آئینی حق دیا گیا ہے، مگر ۴۷ء کے بعد سے اس ملک خصوصاً یوپی اور بہار میں بادشاہوں کو تاج وافسر اور حسینوں کو زیور پہنانے والی اردو ایک مظلوم، مقہور اور مفلوج زبان کی حیثیت سے دن کاٹ رہی ہے، اسکی ساری شاندار اور باوقار تاریخ نظر انداز کر دی گئی ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ ہندو مسلم کے میل ملاپ کے ایک مخصوص ماحول کی پیداوار نہیں ہے، اور اس کا اصلی وطن برج کا سبزہ زار نہیں ہے، اس نے عربی، فارسی، پراکرت، ہندی اور انگریزی ادب کا رس نچوڑ کر اسلوب بیان کو ایک نیا رنگ اور نیا ڈھنگ دیا ہے، اس کے لئے لطافت و حلاوت آنکھیں بچھاتی ہیں، اس کے قدموں میں برجستگی اور بے تکلفی لوٹتی ہیں، اس کو خود یہاں کی ملی جلی تہذیب نے سنوارا ہے تو اس نے بھی یہاں کی تہذیب کو نکھار کر اس میں بانکپن پیدا کیا ہے، یہ عالمگیر تہذیب و تمدن کی دولت سے بھی مالامال ہے، مختلف مذاہب کے لوگوں نے بڑھ کر اس کے گلے میں مرصع ہار بھی پہنایا ہے،

اس کی آواز واشنگٹن، ماسکو، تاشقند، لندن، بغداد، ٹوکیو اور انقرہ وغیرہ کی ریڈیائی لہروں میں بھی سنائی دیتی ہے، یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے شعبے بھی کھولے گئے ہیں، خود ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس کے مصنفوں اور شاعروں کو گراں قدر انعامات دے کر نوازتی بھی رہتی ہیں، پڑوسی ملک پاکستان سے جب جب لڑائیاں ہوئیں تو اسی کا سہارا لیکر وہاں کے لوگوں سے اعصابی جنگ بھی کی گئی، آزادی سے پہلے تو یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتی تھی، ع :- جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا،

اس کی تہذیبی، لسانی اور ثقافتی اہمیت کے باوجود اب اس کو متعصبانہ ذہنیت سے مارا جا رہا ہے اور
زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا۔ گذشتہ تیس برس کی ہماری حکومت نے ہمیشہ اس کے ساتھ کچھ ایسی
میں بڑی عداوت دکھائی ہے۔ تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا

اس بے قراری کے دور میں ملک کی جنتا گذشتہ حکومت کی زیادتیوں کے خلاف کھڑی ہوئی تو اردو
بولنے والے بھی اس کے ہمراہ ول، چاول، بین و بہار میں پیش پیش رہے۔ جب جنتا کے بقول یہ جابر حکومت ختم
ہوئی تو اردو بولنے والے بھی اس کے ساتھ شادیانے بجانے میں مشغول تھے، ان کو توی امید تھی کہ اردو کو جو
حق گذشتہ تیس ۳۰ سال کے اندر نہیں ملا تھا، وہ جنتا کی فراخدل، روادار اور ہر دلعزیز حکومت میں ضرور مل
جائیگا، مگر یکایک مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ اور پھر وزیر اعظم نے بھی اردو کے لئے ماتمی بگل بجا کر یہ اعلان
کیا کہ اردو عوام کی اکثریت پر مسلط نہیں کی جا سکتی، اس کو سن کر اردو بولنے والے کلیجہ تھام کر رہ گئے کہ ع

اک اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا اور سوکھا ہی کیا

یوپی اور بہار میں یہ زبان علاقائی قرار نہیں دی گئی، تو اس کو زندہ رکھنے کی لئے کوئی بہتر
کام نہیں دیکھتا، کسی اقلیت سے اس کی مادری زبان چھیننے کے معنی اس کی نسل کشی ہے جو ملک کے آئین
کے سراسر خلاف ہے مگر جب کوئی اقلیت سیاسی کھلونے اور جھنجھنے سے بہلائی جا سکتی ہو اور وہ چھوٹے چھوٹے عہدے
لے کر مطمئن ہو سکتی ہو یا اس کا کوئی خوش باش، خوش پوش اور خوش گو سیاست داں تھوڑی سی
رعایتیں پاکر اس کے سارے اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال سکتا ہے تو ایک طاقتور اکثریت کو پورا
حق ہو کہ اقلیت کی نہ صرف لسانی بلکہ تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی وراثت کو رفتہ رفتہ ختم کر کے اس کے
وجود کو غیر موثر بلکہ ناکارہ بنا دے۔

آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے جب اس ملک میں زبان کا جھگڑا شروع ہوا تھا تو
بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اردو کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں مگر

اردو بولنے والے بھی کچھ ایسے بیٹھے نہیں، مگر اب بھی اردو بولنے والے بیٹھے ہوچکے ہیں، وہ کسی جلسہ
میں سینہ کوبی یا تقریری مجلسوں میں گلہ مندی، یا اپنی کوتاہی کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنے ہی میں
اپنے پورے فرض کی ادائگی سمجھتے ہیں، گورمکھی بولنے والے بھی اقلیت میں ہیں مگر انھوں نے اپنے حق
کی بھیک نہیں مانگی ہے، بلکہ اپنا حق حاصل کیا ہے، اُن کے اکالی دل پر فرقہ واریت کا الزام آتا رہا
مگر انھوں نے اسی تنظیم کے ذریعہ سے اس کا عملی ثبوت دیا، کہ زندگی کی بزم مے میں کوتاہ دستی ہی سے
محرومی حاصل ہوتی رہتی ہے، مینا اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو بڑھ کر خود اس کو اٹھا لیتا ہے،

ہماری حکومت اس سے بے خبر نہیں کہ زبان کا معاملہ بہت ہی جذباتی ہوتا ہے، لسانی مسئلہ
ہی پر مشرقی پاکستان مشتعل ہو کر بنگلہ دیش بن گیا، آسامی اور بنگلہ دیش کے اختلاف پر کئی بار سخت
خونریزی ہوچکی ہے، جنوبی ہند شمالی ہند کی لسانی سامراجیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ
کی مختلف زبانیں یک جہتی کے نام پر کسی ایک رسم الخط کو بھی اپنانے کے لئے آمادہ نہیں، کیا ہماری
حکومت کو اس کا احساس نہیں کہ اردو بولنے والوں میں بھی اُن کے جذبات کی پامالی پر ناخوشگوار
ردعمل ہو سکتا ہے، یا وہ سمجھ چکی ہے کہ یہ غیرت وحمیت سے خالی ہو کر بے کفن کی ایک میت ہے جس کو
اُن کے شاندار ماضی کے مقبرہ کے اندر دفن کرنے کی دیر ہے، ہماری موجودہ حکومت کے سامنے
یہ تاریخی فیصلہ ہے کہ گذشتہ حکومت نے دل شکنی، دل آزاری اور دل خراشی کر کے اپنے سارے
شاندار اور زریں کارنامے پر پانی پھیر دیا، بدلے ہوئے حالات میں کیا دلجوئی، دل نوازی اور
دل آرائی کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اردو نہیں بولتے ہیں، اور کیا اردو بولنے والے اس ملک
میں یہ سمجھ کر اپنی زندگی گزاریں کہ ع

دل پژمردہ داغ ہی اپنا چمن ہے

مقالات

اقبال اور عظمتِ آدم

از جناب جگن ناتھ آزاد، سری نگر

اقبال نے جس طرح اپنی اردو اور فارسی شاعری میں عظمتِ انسان کے گیت گائے ہیں، اس کی مثال شاید کسی اور زبان کی شاعری میں نہ مل سکے، کلام اقبال میں کہیں تو عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے ہوئے نظر آتے ہیں، اور کہیں کہکشاں، ستارے، اور نیلگوں افلاک عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر دکھائی دیتے ہیں، کہیں مشتِ خاک کے فرشتوں سے زیادہ تابناک ہونے کی بشارت ملتی ہے تو کہیں یہ خاکِ پُر اسرار ثریا سے بھی اونچی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے،

اس ضمن میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا اقبال کے یہاں عظمتِ آدم کا تصور محض خیالی خولی ایک جذباتی تصور ہے، یا اس میں ایسے عوامل شریک ہیں جن کی بنیادوں میں شعوری اور سماجی حقیقتیں کام کر رہی ہیں۔

اس بحث کو شروع کرنے سے قبل یہ بیان کر دینا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ روئے زمین پر انسان کے ظہور کا مسئلہ اُن مشکل ترین مسائل میں سے ایک ہے، جن سے ذہنِ انسانی تخلیقِ کائنات سے لے کر آج تک دوچار ہوتا چلا آ رہا ہے، اکبر الٰہ آبادی نے اس دقیق مسئلے کو اپنے مزاح کا

موضوع بنایا، اور یہ کہہ کر بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی،

کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

حالانکہ منصور کے اناالحق کہنے سے اُس نظریۂ ارتقا کی تردید نہیں ہوتی جو ڈارون نے پیش کیا تھا۔ اناالحق پر اقبال کا یہ اعتراض تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ ہندو ویدانت کا اثر تھا[1]، لیکن یہ کہ اناالحق کہنے سے جدید نظریۂ ارتقا کی نفی ہوتی ہے، اقرین قیاس نہیں، کشف و اسرار کی اس کڑی منزل سے اقبال بھی گزرے ہیں، اور نظام کائنات میں انسان کا ایک اعلیٰ اور ارفع مقام متعین کرنے کے باوجود اُن کا ذوق تجسس اس قسم کے اشعار میں ظاہر ہوتا رہا ہے

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں　　کہاں جائے گا، آیا ہے کہاں سے

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے　　میں خود اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اگر مقصود کل ہوں میں تو مجھ سے ماورا کیا ہے　　میرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی ابتدا کیا ہے

دراصل اقبال کے نزدیک حقیقت کی بنیاد روحانیت ہے، اور اسکا روحانیت پر

---

[1] کائنات کے متعلق جب یہ نقطۂ نظر قائم ہو تو اس کا براہِ راست نتیجہ غیر شخصی جذب کے تصور کی صورت میں برآمد ہوا، سب سے پہلے یہ تصور حضرت بایزید بسطامیؒ میں رونما ہوا اور یہ اس مکتب کے مابعد کے مخصوص خط و خال میں سے ہے، اس تصور کے نشو و نما پر اُن ہندو زائرین کا اثر پڑا ہوگا جو ایران میں سے ہوتے ہوئے اُن بدھی مندروں کو جایا کرتے تھے، جو اس وقت باکو میں موجود تھے۔ اس مکتب کو حسین منصور نے بالکل وحدت الوجودی بنا دیا، اور ایک سچے ہندو ویدانتی کی طرح اناالحق (اہم برہم اسمی) چلایا تھا۔ (Development of Metaphysics in Persia by Iqbal)

(ترجمہ از۔ میر حسن الدین)

یہ سارا نظامِ عالم قائم ہے۔ زندگی کا یہ کارخانہ اقبال کی نظر میں محض ذرہتی یا غیر ذی روح عناصر کے باہمی امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے، چنانچہ آغازِ کائنات سے لیکر انسان کی ظہور پذیری تک کے منازل کو محض طبیعیاتی اور کیمیاوی اصطلاحات میں بیان کرنا اقبال کے نظامِ فکر کے ساتھ متصادم ہونے کے مترادف ہے، اس لیے اقبال کی شاعری میں اقبال کا نظریۂ انسان تلاش کرنے کے لیے اس تصور کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق اُس مادے سے ہوئی ہے، جس کا مقدر انجام کار ایک غیر متحرک اور جامد صورت اختیار کرنا ہے، بلکہ اس کے خلاف فلسفۂ اقبال کی رُو سے انسان علت العلل ماہیت کی بنیادی صداقت ہے، اقبال کا یہ نظریہ کلامِ اقبال میں جابجا نظر آتا ہے۔ "زبورِ عجم" میں کہتے ہیں۔ ؎

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد — این مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد
آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود — از شوخیِ آب و گل در گفت و شنود آمد

مہ و ستارہ کہ در راہِ شوق ہم سفر اند — کرشمہ سنج و ادا فہم و صاحب نظر اند
چہ جلوہ ہاست کہ دیدند در کفِ خاکے — قفا بہ جانبِ افلاک سوی ما نگرند

اقبال کے نزدیک یہ ایک بنیادی روحانی صداقت ہے کہ انسان خدا ہی کی تخلیق ہے، لیکن خالق اور مخلوق کا رشتہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اقبال کی شاعری میں یہ ایک ایسا پہلو اختیار کرتا ہے، جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اور اس کی مثالیں کلامِ اقبال میں اول سے آخر تک موجود ہیں، ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے — بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

بکشا این پردہ اسرار را — تا بگیرم این جان بے دیدار را
[illegible] تا امید از نگ دبر — تا بر بغیرت [illegible] یاد سحر

خدائی اہتمام خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ　　یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

لیکن اقبال نے خالق و مخلوق کے رشتے کی جو یہ تصویر بنائی مکمل تصویر نہیں بلکہ اس تصویر کے متعدد پہلوؤں میں سے محض ایک پہلو ہے، ایک اور پہلو جو اس تصویر میں شامل ہے، یہ ہے۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی　　مقام بندگی دیگر نہ لوں شان خداوندی

اس تصویر کا ایک اور اہم پہلو "زبور عجم" کی اس غزل میں نظر آتا ہے،

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست　　چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو ست
گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش　　گاہے درون سینۂ مرغاں بہ ہاو ہوست
در نرگس آرمید کہ بیند جمال ما　　چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست
آہے سحر گہے کہ زند در فراق ما　　بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست
ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکیے　　نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

ان تمام پہلوؤں میں اقبال خدا اور انسان کے رشتے کی محض ایک جھلک پیش کرتے ہیں کہ خواہ بندگی اقبال کے لیے درد سر ہو یا مقام بندگی دے کر اقبال شان خداوندی لینے کو بھی تیار نہ ہوں، یا خدا انسان کی تلاش میں ہو ــــ ایک نکتہ آئینے کی طرح روشن ہے، اور وہ ہے ذات مطلق سے الگ انسان کا اپنا وجود، سمندر سے الگ ندی کا اپنا وجود۔ قطرہ الگ، سمندر الگ۔ انائے مقید الگ انائے مطلق الگ،

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت و بہ دریا نرسید

یہ بدرجۂ رسیدن ہی انسان کی خودی کا کمال ہے، جسے فلسفۂ اقبال میں ایک مرکزی خیال کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ تو خیر خالق و مخلوق کے باہمی رشتے کے مختلف پہلوؤں کی بات ہوئی، بنیادی بات اس تعلق سے فکرِ اقبال میں یہ ہے کہ خدا نے کائنات اور انسان کو اپنے وجود کے اظہار کے لیے پیدا کیا۔ ذاتِ خداوندی تخلیقی قوتوں سے لبریز ہے، اور ان تخلیقی قوتوں کے قدرتی بہاؤ کا ایک مظہر تخلیقِ آدم ہے۔ اس مخلوق کے اندر ذاتِ خداوندی کی غیر محدود تخلیقی قوتیں تو نہیں لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں، جو جادۂ تکمیل پر گامزن ہو کر انسان کے اندر خدائی صفات کے پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہیں، لیکن یہ سب رحمتِ خداوندی کا ایک شمّہ ہے، اس کے سوا اس کی نہ کوئی اصل و حقیقت ہے نہ بنیاد۔

رحمتِ خداوندی کا یہ مظہر۔ انسان ۔ گلشنِ کائنات کا گلِ سرسبد ہے، یہ شاخِ نہالِ سدرہ ہے۔ خار و خسِ چمن نہیں ہے۔ ذاتِ مطلق نے ربوبیت کی آب و تاب اور شانِ ربانی انسان ہی کے ذریعے سے نمایاں کی ہے، تخلیقِ کائنات کا سبب دراصل تخلیقِ آدم ہی ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک اس عظیم ارتقا پذیر نظام میں انسان کا ظہور کوئی اتفاقی امر نہیں ہے اور نہ ہی اس بے حد و بے پایاں کائناتی حقیقت میں انسان محض ایک ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ

تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی — نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اقبال کے نزدیک کائنات کی تخلیق محض اس مقصد کے پیشِ نظر ہوئی ہے کہ انسانی انا کے ظہور اور اس کی تکمیل کے لیے زمین تیار کی جائے۔ کائنات اگر ایک تمثیل ہے تو

انسان اس تمثیل کا عظیم ترین کردار۔ انسان ایک ایسی کتاب ہے جس میں کائنات کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ انسان کے بغیر کائنات بالکل ایسی ہی ہے، جیسے "ہیملٹ" پرنس آف ڈنمارک کے بغیر۔

انسان کے روئے زمین پر ظہور کی تصویر اقبال نے اپنے سحر کارانہ انداز میں یوں پیش کی ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور — خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر — تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

انائے مطلق کے ساتھ انائے مقید کا رشتہ اقبال نے اپنی شاعری اور اپنی نثر میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انائے مقید انائے مطلق کے اندر ایک جاودانی زندگی بسر کر رہی ہے، اقبال نے انسان کو اکثر غیر فانی کہا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک انسان انائے مطلق کی تخلیقی قوت کے اندر ایک امکان کے طور پر موجود ہے گویا انائے مقید انائے مطلق کی ایک مخلوق ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ایک ہستی رکھتی ہے:

ز آثار خودی کس را خبر نیست — خودی در حلقۂ شام و سحر نیست
ز خضر این نکتۂ نادر شنیدم — کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست
خروشش بحر ناپیداکنارے — دل ہر قطرہ موج بے قرارے
حیات آتش خودی ہا چوں شرر ہا — چو انجم ثابت و اندر سفر ہا

ربانی حقیقت کے اندر ایک امکان کے طور پر انا کی موجودگی غیر فانی ہے، لیکن اس امر کو فراموش بھی نہ کرنا چاہیے کہ اس انا کی نمود کا سبب محض حکم ربانی اور تخلیق ربانی ہے، اور سلسلۂ ارتقاء ہی اس کے حصول کا باعث بنتا ہے۔ گویا حقیقت مطلقہ میں ایک امکان کے طور پر اس کا قیام بے شک قدیم سہی لیکن کائنات میں اس کی نمود حادث ہے،

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک — من و تُو میں پیدا من و تُو سے پاک
ازل اُس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اُس کی موجوں کے سہتی ہوئی
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

اقبال آدم کے جنت سے زمین تک کے سفر کو ایک سفر ارتقاء کے روپ میں دیکھتے ہیں، یہ زوال آدم نہیں بلکہ عروج آدم ہے، زمین آدم کے لیے کوئی مصائب خانہ نہیں ہے جہاں آدم کو سزا بھگتنے کے لیے بھیج دیا گیا ہو۔ یہاں اقبال قرآن کے نظریۂ ہبوط آدم کو جذبۂ ارتقاء کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ "عہد نامۂ قدیم آدم کی حکم عدولی کے لیے زمین کو برا بھلا کہتا ہے، لیکن قرآن زمین کو انسان کے لیے مسکن و مامن سمجھتا ہے، اور انسان کے لیے ذریعۂ منفعت قرار دیتا ہے، جسے اپنے تصرف میں لانے کے لیے انسان کو اللہ تعالےٰ کا شکر گذار ہونا چاہیے"[۱] وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔[۲]

---

[۱] Reconstruction of Religious Thought in Islam

. . . . گویا ہبوطِ آدم کی روایت بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہ بتانا نہیں ہے کہ انسان جنّت سے نقل مکانی کرکے زمین پر آیا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان جبلّی میلان کی ایک ابتدائی حالت سے چل کر آزادانا کے باشعور تصرف کی منزل تک پہنچا جہاں اس کے اندر شک کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی، اور حکم عدولی کرنے کی صلاحیت بھی۔ یہ ہبوط کوئی اخلاقی معزولی نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے سادہ شعور سے خود آگاہی کے اولیں پرتو کی جانب سفر ہے"۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں،

"انسان کا حکم عدولی کا پہلا عمل اُس کا آزادانہ طور پر اپنے اختیار کو استعمال کرنے کا پہلا عمل بھی تھا، اور یہی سبب ہے کہ آدم کا پہلا ارتکابِ جرم معاف کر دیا گیا تھا۔"

اور یہیں سے اقبال کے تصورِ عظمتِ انسان کی ابتدا ہوتی ہے، اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں۔

"جنّت میں جس کا ذکر اس روایت میں آیا ہے سب سے پہلا واقعہ جو رونما ہوا، انسان کا ارتکابِ جرم حکم عدولی تھا، جس کے فوراً بعد اسے جنّت سے نکال دیا گیا، دراصل قرآن اس لفظ (جنّت) کا مفہوم جس طرح سے اس روایت میں آیا ہے، خود بیان کرتا ہے۔ اس روایت کے دوسرے حصّے میں باغ (جنّت) کا جو بیان دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں نہ بھوک ہے نہ پیاس،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) اس آیت کا حوالہ صحیح نہیں دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے۔ یہ سورہ الاعراف کی نویں آیت نہیں بلکہ دسویں آیت ہے۔ (آزاد) ؎ اور ہم ہی نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا، اور اس میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کئے (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔

نگری نہ ہو پائی۔ اس لیے اس ضمن میں میری سوچ اس مفہوم کی جانب مائل ہے کہ قرآنی روایت میں "جنت" ایک ابتدائی حالت کے تصور کا نام ہے، جس میں انسان عملی طور پر اپنے ماحول سے لاتعلق رہتا ہے، اور نتیجۃً اس انسانی طلب کے نیش کو محسوس نہیں کرتا، جس کی نمود ہی دراصل انسانی تہذیب کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔"

طلب انسانی کے اس نیش سے انسان جنت میں نہیں بلکہ زمین پر آکے آگاہ ہوتا ہے، گویا اُسے اپنی صلاحیتوں اور ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا احساس ...... زمین ہی پر آکے ہوتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ انسان کو زمین پر نائب حق بنا کر بھیجا جاتا ہے، یہ منصب انسان کو جنت میں حاصل نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں زمین انسان کے لیے ہر اعتبار سے ایک ارفع تر مقام ہے،

بقول اقبال خیر یا نیکی کوئی جبر کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی نصب العین کے سامنے آزادانہ طور پر سپردگی کا نام ہے۔ اور آزاد انا جب آزاد انا کے ساتھ بغیر کسی جبر کے تعاون کرتا ہے تو خیر یا نیکی معرض وجود میں آتی ہے۔ ایک ایسا فرد (جو آزادیٔ فکر سے عاری ہے اور) جس کی حرکات محض مشینی حرکات کی حیثیت رکھتی ہیں، اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے خیر یا نیکی ظہور پذیر ہو سکے۔"

اپنے اس خیال کو اقبال جاوید نامہ میں نہایت ماہرانہ انداز سے پیش کرتے ہیں جب تخلیق کائنات کے پہلے ہی دن آسمان زمین کو ملامت کرتا ہے۔ اُفق سے پہلی صبح طلوع ہوتی ہے، اور وہ عالم نوزائیدہ کو اپنے پہلو میں لے لیتی ہے، یہ زمین اس وقت تک محض ایک خاکدان ہے۔ اس کا دشت کسی کاروان سے آشنا نہیں ہے، نہ اس کے پہاڑوں میں کوئی نہر

ہنگامہ آرا ہے، نہ اس کے صحرا پر ابھی بادل نے تراوش کی ہے، اشجار کی شاخیں اور طائروں کی نغمہ ریزی دونوں مفقود ہیں۔ نہ کہیں مرغزار ہے نہ رمِ آہو۔ اس کے بحر و بر روح کی تجلی سے خالی ہیں، زمین کا پیکر کہ طیلسان کی مانند ہے ایک پیچ و تاب کھاتے ہوئے دھوئیں پر مشتمل ہے، سبزہ بادِ بہار سے ناآشنا زمین کی گہرائیوں میں سویا ہوا ہے — ایسے وقت میں چرخِ نیلی فام نے زمین کو یہ کہتے ہوئے طعنہ دیا کہ میں نے کسی کو بھی اس خستہ حالت میں نہیں دیکھا جس خستہ حالت میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔ میری وسعتوں میں تجھ ایسا کور چشم کہاں ملے گا۔ میری قندیلِ خورشید کے بغیر تو روشنی سے محروم ہے۔ خاک اگر بلندی میں کوہِ الوند بھی بن جائے تب بھی وہ خاک ہی ہے۔ وہ آسمان کی طرح روشن و پایندہ نہیں ہو سکتی یا تو دلبری کے ساز و سامان کے ساتھ بسر کر یا احساسِ کمتری سے مرجا۔

زمین آسمان کے اس طعنے سے شرمندہ ہوتی ہے اور اس پر ناامیدی، دلگیری، اور اضمحلال غلبہ پا لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا کے حضور میں اپنی بے نوری پر تڑپ اٹھتی ہے حتیٰ کہ آسمان کے اس طرف سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

اے امینِ از امانت بے خبر　　غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر
روزہا روشن ز غوغائے حیات　　نے از اں نورے کہ بینی در جہات
نورِ صبح از آفتابِ داغ دار　　نورِ جان پاک از غبارِ روزگار
نورِ جاں بے جادہ ہا اندر سفر　　از شعاعِ مہر و مہ سیارتر
شستہ از لوحِ جاں نقشِ امید　　نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید
عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند　　عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند
راہ داں اندیشۂ او بے دلیل　　چشمِ او بیدار تر از جبرئیل

خاک و در پرواز مانندِ ملک ۔۔۔ یک رباطِ کہنہ در راہش فلک
می خلد اندر وجودِ آسماں ۔۔۔ مثلِ نوکِ سوزن اندر پرنیاں
داغ ہا شوید ز دامانِ وجود ۔۔۔ بے نگاہِ او جہاں کور و کبود
گرچہ کم تسبیح و خوں ریز است او ۔۔۔ روزگاراں را چو مہمیز است او
چشمِ او روشن شود از کائنات ۔۔۔ تا ببیند ذات را اندر صفات

یہی نظریہ اردو میں ایک اور انداز کا میخانۂ الہام بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، جب روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے،

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے ۔۔۔ دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے ۔۔۔ پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں ۔۔۔ آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں ۔۔۔ صنعت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے ۔۔۔ تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے ۔۔۔ محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہو راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبال خیر و شر کی بحث میں آزادی کو نیکی کے لیے ایک ثمرہ قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ [illegible] مفکر جسے طرح طرح کے اعمال کی اضافی اقدار پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک طرزِ عمل کو منتخب کرنے کی قوت حاصل ہے ظہور کی اجازت دینا دراصل

ایک بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے، اور ذاتِ حق نے یہ خطرہ مول لینا قبول کیا تو محض اسلئے کہ اسے انسان کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔[1] اب یہ دیکھنا انسان کا کام ہے، کہ وہ اس بھروسے کا کیوں کر اہل ثابت ہو سکتا ہے، شاید یہ خطرہ مول لینے ہی سے ایسی مخلوق کی (جس کی تخلیق خیرِ محض کے تانے بانے سے ہوئی ہو اور پھر پست سے پست سطح پر اُسے لے آیا گیا ہو) امکانی قوت کا امتحان بھی لیا جاسکتا ہے، اور انھیں فروغ بھی دیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے کہا ہے، اور پرکھنے کے لیے ہم تمھاری نیکی اور بدی سے آزمائش کرتے رہیں گے،[2] كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔[3] اس لئے خیر اور شر متضاد کیفیتیں ہونے کے باوجود ایک ہی کُل کے جزو ہیں۔"

ان تمام حوالوں کے بعد یہ بحث یہاں پہنچتی ہے کہ بقول اقبال انسان کی تخلیق تو خدا ہی کرتا ہے، لیکن اس کا ارتقا، مادّے (زمین) کا مرہونِ منت ہے، زندگی کی پہلی صورت بے شک ایک خلیاتی ہیئتِ اجتماعی ہو لیکن زندگی کا عروج (اشرف المخلوقات) انسان ہی ہے۔ اقبال کا نظریۂ انسان نظریۂ ارتقا کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے ایک اپنا مفہوم عطا کرتا ہے، صرف نظریۂ ارتقا ہی کیا، اقبال نے جو بھی عظیم نظریے ورثے میں پائے ہیں، انھیں بالعموم جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ انکی اپنے غور و فکر کے پیشِ نظر ایک نئی تفسیر پیش کی ہے، اس کتاب کا

---

[1] یہاں اقبال His immense faith in man کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ خدا کو انسان کی ذات میں بے انتہا اعتقاد تھا۔

[2] Reconstruction of Religious Thought in Islam میں اس آیت کا حوالہ بھی غلط دیا ہوا ہے، یہ طباعت ہی کی غلطی ہو سکتی ہے، دراصل یہ [illegible] الانبیا کی پینتیسویں آیت ہے نہ کہ چھتیسویں۔ (آزاد) [3] ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو [illegible] زندگی میں آزمائش

جو Reconstruction of Religious Thought in

Islam as I ... کے نام سے ہمارے سامنے ہے، ابتدائی مجتہدانہ کام تھا۔ Islam

...understand it ... حب وطن کا نظریہ اقبال تک پہنچا تو اقبال نے اسے ایک وسیع معنی

پہنائے۔ اشتراکیت کا نظریہ اقبال کے سامنے آیا تو اسے بھی اقبال نے جوں کا توں قبول نہیں کیا

بلکہ اس میں روحانیت کا عنصر داخل کرنے کی کوشش کی۔ اقبال اپنی ان کوششوں میں کامیاب

ہوئے یا نہیں یہ ایک الگ بات ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال نے ہر نظام

فکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور فکر و نظر کی روشنی میں اسے جانچنے پرکھنے میں

مصروف رہے۔ نظریہ عظمت انسان بھی انہی نظریات کے ذیل میں آتا ہے۔

جہاں تک ارتقا کا تعلق ہے، اقبال مادے کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں، لیکن مادے

کے متعلق ان کا نظریہ مادہ پرستوں والا نہیں بلکہ وہ مادے کو روح کا لباس ظاہری کہتے ہیں

مادہ اقبال کے نزدیک ایک "غیر نفس" یا "غیر انا" (Non-self) حقیقت ہے جسے

انائے مطلق اپنے ظہور کے لیے پس منظر کے طور پر معرض وجود میں لائی ہے۔

اقبال کی شاعری اور نثر دونوں اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ اقبال ارتقا

کے قائل ہیں، اور تعلیم قرآن کی روشنی میں اس کا جواز بھی مہیا کرتے ہیں۔ پیام مشرق کی نظم

"تسخیر فطرت" اس کی ایک عمدہ مثال ہے، جس میں ابلیس آدم کو "او بہ نہاد است خاک"

کہہ کے اسے سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے، اس ضمن میں انکار ابلیس کے ماقبل کے حصہ نظم کا

(بقیہ حاشیہ [illegible]) طور پر مبتلا کرتے ہیں اور پھر تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے۔ (ترجمہ فتح محمد

جالندھری) [illegible] نے سختی اور آسودگی کی جگہ with ease and ... th

[illegible] word. کیا ہے جو یقیناً بہتر ترجمہ ہے، (آزاد)

آخری شعر اقبال کا نظریہ اور وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازین گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

ارتقاء کے بارے میں اقبال کے خیالات ایک منضبط انداز سے ہیں اُن کی تصنیف Development of Metaphysics in Persia میں نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال نے ابن مسکویہ کے مختلف نظریات بالخصوص نظریۂ ارتقاء کو بڑی اہمیت دی ہے۔ "الکلام" میں مولانا شبلی نے ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقاء کا جو خلاصہ پیش کیا ہے اقبال نے اس کا مکمل طور پر حوالہ دیا ہے، اور اس سے قطعاً کوئی اظہار اختلاف نہیں کیا۔

ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقاء اور جدید نظریۂ ارتقاء میں اس قدر حیرت انگیز مماثلت کے باوجود اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس مماثلت کے اندر عدم مماثلت کے عناصر بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ابن مسکویہ کے نظریے کی بنیاد روحانیت پر ہے، اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی بنیاد مادیت پر۔ ابن مسکویہ اس سارے ارتقائی نظام کے لئے مادے کو قطعی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک اس تمام ارتقائی سلسلے کا مخرج و منبع ذات حق ہے، نہ کہ مادہ۔ واجب الوجود صرف خدا کی ذات ہے۔ مادہ واجب الوجود نہیں بلکہ حقیقتِ مطلق کے صدور مظاہر کے عمل میں ایک مرحلہ ہے۔ اور اس مرحلے کی غرض و غایت یہ ہے کہ انجام کار اُسے اس منظر کے لیے پس منظر کا کام دینا ہے، جسے اشرف المخلوق یا انسان کہتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں ارتقاء کا یہ سا[illegible]سلہ بے مقصد نہیں ہے، بلکہ بامقصد ہے کیونکہ مشیت ایزدی کے مطابق اس س[illegible] ارتقاء میں دو لمحہ ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے، جب انائے مطلق کے مظاہر میں سے انائے مقید

اعلیٰ ترین اور اشرف ترین مظہر بن کے کائنات میں جلوہ افروز ہو۔ اقبال اسی نظریۂ
ارتقا کے قائل ہیں۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است　　ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او　　غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است　　خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

یعنی انائے مطلق انائے مقید کے لیے سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انائے مطلق سے
انائے مقید کے پھوٹنے کا عمل شاعرانہ الفاظ میں وہی ہے جو شعلے سے شرر کے پھوٹنے کا عمل ہے

ضمیرش بحرِ ناپیدا کنارے　　دلِ ہر قطرہ موجِ بیقرارے
نہ او را بے نمودِ ما نمودے　　نہ ما را بے کشودِ او کشودے

سر و برگِ شکیبائی ندارد　　بجز افراد پیدائی ندارد
حیات آتش خودی ہا چوں شررہا　　چو انجم ثابت و اندر سفرہا
جہاں را از ستیزِ او نظامے　　کفِ خاک از ستیزش آئینہ فامے
درونِ سینۂ ما خاورِ او　　فروغِ خاکِ ما از جوہرِ او

صرف انائے مقید ہی کیا اقبال کے نزدیک ساری حقیقتِ کائنات کا مخرج
و منبع خدا ہی کی ذات ہے۔ یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اقبال سلسلۂ ارتقا
میں ایک تمثیلی ظہور کے قائل ہیں یعنی کم سطح والے ظہور کے بعد اونچی سطح والا ظہور سامنے
آتا ہے۔ اور ہر مرحلہ لامتناہی امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی خلیے کے ارتقا کی موجودہ
صورت ۔ انسان ۔ ارتقا کی قطعی اور آخری صورت نہیں ہے۔ انسان کے لیے
ذہنی طور پر بھی اور عضویاتی طور پر بھی ابھی کئی ارتقائی منزلیں منتظر ہیں۔ اقبال کو اس شعر

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

میں اشارہ صرف انسان کے خلا میں پرواز کی طرف نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس شعر میں اور بھی کئی اشارے مضمر ہیں۔ لفظ عروج ذہنی، روحانی اور جسمانی ہر طرح کی بلندی کے مفہوم کا حامل ہے۔ اس ضمن میں اقبال روح اور جسم کو الگ الگ کر کے دیکھنے کے بھی قائل نہیں۔ انھیں روح یا جسم میں کوئی تناقض یا تضاد نظر نہیں آتا۔ روح اور جسم اقبال کے نزدیک ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ "جاوید نامہ" میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے کہ گوئی محملِ جان است تن ۔۔۔ سرِّ جان را در نگر بر تن متن

محملے نے حالے از احوالِ اوست ۔۔۔ محملش خواندن فریبِ گفتگو است

چیست جان؟ جذب و سرور و سوز و درد ۔۔۔ ذوقِ تسخیرِ سپہر گرد گرد

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است ۔۔۔ با مقامِ چارسو خو کردن است

گویا اقبال کے نزدیک انسانی جسم کی تخلیق کسی ایسے مادے سے نہیں ہوئی جو روح سے قطعاً بے تعلق یا بے نیاز ہے، اور یہ بھی نہیں کہ جسم کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ روح اس میں قیام کر سکے۔ جسم بھی اسی حقیقت کا ایک پرتو ہے، جس کا ایک پرتو روح ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ الگ تصور کرنا اور الگ الگ بیان کرنا کوتاہیٔ فکر ہے، اور کوتاہیٔ زبان بھی۔ اس نکتے کو اقبال گلشنِ رازِ جدید میں یوں سحرکارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

تن و جان را دو تا گفتن کلام است ۔۔۔ تن و جان را دو تا دیدن حرام است

بجان پوشیدہ رمزِ کائنات است ۔۔۔ بدن حالے ز احوالِ حیات است

عروسِ معنی از صورت حنا بست		نمودِ خویش را پیرایہ ہا بست
حقیقت روئے خود را پردہ ہا ساخت		کہ او را لذتے در انکشاف است

اقبال کے نزدیک جسم اور روح میں نہ کوئی دوئی ہے نہ کوئی مغارقت۔ دونوں ایک ہی حقیقت کے مظہر ہیں، بلکہ اقبال تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں کی ساخت ایک ہی شے سے ہوئی ہے۔ روح بھی اعمال کے ایک نظام کا نام ہے، اور جسم بھی۔ دونوں کے اعمال میں کوئی حد فاصل قائم کرنا بھی ممکن نہیں۔ اقبال ایک چھوٹی سی مثال دے کر اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہتے ہیں جب میں میز پر سے کتاب اٹھاتا ہوں تو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اس عمل میں میرے جسم کا کتنا حصہ ہے، اور روح کا کتنا۔ روح کے اظہار کے لیے جسم کی موجودگی ضروری ہے، لیکن اقبال کے بیان میں ایک الجھن اسوقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ روح کی اہمیت جسم کے مقابلے میں زیادہ ہے، جہاں جسم اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لئے روح کا محتاج ہے، وہاں روح حقیقت ربانی کی محتاج ہے۔

یہاں اقبال روح کے بارے میں ایک اور لطیف نکتہ پیش کرتے ہیں۔ مسئلۂ ارتقاء کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ "ابن مسکویہ پہلا مسلمان تھا، جس نے نمود انسان کے متعلق ایک واضح اور کئی پہلوؤں سے ایک جدید تھیوری پیش کی۔" آپ کہتے ہیں کہ "رومی نے جب حیات جاوداں کے مسئلے کو حیاتیاتی ارتقاء کا مسئلہ کہا اور بعض مسلمان مفکرین کے نظریے کے برعکس اسے ایک ایسا مسئلہ قرار نہ دیا جو خالص مابعد الطبعیاتی انداز کے دلائل سے حاصل ہوسکے تو رومی کا یہ انداز فکر قرآن کی روح کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ تھا، لیکن نئی دنیا کیلئے مسئلہ ارتقاء امید اور جوش و ولولہ کا باعث نہیں بلکہ ایک پریشانی اور قنوطیت کا سبب

سبب بنتا ہے، اس کی وجہ یہ غیر مدلل جدید نظریہ ہے کہ انسان کی موجودہ ساخت، ذہنی بھی، اور نفسیاتی بھی، حیاتیاتی ارتقاء میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے، اور موت جسے ایک حیاتیاتی وقوعہ سمجھا جاتا ہے، تعمیری مفہوم سے عاری ہے۔"[1] یہاں اقبال یہ کہہ کر کہ دنیا کو اس وقت ایک رومی کی ضرورت ہے، جو انسان کے اندر ایک امید افزا رویہ پیدا کر سکے اور اس کے دل میں زندگی کے لئے جوش اور ولولے کی شمع روشن کر سکے، رومی کے مندرجہ اشعار دہراتے ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے،

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

اس کے بعد جیسا کہ تم جانتے ہو خالقِ اعظم نے انسان کو حیوانی حالت سے انسانی حالت تک پہنچایا چنانچہ انسان ایک فطری نظام سے دوسرے فطری نظام میں پہنچ گیا حتیٰ کہ وہ دانا اور توانا ہو گیا، جیسا کہ وہ اب ہے، اپنی اولین روحوں کے بارے میں اب اُسے کچھ یاد نہیں، اور اُسے موجودہ روح کی حالت سے بھی تبدیل کیا جائے گا۔[2]

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں، "لیکن جس نکتے نے مسلمان فلسفیوں اور فقیہوں میں خاصا اختلاف رائے پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا انسان کے ظہورِ نو (بروز) کے معنی یہ ہیں کہ اُسے اپنا پہلا مادی (جسمانی) ذریعہ بھی عطا ہوگا۔ ان میں سے اکثر علماء

---

[1] انسانی انا، اس کی آزادی اور حیاتِ ابد (اقبال)

[2] اس بات کے لیے میں معذرت خواہ ہوں کہ مثنوی مولینا روم کا نسخہ بروقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اقبال کے (فارسی لیے) انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے (آزاد) معارف۔ وہ اشعار یہ ہیں،

باز از حیوان سوئے انسانیش ‏ ‏ ‏ میکشد آں خالقے کہ دانیش

ہمچنیں از اقلیم تا اقلیم رفت ‏ ‏ ‏ تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقلہائے اولینش یاد نیست ‏ ‏ ‏ ہم ازیں عقلش تحول کردنیست

جن میں اسلام کے آخری عظیم فقیہ شاہ ولی اللہ بھی شامل ہیں اس خیال کے حامی ہیں کہ انسان کا انا خود بروز انا کے نئے ماحول کو ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے کسی نہ کسی جسمانی ذریعے کا متقاضی ہوگا۔[1]

اس مقام پر آکر اقبال کا اضطرابِ قلبی اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور چونکہ رومی اور شاہ ولی اللہ کے نظریات اُن کے عقیدے سے ٹکراتے نظر آتے ہیں، اس لئے وہ سورۂ ق کی تیسری اور چوتھی آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے رومی اور شاہ ولی اللہؒ کے نظریات کی تردید کرتے ہیں، اور کہتے ہیں" میرے نزدیک یہ آیات بڑی وضاحت سے کہہ رہی ہیں کہ کائنات کی ماہیت کے پیشِ نظر یہ بات ممکن ہے کہ انسانی اعمال کے قطعی جائزے کے لیے جس طرح کی انفرادیت کی ضرورت ہے اُسے کسی اور طرح سے برقرار رکھا جا سکے، یہ دوسرا طریقہ کیا ہے، اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے، نہ ہی اس "تخلیق نو" کی ماہیت کے بارے میں ہیں اس کے ساتھ جسم کا تصور وابستہ کرنے سے خواہ وہ کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو کوئی مزید بصیرت یا دقتِ نظری حاصل ہو سکتی ہے، قرآن کی یہ مطابقات ایک حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، لیکن اس کی ماہیت یا کردار کو فاش نہیں کرتیں، چنانچہ فلسفیانہ طور پر بات کرتے ہوئے ہم اس سے زیادہ آگے نہیں جا سکتے کہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے پیشِ نظر یہ انتہائی غیر اغلب نظر آتا ہے، کہ اس کا کیریر جسم کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جائے۔[2]

اس موقع پر اقبال کے مندرجہ ذیل خط کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جو انھوں نے اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا!۔

---

[1] انسانی انا، اس کی آزادی اور حیاتِ ابد۔ (اقبال)   [2] انسانی انا، اس کی آزادی اور حیاتِ ابد (اقبال)

مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے،

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ ترین مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اکبرؒ تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے، اُن کے اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہ تھی ؟"

(مکاتیب اقبال صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷)

اب اس بحث کو ہم اقبال کی نظم و نثر کو بنیاد بنا کر دور تک نہیں لے جا سکتے، بالخصوص جب کہ اقبال خود یہ کہہ کر اس بحث کا دروازہ بند کر دیتے ہیں کہ "یہ دوسرا طریقہ کیا ہے ہم اسکے بارے میں نہیں جانتے۔ نہ ہی اس "تخلیق نو" کی ماہیت کے متعلق ہمیں اس کے ساتھ جسم کا تصور وابستہ کرنے سے خواہ وہ کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو کوئی مزید بصیرت حاصل ہو سکتی ہے"۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس بحث کا دروازہ بند کر دینے کے باوجود اقبال انسان کے اندر چھپے ہوئے امکانات اور ان امکانات کی روشنی میں عظمت آدم کا جو تصور پیش کرتے ہیں، وہ فکر اقبال اور شعر اقبال کی عالم انسانیت کو ایک دین ہے۔

اقبال کامل

اس میں علامہ اقبال کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت)، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اقبال پر ایک جامع اور مکمل کتاب

مولفہ۔ مولانا عبدالسلام ندوی

فرہنگ جہانگیری کے نئے اڈیشن

کے

سلسلے میں کچھ گذارش

از جناب ریحانہ خاتون صاحبہ شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بعض لحاظ سے فرہنگ جہانگیری کے فارسی زبان کی سب سے اہم فرہنگ ہے، اس کا مولف جمال الدین حسین انجوے شیرازی ہے، جس نے ۱۰۱۷ ہجری میں اس کو مکمل کر کے جہانگیر کے نام سے منسوب کیا، جمال الدین اپنے عہد کے سیاسی امور میں کافی دخیل تھا، ابتدائی زندگی احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت کے زیر سایہ گذری، وہاں کی مشہور ملکہ چاند بی بی کی بہن سے اسکی شادی ہوئی، پھر مغلیہ دربار سے وابستہ ہو گیا، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ترقی کے مدارج طے کئے، دکنی امور کا ماہر تھا، اس لئے مغل دربار کی طرف سے سفیر بنا کر دکن بھیجا گیا، اس کی زندگی سیاسی سرگرمیوں میں گذری، اس کے باوجود علمی و ادبی کاموں سے غافل نہ رہا، فرہنگ جہانگیری اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

اس فرہنگ کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہیں، ۱۲۹۳ ہجری میں لکھنؤ سے طبع بھی ہوئی تھی مگر اس میں طباعت کی اتنی زیادہ غلطیاں رہ گئیں کہ اس کی

افادیت میں بڑی کمی واقع ہوگئی، خوشی کی بات ہے کہ ۱۳۵۱ شمسی میں مشہد یونیورسٹی میں پہلوی زبان کے استاد ڈاکٹر رحیم عفیفی نے اس کا ایک ناقدانہ ایڈیشن مقدمے، تعلیقات اور فہارس کے ساتھ تیار کیا، جو اس یونیورسٹی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوا ان کی ضخامت ۲۰۰۰ صفحات کی ہے، یہ مرتب و مصحح کی ایک بڑی علمی خدمت ہے، کتاب کی نفیس طباعت کی وجہ سے اس کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے،

اس قابل قدر ایڈیشن میں اگر بعض امور کی طرف توجہ ہو جاتی تو اس کی قدر و قیمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا، مثلاً انتقادِ متن کے متعلق دورِ جدید کا متفقہ اصول ہے کہ متن میں تاریخ، ادب، شعر وغیرہ سے متعلق جن چیزوں کا ذکر آیا ہو انکی نشاندہی ضرور ہونی چاہئے' اس کا علمی نام تخریج ہے، مصحح فرہنگ جہانگیری چند صفحات کے سوا اس پر سرے سے کاربند نہیں ہوئے ہیں، شعری، ادبی اور تاریخی امور کی نشاندہی کے بجائے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ مزید شعری و نثری شواہد پیش کریں، یہ بجائے خود مفید ضرور ہے، لیکن اگر صرف ان الفاظ و فقرات کے لیے شواہد نقل ہوتے جنکے شواہد فرہنگ جہانگیری میں نہیں ہیں، تو اس سے اس کی افادیت یقیناً بڑھ جاتی، لیکن چونکہ یہ التزام نہیں ہے، اس لیے اس ضخیم کتاب کا حجم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے،

تخریج کے اصول پر عمل کرنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو گمنام شعرا یا مصنفین متن میں مذکور ہوئے ہیں ان کے بارے میں کچھ تحقیق ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھی ایسی تحقیق سے بعض علمی و ادبی شخصیتوں کی گمنامی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، فرہنگ جہانگیری میں شعری شواہد تمام فرہنگوں سے زیادہ ہیں، جس طرح مولف کے پیش نظر ۴۳ فرہنگیں تھیں اتنی کسی اور فرہنگ نویس کے مطالعہ میں نہیں رہیں، اسی طرح جتنے شعری

نثری اور تاریخی شواہد اس میں موجود ہیں، فارسی کی کسی اور فرہنگ میں نہیں، اس لیے مولف کے پیش نظر ایسے متعدد شعرا کے دیوان تھے، جو آج یا تو مفقود ہیں یا بہت ہی کم لوگوں کی نظر میں ہیں، انتقادی متن کا تقاضا تو یہ تھا کہ فرہنگ کے تمام شواہد کے متعلق خاطر خواہ تحقیق ہوتی، لیکن اس انتہائی مشکل کام سے عہدہ برآ ہونا ایک تنہا شخص کے بس کی بات نہ تھی، ایک ادارہ کے ذریعے ایک طویل مدت میں یہ کام انجام پذیر ہوسکتا تھا،

ان گمنام شعرا میں کچھ ہندوستان کے بھی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں مصحح فرہنگ کا واقف نہ ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں،

جمال الدین حسین انجوے شیرازی نے یہ فرہنگ ہندوستان میں لکھی، اس بنا پر ہندوستانی عنصر کی زیادتی قدرتی امر ہے، ڈاکٹر عفیفی کے لیے ہندوستان کی تاریخ وجغرافیہ کا مسئلہ ہی کیا کم مشکل تھا کہ یہاں کی زبان وادب سے واقفیت کی توقع کیجاتی۔

ادھر فارسی فرہنگوں سے متعلق ہندوستان میں کچھ کام ہوا ہے، ان سے واقفیت فرہنگ جہانگیری کے انتقادی متن میں معاون ہوتی۔ جن فرہنگوں کا ذکر فرہنگ جہانگیری کے دیباچے ہی میں ہوا ہے، ان میں سے بعض نہ صرف ہندوستان میں دستیاب ہوگئی ہیں بلکہ ان کے انتقادی متن تیار ہو گئے ہیں، اور ایک آدھ زیور طبع سے آراستہ بھی ہوچکی ہیں۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر عفیفی مصحح فرہنگ جہانگیری کو واقفیت نہیں ہے، اس لیے ان کا بیان مختصر طریقہ سے ذکر کیا جاتا ہے،

۱۔ فرہنگ ابوحفص سغدی پر قاضی عبدالودود صاحب کا مقالہ

(چھاپ مجلۂ علوم اسلامیہ جلد اول سال اول)

۲۔ فرہنگ جہانگیری کے مولف کے حالات از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ علوم اسلامیہ جلد اول سال اول)

۳۔ فرہنگ زفان گویا، از پروفیسر سید حسن۔

(مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۳ء)

۴۔ فرہنگ زفان گویا میں ہندوستانی عنصر از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ اردو کراچی ۱۹۶۰ء)

۵۔ فرہنگ ادات الفضلا میں ہندوستانی عنصر از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ اردو کراچی ۱۹۶۰ء)

۶۔ فرہنگ دستور الافاضل از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ انڈو ایرانیکا کلکتہ ۱۹۶۸ء)

۷۔ فرہنگ فخر قواس از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۵ء)

۸۔ تحفۃ السعادہ یا فرہنگ اسکندری از ڈاکٹر نذیر احمد

(مجلۂ علوم اسلامیہ جلد ہفتم)

۹۔ مدار الافاضل جو فرہنگ جہانگیری میں فرہنگ اللہ داد سرہندی کے نام سے مذکور ہے، ڈاکٹر محمد باقر کے اعتنا سے لاہور سے طبع ہو چکی ہے، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس پر ایک مفصل تبصرہ "تحریر" کے شمارہ ۸ میں شائع کیا ہے۔

۱۰۔ مجمع الفرس سروری۔ از ڈاکٹر نذیر احمد۔ (معاصر پٹنہ)

فرہنگ جہانگیری کے ماخذ کی دو اہم فرہنگیں فرہنگ فخر قواس اور فرہنگ دستور الافاضل ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کو ایڈٹ کیا، اول الذکر طبع ہو چکی ہے، ان دونوں فرہنگوں کا ایک ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتبخانے میں موجود ہے، انکے

ی دو سرے نسخے کا علم نہیں۔ ڈاکٹر شہریار نقوی نے اپنی کتاب "فرہنگ نویسی" میں سوا
اس کے ایک نسخہ بھوپال (ہند) کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کی کتاب پر جو تبصرہ
راہنمای کتاب (تہران) میں شایع کیا تھا، اس میں اس غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے،
فرہنگ جہانگیری میں زفان گویا سے بھی استفادہ ہوا ہے، اس فرہنگ کے دو نسخے
حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں، ایک پٹنہ میں خدابخش خان اورینٹل لائبریری بانکی پور میں
ہے، دوسرا نسخہ لنین گراڈ میں محفوظ ہے،
فرہنگ شرفنامہ کا ایک ناقدانہ ایڈیشن ڈاکٹر سید طارق حسن شعبۂ فارسی مسلم
یونیورسٹی، علی گڑھ نے تیار کیا ہے۔
مذکورۂ بالا فرہنگوں میں سے کسی متن کی صحت میں بھی پوری مدد ملتی ہے۔ فرہنگ
جہانگیری کے موجودہ مصحح نے استفادہ نہیں کیا ہے، صرف ایران میں چھپے ہوئے لغات
مانند فرہنگ اسدی، صحاح الفرس معیار جمالی، مجمع الفرس وغیرہ سے مدد لی ہے۔
اداۃ الفضلا کے مصنف کی نسبت فرہنگ جہانگیری کے مقدمے میں دھاریوال
درج ہے، اگرچہ اس کے خطی نسخوں میں یہ لفظ دھارروال ہے، لیکن ڈاکٹر عفیفی نے
ڈاکٹر شہریار نقوی کی کتاب "فرہنگ نویسی" کی روایت کی بنا پر دھارروال پر دھاریوال
کو ترجیح دی، حالانکہ دھاروال صحیح اور دھاریوال غلط ہے، دھار مالوہ میں ایک مشہور
تاریخی مقام تھا، اور شاہان مالوہ میں سے دو بادشاہ دلاور خاں اور ہوشنگ کا دارالخلافہ
رہ چکا تھا، اداۃ الفضلا کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی خان بدر دہلوی دھار میں
سکونت پذیر تھا، اسی وجہ سے وہ دھاروال کی نسبت سے معروف ہے، ڈاکٹر نذیر احمد
نے "فرہنگ نویسی" پر تبصرہ کرتے وقت اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے،

نیز ادات الفضلاء والے مضمون (شامل مجلہ اردو، اکتوبر ۱۹۷۰) میں ص ۲ پر اس کی بحث ہے۔

ہندوستان کے بعض ایسے گمنام ہندوستانی شعرا کے بارے میں کام ہوا ہے، جن سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، ان شعرا کے کلام سے واقفیت ہوتی تو فرہنگ جہانگیری کی تصحیح میں موثر ہو سکتی تھی، اور بعض جگہ جو سہو ہوا ہے اس سے بچا جا سکتا تھا، ذیل میں اس سلسلے کے بعض امور کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ فہرست گویندگان (ص ۴، ۲۵) میں بدر الدین شاشی اور بدر چاچی دو الگ الگ شاعر قرار دئے گئے ہیں، دراصل یہ ایک ہی شاعر ہے، جس کا تعلق محمد بن تغلق (م: ۷۵۲ھ) کے دور سے تھا، اس کے قصائد عرصۂ دراز تک ہندوستان کے فارسی نصاب میں شامل رہے ہیں، یہ قصائد کا مجموعہ کئی بار طبع ہو چکا ہے، بدر ترکستان کے شہر چاچ کا باشندہ تھا، عربی میں چاچ شاش ہے، اسی وجہ سے وہ دونوں نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، بدر چاچ کے قصاید کے مجموعے کا ذکر صحیح کے ماخذ کتب میں موجود نہیں،

۲۔ برہان الدین بزاز التمتش، (م: ۶۳۳ھ) کے عہد کا شاعر ہے، "کاغ کاغ" کی اس کی ایک بیت شاہد کے طور پر (۱: ۲۹۴) منقول ہے، دراصل یہ بیت ایک ترجیع بند سے ماخوذ ہے، جو التمتش کی مدح میں لکھی گئی تھی، یہ "مونس الاحرار" تالیف کلاتی اصفہانی (سال تالیف ۷۰۲ھ) ص ۱۰۸۰ - ۱۰۸۲، نسخہ کتاب خانۂ مولانا آزاد، دانشگاہ علی گڑھ اور تذکرۂ خلاصۃ الاشعار، مولفہ تقی کاشی کے اس حصے میں موجود ہے، جو خود مولف کے قلم سے نسخۂ بانکی پور میں لی گئی ہے، (ورق ۲۹۰) برہان الدین بزاز کا ذکر، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۱ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان بلبن کے عہد میں بھی زندہ تھا، بزاز کا یہ منظومہ ڈاکٹر ماریہ بلقیس کے مقالہ بعنوان "گجرات و دہلی"

اشعار پراگندہ" میں مکمل طور پر درج ہے،

۳۔ تاج الدین بخاری کے کلام سے فرہنگ جہانگیری میں استفادہ ہوا ہے، بخاری بھی سلطان شمس الدین التمش کے دور سے تعلق رکھتا تھا، تذکرہ خلاصۃ الاشعار کے ملحقہ حصے اور تذکرہ عرفات عاشقین میں اس کے تین منظومے درج ہیں، ان کی مدد سے ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے ان تینوں نظموں کا ایک ناقدانہ متن اپنے مقالے میں شامل کر لیا ہے۔

۴۔ حمید قلندر فیروز شاہ تغلق کے دور کی اہم شخصیت ہے، وہ صاحب دیوان شاعر تھا، مگر اس کا دیوان اب نہیں ملتا، البتہ ڈاکٹر نذیر احمد کو اس کے کئی قصیدے ملے ہیں، جن پر مجلہ فکر ونظر ۱۹۶۵ء میں ایک تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے، حمید قلندر نے چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس کے عنوان سے جمع کئے تھے، جس کو پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے شائع کیا ہے، فرہنگ جہانگیری میں، حمید قلندر کے دو اشعار سے استشہاد ہوا ہے، مگر یہ دونوں اشعار ڈاکٹر نذیر احمد کو نہیں ملے۔

۵۔ سراج الدین سگزی کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری میں منقول ہیں، اس شاعر کے دیوان کے دو نسخے ڈاکٹر نذیر احمد کو ملے، ان کا باہمی مقابلہ کر کے اس کا ایک انتقادی ایڈیشن انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے شایع کیا ہے، مصحح فرہنگ جہانگیری کو اس دیوان سے استفادے کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ اس کی اشاعت سے قبل ہی فرہنگ جہانگیری کا کام ختم ہو چکا تھا، بہرحال اس سلسلے میں کچھ مزید وضاحت درج کی جاتی ہے۔

ص ۱۸۶۔ حسب ذیل بیت کلمۂ "ادرنگ" (بمعنی بیماری) کی توضیح کے لیے درج ہوتی ہے۔

داروغم بادرنگ عشقت — دربرون جان من شتابی

لیکن علامہ دہخدا نے فرہنگ جہانگیری کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے، اگرچہ جہانگیری کی پیروی میں رشیدی وغیرہ میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، اور سراجی سگزی کی بیت بطور شاہد درج ہوئی ہے بلکہ علامہ دہخدا لکھتے ہیں،

بادرنگ مرکب از "با" معنی مع، و "اورنگ" معنی البطرو، بقرینۂ شتاب

درمصراع دوم (لغت نامہ ص ۲۳۰)

یہ بیت ایک قصیدہ کی ہے، جو سلطان التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کی مدح میں اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ای حسن ترا ز لطف آبی — وی زلف ترا ز مشک تابی (دیوان ص ۲)

ص ۳۸۶۔ حسب ذیل بیت کلمۂ شادیچہ (بمعنی بالاپوش یعنی لحاف) کے معنی کیلئے بطور شاہد آئی ہے،

گل چو از شادیچۂ رومی برون آمد بباغ

زندہ افش ہجو اسقف ز نزخوان آمد برون

یہ بیت نصرت الدین ابوالخطاب خسرو پادشاہ مکران کی مدح میں ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

باز نوروز قدیم اندر جہان آمد برون — ابر نوروزی ز دریا درفشان آمد برون

(دیوان ص ۲۵۲)

ص ۹۳۸ - ۹۳۶۔ سراجی کی حسب ذیل بیت چرہ دہ بمعنی رنگ و لون کے لئے بطور شاہد آئی ہے،

زصنع اوست کہ شب چون سیاہ چردہ شود

سپہر سبز قبا سرخ رو شود ز شفق

یہ بیت سراجی کے "قصیدہ در صدر" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلع یہ ہے :۔

مقدری کہ باطراف قلزم ازرق ۔۔۔ بحکم اوست روان انجم آتشین زورق

(دیوان ص ۲۰۵)

ص ۱۲۵۸ ۔ اسپیجاب [اسفیجاب] ماوراء النہر کا شہر ہے، اس کے لیے سراجی کی یہ دونوں ابیات بطور شاہد درج ہوئی ہیں :۔

چشم ملکت را بروی روم و قسطنطین نظر

چشم جاہت را بسوی چاچ و اسپیجاب ہوی

سند جودش فلک در روم و قسطنطین نہاد

مقصد شکرش جہان در چاچ و اسپیجاب یافت

دیوان سراجی میں یہ دونوں بیتیں دو الگ الگ قصیدوں میں درج ہیں جن کے مطلعے یہ ہیں ۔

اے چو نرگس چشم و چون لالہ سیراب روی ۔۔۔ چند بینی رخت از چشم من سیلاب روی

(دیوان ص ۳۰۳)

در بہائی تربیت زان سنبل پرتاب تاب ۔۔۔ جانفزائی تقویت زان شکرین عناب یافت

(دیوان ص ۷۵)

ص ۱۰۵۶ ۔ افراسیاب بحذف الف اول بھی آیا ہے، اس کی سند کے لئے سراجی کی یہ بیت نقل ہوئی ہے :۔

کیخسرو ثانی آنکہ آمد　　　ہر بندۂ او فراسیابی (دیوان ص ۲۸۲)

یہ اسی قصیدہ کی بیت ہے جس کا مطلع ص ۱۰۷ پر بحث کے ضمن میں نقل ہو چکا ہے، ص ۱۳۱۲۔ شست بمعنی حلقۂ رسن وکمند زلف کے لئے سراجی کی حسب ذیل دو ابیات نقل ہوئی ہیں :۔

گرچہ میم وجیم گشتم از دل وقامت رواست

کان دہان ہمچو میمش دیدم وزلف چو جیم

درمیان جیم پیچ شست دارد جان شکار

درمیان میم دارد سی ودو دُر یتیم

یہ سراجی کے ایک قصیدہ کی دوسری وتیسری بیتیں ہیں جس کا مطلع یہ ہے،

زآن دہان ہمچو میم وزآن دو زلف ہمچو جیم

پشت خم گشتم چو جیم وتنگ دل ماندم چو میم

(دیوان ص ۲۳۵)

ص ۱۴۹۰۔ کفچک بمعنی دامن زین کی سند میں سراج الدین سگزی کی یہ بیت مندرج ہے :۔

از پی کفچک زین فرست صاحب خلد　　　گر بخواہی دہر از چادر حور اطلس (دیوان ص ۱۹۳)

یہ بیت ایک قصیدے سے ماخوذ ہے، جو سلطان تاج الدین ابوالمکارم بادشاہ مکران کی مدح میں ہے، اور جسکی ردیف اطلس ہے، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے :۔

ای بر اندام چو دیبای تو زیبا اطلس　　　چند پوشی تو بر اندام چو دیبا اطلس (دیوان ص ۱۹۳)

ص ۲۳۵۴۔ نیلوفر بخدمت داو بھی آئی ہے، اور اسکی سند کے لیے سراجی کی

حسب ذیل بیت پیش ہوئی ہے:

رزم تو نو بہار شد زانکہ در و برآورد		نیلوفر حسام تو از تن خصم ارغوان (دیوان ص ۲۴۶)

دیوان سراجی میں یہ بیت ایک قصیدہ میں شامل ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

دوش کہ دید بوالعجب چہرۂ مہر از نہان		کرد بزیر حقہ از چہ بساط آسمان (دیوان ص ۲۴۴)

۶۔ شہاب مہرہ کے اشعار فرہنگ جہانگیری میں درج ہیں، شاعر مذکور التمش اور رکن الدین فیروز شاہ (م: ۶۳۴ھ) کے عہد میں گذرا ہے، حمد اور نعت میں بڑے اچھے قصائد لکھے تھے، مگر دیوان ناپید ہے، تقریباً ۸ قصیدے اور چند نظمیں جو مونس الاحرار کلاتی، مونس الاحرار، جاجرمی، منتخب التواریخ بدایونی، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی، عرفات عاشقین وغیرہ میں ملتے ہیں، ان سے ان کی قادر الکلامی کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ یہ سارا کلام ڈاکٹر ماریہ بلقیس کے مقالے "Collection and F'ition of Scatterd verses" میں شامل ہے:

ڈاکٹر اقبال حسین کی کتاب Early Persian Poets of India، تالیف شمس العلماء پروفیسر عبد الغنی اور Pre Mughal Persian بزم ملوکیہ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن میں اس شاعر پر مفصل بحث شامل ہے،

۷۔ حکیم ظطری کے کلام سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، اس کا بھی تعلق ہندوستان سے تھا، اس کا ایک قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے، مونس الاحرار کلاتی ص ۹۱۳۔ اور تذکرہ خلاصۃ الاشعار ورق ۲۳۰ پر نقل ہے!

ہست گوئی عارض آن ترک زیبا آفتاب

گر بود ممکن کہ دارد بر مہ زیبا آفتاب

۸۔ ظہوری (نورالدین) اور میر محمد طاہر ظہوری ترشیزی فہرست گویندگان میں دو الگ الگ جگہ (ص ۲۵۰۰، ۲۵۰۰، ۲۵۸۰) مذکور ہیں، اس سے واضح ہے کہ مصحح فرہنگ جہانگیری کے نزدیک یہ دونوں الگ الگ شاعر تھے، مگر یہ قیاس غلط ہے، ظہوری کا نام نورالدین محمد تھا، میر محمد طاہر کوئی دوسرا شخص تھا، ظہوری سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مصحح نے ج ۱ ص ۲۱ کے حاشیہ میں نتائج الافکار کے حوالے سے اس شاعر کا غلط نام میر محمد طاہر درج کیا ہے، اگرچہ یہ بات عموماً مشہور ہے کہ ظہوری ترشیزی ہے، مگر یہ بھی غلط ہے، کیونکہ خود ظہوری نے قائن کو اپنا وطن قرار دیا ہے، چنانچہ ساقی نامہ میں لکھتا ہے :-

بہ ساق قائن فتادش عبور ظہوری از و کرد شہری ظہور

ڈاکٹر نذیر احمد نے "Zuhari's life and works" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، اس میں ان سارے امور پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، ظہوری کا دیوان، ساقی نامہ، سہ نثر چھپ چکے ہیں، مگر مصحح جہانگیری کے مراجعہ کتب میں ظہوری کی کوئی کتاب شامل نہیں، گو اس کے اشعار اس فرہنگ میں جابجا نقل ہوئے ہیں،

۹۔ عمید لوئکی نام کے شاعر کے کافی اشعار سے فرہنگ جہانگیری میں استشہاد ہوا ہے، عمید سلطان ناصر الدین محمود (م ۶۵۸ھ) اور سلطان بلبن کے عہد میں گذرا ہے، اس پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی کتاب بزم مملوکیہ میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے کافی اشعار ڈاکٹر نذیر احمد کو مل گئے، چنانچہ انھوں نے مجلہ فکر و نظر دانشگاہ علی گڑھ، سال ۱۹۶۳ میں اس پر ایک مفصل مقالہ سپرد قلم کیا تھا، پھر اس کے سارے اشعار یکجا کرکے ایک مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے M.A. کے Dissertation کے طور پر پیش کیا، جو بعد میں مزید ترمیم و اضافہ کے بعد ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں

شامل ہوئے، حال ہی میں ڈاکٹر نذیر احمد کو عمید کا ایک چھوٹا مجموعۂ دیوان مل گیا ہے، جو حمد و نعت اور دوسرے منظومات پر مشتمل ہے، اس دیوان سے بعض اہم باتیں معلوم ہوئیں، مثلاً عمید سامانی تھا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ اس کی دوسری نسبت کے بارے میں سخت اختلاف ہے، فرہنگ جہانگیری کے نسخوں اساس میں لویکی ہے، جو صحیح ہے، مگر مصحح نے اس کے بجائے ہر جگہ لوملی کو درست قرار دیکر داخل متن کیا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کو تولکی سمجھا تھا، لیکن خود عمید کے اپنے بیان کی رو سے اس کا تعلق لویک سے تھا، وہ کہتا ہے!

نسب از عمر بذیرم حسب از تبار لویک بکدام سلک دیدی دو گہر چنین منظّم

فلکا بزیر سقفت چو عمید لویکی کس ننہد بکاخِ معنی زچنیں قصیدہ سلّم

یہ ابیات ایک قصیدہ کی ہیں جس کا مطلع یہ ہے!

چو دہر مرا زمانہ بکف از چمانۂ غم بنشاط بزم گیتی قدح ستم دمادم

اس قصیدہ کو سیف جام ہروی نے مجموعۂ لطائف، تقی کاشی نے خلاصۃ الاشعار اور دوسری کتابوں میں بھی، نظامی گنجوی کی طرف منسوب کیا ہے، مگر صاحب گنجینۂ گنجوی نے لکھا ہے کہ نظامی کی طرف اس قصیدہ کی نسبت غلط ہے، یہ قصیدہ صفوی دور کے کسی نظامی تخلص کے شاعر کا ہوگا، اس میں شبہ نہیں کہ صاحبِ گنجینہ کا یہ قیاس تو صحیح ہے کہ یہ قصیدہ نظامی کا نہیں ہے، لیکن اس کو عہد صفوی کا قرار دینا سراسر بے انصافی ہے، اس لئے کہ اس قصیدہ کی زبان بہت قدیم ہے، اس کے علاوہ سیف جام کا مجموعہ عہد صفوی سے بہت پہلے یعنی اوائل نویں صدی میں مرتب ہو چکا تھا، پھر دیوان عمید میں اس کی شمولیت سے اس سلسلے کی ساری قیاس آرائیاں ختم ہو جاتی ہیں،

عمید لوکی کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری، فرہنگ سروری اور فرہنگ رشیدی وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں، اول الذکر فرہنگ میں ان اشعار کے علاوہ جو مذکورہ بالا قصائد میں کم از کم ۵۰ متفرق اشعار منقول ہیں، یہ سارے اشعار ڈاکٹر ماریہ ملقیس کے مقالے
Collection and Edition of scattered verses
میں یکجا کر دیئے گئے ہیں، ادبی تاریخ کے سلسلے سے یہ چیز نہایت درجہ اہم ہے کہ ایک شاعر جس کا دیوان موجود نہ ہو، اس کے کلام کا اتنا معتدبہ حصہ محض ایک کتاب سے حاصل کر لیا جائے، اسی بناء پر مجھے ڈاکٹر عفیفی کے اس طریقۂ کار سے اتفاق نہیں ہے کہ شعرا کی فہرست میں صفحات کی تعداد نہ درج کی جائے، عمید کے کلام سے ایسے وافر شواہد اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ دسویں صدی تک نہ صرف اس کا دیوان ملتا تھا، بلکہ وہ معروف و مقبول شاعر تھا، تاریخ ادب کے ایسے گوشے اسی طرح کی کتابوں کے مطالعہ سے روشن ہوتے ہیں، اس لئے کتاب کی اشاعت میں اس امر کا خصوصی لحاظ رکھا جائے کہ گمنام شعرا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔

ذیل میں عمید کے ایسے اشعار کی نشاندہی کی جاتی ہے جو اس کے قصائد میں شامل ہیں!
اس کے ایک مشہور حمدیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

اے از نہیب حکم تو خم زدہ قامت فلک   خطبۂ کبریائے تو وحدک لاشریک لک

یہ قصیدہ دیوان کے علاوہ منتخب التواریخ بدایونی اور مجموعۂ لطائف و سفینۂ ظرائف تالیف سیف جام ہروی میں شامل ہے اس کے تیرہ ابیات فرہنگ جہانگیری میں مختلف معانی کے شواہد کے طور پر نقل ہوئی ہیں، ظاہر ہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی منظومہ کے اس قدر ابیات شواہد میں نقل کیے جائیں اس طرح تو ایک طرف اس منظومہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے، دوسری طرف صحیح کی وجہ داری اس قصیدہ کی تاریخ کے سلسلے میں

اور پڑھ جاتی ہے۔

عبید کا ایک قصیدہ مناظرۂ شراب و بنگ کے عنوان سے مجموعۂ لطائف، خلاصۃ الاشعار اور عرفات عاشقین میں درج ہے، اس کی دو بیتیں فرہنگ جہانگیری میں نقل ہوئی ہیں ایک شرنگ کے ذیل میں جو نسخۂ مشہد میں موجود نہیں، مگر یہ نسخۂ لکھنؤ ج اول ص ۳۰۸ میں موجود ہے، دوسری شفترنگ کے ذیل میں، اس دوسری بیت کی جو صورت فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے، وہ اپنی اصل سے بہت مختلف ہے!

فرہنگ جہانگیری	مجموعۂ لطایف وغیرہ
نقل تو خشک میوہ و نقل منست تر	نقلت ہمیشہ بادہمہ سیب را گی
چون سیب و آبی و شکرامرود و شفترنگ	بادا غذای خصم تو نقل خزان عنگ

ان دونوں صورتوں کے اندراج پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تھی ایک دوسرے حد یہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے،

برخیز عید ازنہ فرو ست دل تو بگذر ز نغزل حمد خداوند جہاں گو

یہ قصیدہ صرف منتخب التواریخ بدایونی میں درج ہے، اس کی حسب ذیل تین ابیات فرہنگ جہانگیری میں بطور شاہد نقل ہوئی ہیں ا۔

صنعش بسر کوہ بر دیا ندہ شقایق در باغ و ماندہ بلعقش سوری و آلو (۱/۹۴)

ہان تا ندہی گوش بہ آواز دف و چنگ ہان تا نکنی رای صراحی کلاجو (۲/۱۹۳۹)

با کم قدیم تو چہ کسری و چہ قیصر در پیش قضای تو چہ خاقان و چہ تنگو (۲/۱۶۹۰)

منتخب التواریخ میں تنگو کے بجائے ہلاکو ہے، جب کہ جہانگیری میں 'تنگو' کی توضیح کے لیے بیت نقل ہوئی ہے، صاحب فرہنگ جہانگیری اور صاحب منتخب التواریخ معاصر بھی تھے مگر ان کے پیش نظر دیوان عبید کے جو نسخے تھے، ان میں اختلاف

موجود تھا، اس اختلاف کی وجہ بتائی جاتی تو مصحح کی تنقیدی نظر قابل وقعت ہوتی۔

۱۵۔ مطہر، مطہر کرہی، مطہر کرئی فہرست گویندگان ص ۹، ۵۰۲ میں الگ الگ درج ہوئے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصحح فرہنگ جہانگیری کے نزدیک یہ تین مختلف شاعر تھے، لیکن، ڈاکٹر نذیر احمد کا خیال ہے کہ تینوں ایک ہی شاعر ہیں، مطہر اور مطہر کرئی کے ایک ہونے میں کوئی سقم نہیں، سوائے اس کے کہ ایک میں وطنی نسبت درج نہیں ہوئی، کرہی کرئی کی تصحیف معلوم ہوتی ہے، مطہر کرئی وہی ہے، جو مطہر کرہ کے نام سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، یہ فیروز شاہ تغلق (م:۔ ۷۹۰) کے عہد کا باکمال شاعر ہے، اس کا دیوان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے ایک رکن ڈاکٹر عبد الرزاق نے مرتب کیا ہے، مگر ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا، دیوان کے چند نسخے ملتے ہیں، جن پر اورینٹل کالج میگزین لاہور میں کافی بحث آچکی ہے، اس کے نصیبہ اخوان کو جو فراہی کے نصاب صبیان کے طرز کا منظوم رسالہ ہے، ڈاکٹر نذیر احمد نے ایڈٹ کر کے مجلۂ علوم اسلامیہ میں شائع کیا ہے، بہرحال اگر قلمی دیوان تک مصحح فرہنگ جہانگیری کی رسائی نہ تھی تو شاعر کی حیثیت کے تعین کرنے میں ان کو کوشش ضرور کرنی چاہئے تھی،

۱۱۔ ملک عزیز اللہ بظاہر وہی شاعر ہے، جو شرقی سلاطین میں سے مبارک شاہ شرقی، (م ا۔ ۸۰۳) سے متعلق تھا، اس کا ایک طویل منظومہ سیف جام ہروی کے مجموعہ لطایف وسفینۂ ظرائف میں مندرج ہے، جس کو ڈاکٹر نذیر احمد نے مجلۂ فکر و نظر میں شائع کیا ہے،

۱۲۔ مولانا مغیث ہانسوی محمد تغلق (م ا۔ ۷۵۲) کے عہد کا شاعر ہے، یہ ہانسی کا رہنے والا تھا، اس کے چند قصیدے مجموعۂ لطائف میں منقول ہیں، جن کو ڈاکٹر نذیر احمد نے

مجلہ فکر و نظر ۱۹۶۵ کے ذریعے روشناس کرایا ہے، اس کی ایک نثری تالیف کا ذکر قوام بلخی نے بحر الفضائل میں کیا ہے، مولانا مغیث کے بیٹے مولانا ہمام کے بارے میں ہمیں کچھ اطلاع نہ تھی، فرہنگ جہانگیری میں ان کے اشعار کے شمول سے واضح ہوا کہ وہ بھی شاعر تھے۔

۱۳۔ یوسفی طبیب کے کافی اشعار فرہنگ جہانگیری میں ہیں وہ ہرات کا باشندہ تھا، بابر کے عہد میں ہندوستان آیا اور شاہی طبیب ہوا، ہمایوں کے عہد میں دار الانشا بھی اس کے سپرد کیا گیا، چنانچہ انشا پر اس کی کتاب طبع ہو چکی ہے، اس کا دیوان جو قصائد پر مشتمل ہے، مدراس یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ شرقیات میں موجود ہے، اس کے متعدد منظوم طبی رسائل ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد طیب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا موضوع یہی طبیب تھا،

ڈاکٹر رحیم عفیفی نے قارئین کی سہولت کے لئے فرہنگ جہانگیری کے سارے لغات حروف تہجی کے اعتبار سے آخر کتاب میں دو سو سے زائد صفحات (۱، ۳۳۲- ۲۵۰۲) میں جمع کر دیا ہے، اس فہرست میں ہندی اور ترکی وغیرہ کے ایسے الفاظ بھی شامل ہیں، جو فرہنگ میں "لغت" کے طور پر نہیں بلکہ مترادف لفظ کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں، ان کی یہ کوشش نہایت سودمند ہے، لیکن غیر زبانوں کے الفاظ کی تلاش اور ان کی صحیح املائی صورت کے تعین میں ان کو جن زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ ہر شخص نہیں لگا سکتا، ہندی الفاظ کے تعین کے سلسلے میں دشواریاں اور زیادہ ہیں، اس لئے کہ ہندوستان کی بعض آوازوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ کھ۔ گھ۔ تھ۔ ٹھ۔ بھ۔ جھ۔ چھ۔ وغیرہ کے لئے فارسی حروف تہجی میں الگ حروف موجود نہیں چنانچہ جن الفاظ میں یہ حروف ہیں ان کے بجائے سادہ حروف، ت۔ د۔ ڑ۔ ک۔ گ۔ ت۔ ب۔ ج۔ چ وغیرہ

استعمال ہوئے ہیں، اس عمل سے جو دشواریاں ہیں وہ اہلِ بصیرت پر پوشیدہ نہیں، رسم خط کی دشواری کے ساتھ ساتھ بعض جگہ ہندی الفاظ کے تعین میں دوسری طرح کی بھی خامیاں نظر آتی ہیں، لیکن مصحح کی یہ کاوش بڑی قابلِ ستائش ہے، ذیل میں اس سلسلے کے بعض امور کی نشاندہی کی جاتی ہے،

ارکیا ہندی۔ ۲/ ۱۶۴۰

بظاہر چھاپے کی غلطی کی وجہ سے ارکیا ہندی درج ہوگیا، اصل متن میں اس کو یونانی بتایا گیا ہے، اور ہندی مترادف مکڑی کا جالہ (= جالا) ہے،

انگلبیرہ۔ ۱/ ۱۲۴۴، ۲/ ۱۹۸۶

دراصل بائے فارسی یعنی پے سے لکھنا درست ہے، انگل پیرہ، انگل = انگلی، پیرہ = پیرا، درد۔

۱/ ۱۸۶ بادگولہ، بادرنگ کا مترادف ہے، جس سے آنتوں میں مروڑ ہوتا ہے، یہ بادگولہ (= گولہ) ہے، "د" "و" کی تصحیف ہے اور "گاف" کا قدیمی املا "کاف" درست نہیں پڑھا گیا، ہائے مختفی تقریباً سارے الفاظ میں الف کی جگہ استعمال ہوئی ہے،

۱/ ۱۹۰، ۲۰۰، ۲/ ۱۶۳۶ بار ہندی لفظ قرار دیا گیا ہے، مگر یہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس لئے کہ اصل متن میں یہ ہندی لفظ نہیں بتایا گیا ہے،

بکری ۲/ ۱۹۰۴ خول وجل کے مانند کوئی چڑیا ہے، جو راستے میں بیٹھتی ہے، اس تشریح سے واضح ہے کہ موجودہ بکری سے اس کا تعلق نہیں، یہ کوئی اور لفظ ہے، جس کی قرات مشتبہ ہے،

بل ۲/ ۱۹۲۵، ۲۲۲۹ شل میوۂ باشد گرد مانند بہی، آنرا بل نیز خوانند و بزبان ہندی بیل خوانند (۱۹۲۵)

بیل ہندی باشد و آنرا بل نیز نامند و از آن مربا پزند و از ہندوستان بجاہا برند و آنرا

مرباے بیل گویند (۲۲۲۹)

ہندوستان میں "بل" کے بجائے بیل ہی کہتے ہیں، بل فارسی ہے، اس کو ہندی قرار دینا

درست نہیں۔

بنج ۲/ ۱۱۳۱ آبی باشد کہ درحین پختن پلاخشکہ از خشکہ پلا دیگیرند و آنرا بہندی

بنج خوانند، واضح ہے کہ یہ لفظ پیچ پیچھ ہے، جو آج بھی متداول ہے، مصحح فرہنگ نے

درست نہیں لکھا۔

بھروہ ۱/ ۹۷۳ موجودہ تلفظ میں بھڑوا ہے۔

بیرہ۔ ۲/ ۲۰۱۷ نوالۂ گلولۂ آرد را گویند کہ بمقدار نانی علیحدہ ساختہ باشند

و آنرا بہندی بیرہ خوانند، صحیح ہندی لفظ پیڑا ہے، جو آج بھی متداول ہے، بیرہ دوسرا

ہندی لفظ ہے،

بیلو، ۱/ ۲۷۳ درخت اراک بود کہ از چوب آن مسواک سازند . . . . .

بزبان ہندی بیلو خوانند، واضح ہے بیلو کے بجائے صحیح لفظ پیلو ہے، جس کی مسواک کثرت

سے مستعمل ہے،

پادلی۔ ۱/ ۲۴۵ چاہی را خوانند . . . . . و بہندی پاولی گویند۔

صحیح لفظ باولی (باے عربی سے) ہے، پاولی غلط ہے۔

پتیل، ۱/ ۸۹۰ برنگ نوعی از فلزات بود کہ آنرا برنج خوانند و بہندی پتیل

خوانند۔ پتیل غلط ہے، پتیل (پاے مقدم) صحیح ہے۔

پرہ ۱/ ۸۷۳ پرازہ و آنرا نوالہ نیز گویند و بہندی پرہ [illegible]

صحیح ہندی لفظ پیڑا ہے، مصحح اگر نوالہ کے ہندی متبادل لفظ [illegible]

تو شاید اصلاح ہو جاتی، وہاں بیرہ ہے، اور یہاں پرہ، حالانکہ دونوں میں پیڑا ہونا چاہئے۔

جنگہ ۲/۱۶۵ جلنگ مرغ آبی را خوانند ...... و بہندی جنگہ نامند، ۱/۸۲۰

ار بیان مرغ آبی باشد و بہندی جھینگا باشد گویا ار بیان کے ذیل میں جھینگہ (جھینگا) صحیح لفظ ہے، لیکن جنکہ جو جلنگ کے ذیل میں پایا جاتا ہے، وہ غلط ہے، صحیح کلمہ جھینگا ہے۔

جوکت ۲/۱۵۹۲ بلندی چارچوب در را گویند ..... و آنرا بہندی جوکت خوانند، واضح ہو کہ صحیح ہندی لفظ چوکھٹ ہے، بہرحال جیم عربی سے لکھنا کسی حال میں درست نہیں۔

جوہ ۱/۲۱۴ لباد چوبی باشد کہ بر گردن گاو نہند ...... و آنرا بہندی جوہ خوانند پھر جغ کے ذیل میں مرقوم ہے، (۲/۱۴۲۴)

چوبی باشد کہ بر گردن گاو تبلہ کش بہند و آنرا جوہ نیز خوانند۔

دوسری روایت کی بنا پر مصحح نے جوہ کو فارسی لفظ قرار دیا ہے، (دیکھئے فہرست ص ۲۷۴۳ کالم ۲) لیکن یہ صحیح نہیں جوا ہندی لفظ ہے، جیسا کہ لباد کے ذیل میں خود فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے،

چپر ۱/۱۱۶۹ درد وک دو ر دوکہ خانۂ علف ..... و آنرا بہندی چپر نامند

چھپر ۲/۲۰۹۰ گومہ خانۂ باشد کہ از کاہ سازند و آنرا چھپر نامند

صحیح لفظ چھپر ہے، چپر کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر چھپر سرے سے غلط ہے، یہ بات اور بھی قابل توجہ ہے کہ ۱/۱۲۹۵ اور ۲/۱۶۹۲ میں دست بند اور تنورہ کے متبادل فارسی لفظ چپر کو ہندی لفظ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

خوب کلا و خوب کلان ۱/۲۹۷ خاکشو و خاکشی .... آنرا خوب کلان و شفترک نیز گویند .... و بہندی خوب کلا نامند

خرغول غرلود ۱/۹۶۱ بعربی لسان الحمل و بہندی خوب کلاد خوب کلان نامند

مری زبانک ۱/۱۱۶۱ و آرزا خوب کلان نیز نامند

واضح رہے کہ صاحب فرہنگ جہانگیری کی رو سے خوب کلاں فارسی اور ہندی دونوں ہے اور خوب کلا محض ہندی ہے، یہ قیاس درست نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ "خ" ہندی میں نہیں ہے، فرہنگ جہانگیری کے مولف کو کچھ سہو ہوا ہے،

دلمل ۱/۱۱۲۶ گرگن غلہ ای بود کہ ہنوز خوب نرسیدہ باشد و آرزا درمل و دلمل نیز گویند۔

ہرہ ۱/۱۱۴۴ ...... و آرزا کالبنک و ہربنک نیز نامند و بزبان ہندی خوشہ و دلمل جوار را نامند۔

دراصل خوشہ اور دلمل ہندی لفظ نہیں بلکہ ہرہ (دہرا) ہندی ہے، مصحح کا یہ خیال کہ دلمل ہندی لفظ ہے بے بنیاد ہے۔

دیوک۔ فرہنگ جہانگیری کے چار صفحات ۷۹۵، ۱۹۶۴، ۲۰۱۳، ۲۲۸۶ کے حوالے سے مصحح نے دیوک کو ہندی لفظ قرار دیا ہے، مگر اصل فرہنگ میں کوئی ادنیٰ اشارہ نہیں جس سے اس کو ہندی لفظ سمجھا جائے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

راے چنپا ۱/۱۶۴ مولف فرہنگ جہانگیری نے اس کو ہندی لفظ لکھا ہے، اور بالکل صحیح لکھا، مگر مصحح کی فہرست (ص ۲۴۶۲) میں اس کے ہندی لفظ ہونے کی صراحت نہیں

ریکھن ۱/۱۵ ء یہ ہندی لفظ ریکھن ہے،

سوب ۲/۱۴۸۶ چم .... آنرا پچ و غلہ برافشان نیز گویند و بہندی سوپ گویند، واضح ہو کہ یہ ہندی لفظ سوپ (بائے فارسی سے) ہے جیسا کہ خود فرہنگ جہانگیری

زیر نظر نسخے میں ہے، (ص ۲۰۲۳) آیا ہے ۔

سوپ بزبان ہندی غلہ برافشان را نامند وآن را چج نیز خوانند۔

سہاکن ۱/ ۵۲۵ صحیح لفظ سہاگن ہے ۔

سہاکہ ۲/ ۱۰۸۶ صحیح کلمہ سہاگہ ہونا چاہئے ۔

کالہ ۱/ ۶۵۰ کپ اندرون دہن باشد . . . وبہندی کالہ نامند اسی فرہنگ کے ص ۱۴۴ اور ۱۸۹۰ میں کالہ ہی درج ہے۔ میرے نزدیک کاف فارسی سے گالہ (بہ گالام) صحیح ہوگا، اس لئے کہ رخسار کے لیے آج بھی گال کا لفظ ہندوستان میں مستعمل ہوتا ہے ۔

کراد کلاد (کلاو) ۱/ ۱۱۰۲ کرسنہ نام غلہ ایست کہ طعم وی میان ماش وعدس بود ورنگش تیرگی زند . . . . . بہندی کراد کلاد گویند

دراصل کراو اور کلاو صحیح لفظ ہے، آجکل کراو مروج ہے "ر" سے "ل" کی تبدیلی عام ہے یہی دونوں لفظ اس فرہنگ کے موجودہ نسخے کے ص ۱۳۲۰ (ذیل کسیک) اور ص ۱۴۰۶ (ذیل مشنج) میں صحیح صورت میں یعنی کراو، کلاو مندرج ہیں ۔

کرکٹ ۱/ ۱۳۹ آفتاب پرست وآن را بتازی حربا وبہندی کرکٹ گویند

دراصل گرگٹ صحیح ہے، دونوں کاف کاف فارسی اور ٹ تائے ثقیلہ ہندی ہے۔

گلی ڈنڈہ ۔ یہ ہندی لفظ چالیک (۱/ ۲۰۰) اور غوک چوب (۲/ ۲۰۲۴) کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ گلی ڈنڈا ہے، جو ہندوستانی بچوں کا دلپسند کھیل ہے ڈال اور الف کے نہ لکھنے کا جواز ہے، لیکن کاف فارسی کے حذف سے مسائل الجھ جاتے ہیں۔

کیت فہرست ص ۲۵۲۵ میں اشتباہاً ہندی لفظ قرار دیا گیا ہے۔

کملت ۱/ ۴۰۰ ابخور، ۱/ ۱۸۰ آبشخور دونوں کا مترادف قرار دیا گیا ہے، صحیح لفظ گھاٹ ہے، مصحح سے سہو ہوا ہے۔

کھیر۔ ماغ . . . . . . نرم را گویند . . . . . . بہندی کھیر نامند و آن تیرگی بخاری باشد کہ در ایام زمستان در ہوا پدید گردد

واضح ہے کہ یہ لفظ کہر ہے، کھیر غلط ہے،

کوکھرو ۱/ ۱۳۳۱ نسک . . . . . خار خسک را گویند و آنرا بہندی کوکھرو نامند یہی ہندی متبادل صورت سہ کوھک (۲/ ۲۱۸۰) کے ذیل میں موجود ہے۔ واضح ہے کہ صحیح لفظ گوکھرو ہے، اور آج بھی مستعمل ہے۔

کیچوہ ۱/ ۹۴۹ خراطین کرمی باشد دراز . . . . . و آنرا بتازی خراطین و بہندی کیچوہ خوانند۔

دراصل ہندی لفظ کیچوا ہے، جیم عربی سے غلط ہے، جیم فارسی ہے۔

لوینہ۔ ۱/ ۴۷۸ پرہن . . . . . . خرفہ را گویند و بہندی لوینہ دکھول نامند

لوینہ غلط ہے لونیا (نون مقدم) صحیح ہے۔

ملامی۔ ۱/ ۹۳۲ چربک . . . . . سرشیر و آنرا چربہ نیز گویند و بترکی قیماغ و بہندی ملامی واضح ہے کہ یہ لفظ ملائی ہے، اور آج بھی اسی طرح مستعمل ہے،

اس گزارش سے کسی قدر اندازہ ہو جائے گا کہ اگر فرہنگ جہانگیری کے ناقدانہ متن کی تیاری کے موقع پر متذکرۂ بالا امور کا لحاظ رکھا گیا ہوتا تو وہ متن زیادہ وقیع قرار پاتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فرہنگ جہانگیری کی تصحیح کا کام نہایت مشکل اور صبر آزما ہے، اور اس سلسلے میں مصحح متن نے جتنی جانکاہی

کی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں، جن کو اس طرح کے کاموں سے سروکار رہتا ہے۔ مصحح کی کوشش اپنی جگہ نہایت قابلِ تحسین ہے، مقصود صرف اتنا ہے کہ آیندہ اشاعت کے موقع پر ابھی مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ابھی اس میں اضافے کی گنجائش باقی ہے۔

گمان مبر کہ بپایان رسید کارِ مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

دار المصنفین کی دو نئی کتابیں

تذکرۃ المحدثین

دوم

اس کا پہلا حصہ جو ائمہ صحاح کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحبِ تصنیف محدثین کے حالات و سوانح، اور ان کی شاندار حدیثی خدمات پر مشتمل تھا، یہ دوسرا حصہ چوتھی صدی کے آخر سے آٹھویں تک کے اکثر مشہور صاحبِ تصنیف محدثین اکابر اصحابِ حدیث کے حالات، حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ مولفہ۔ ضیاء الدین اصلاحی، قیمت۔ ۱۲ روپیے

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

حصہ اول

اس میں مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۰ء تک ان کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، یہ غالبیات میں ایک گرانقدر اور دلچسپ اضافہ۔

مرتبہ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت [illegible]

محمود گاواں

بہمنی دور کا ایک عظیم وزیر

از

ڈاکٹر محمد ظفر الدین سابق استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی

(۲)

(ج) دیوان اس کا دیوان زمانہ کے خورد برد سے محفوظ نہ رہ سکا، اب اس کا سراغ نہیں ملتا، مورخ فرشتہ نے غالباً گیارہویں صدی ہجری کے پہلے سہ ماہی میں اسے دیکھا تھا[۱]،

محمود گاواں کی شاعرانہ عظمت دیوان کی غیر موجودگی میں محمود کی شاعرانہ حیثیت کا تعین کرنا آسان نہیں، مورخ فرشتہ[۲] نے محض اتنا لکھا ہے کہ نظم و نثر میں اس کا کوئی ہم پلہ نہ تھا، مؤلف برہان مآثر نے سید علی طباطبائی کا قول نقل کیا[۳] ہے کہ گاواں نے نظم و نثر میں شان و شوکت دکھائی ہے، ان آراء سے محمود گاواں کی شاعری کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، تذکرہ صداقی السلاطین مناظر الانشاء اور ریاض الانشاء میں اس کے کچھ اشعار ملتے ہیں، ان سے بھی اس کی شاعرانہ

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۸ - [۲] ایضاً ص ۳۹۰،

[۳] برہان مآثر صفحہ ۱۳۳ میں لکھا ہے:-

"تا طراز آفرینش اقسام سخن نظم و نثر داد بلاغت دادہ"

صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے، اس کے خطوط میں لاتعداد اور کثیر حوالے ملتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے عربی اور فارسی کے ممتاز شاعروں کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا تھا، ہزارہا اشعار اس کی نوک زبان پر تھے،

عربی شاعروں میں وہ امراء القیس، متنبی، ابو تمام، ابو نواس، ابن بابک، ابوالبرکات ابن منشر، ابن سکرہ، ابن حجاج، ہمادی، ابوالطیب، ابوالاسود، ابوالعلا معری، صفی صفی الدین حلی کے حوالے دیتا ہے، فارسی شاعروں میں اسدی، انوری، ظہیر فاریابی، سعدی، حافظ، سلمان ساوجی، خلاق المعانی کمال اسمٰعیل، شرف الدین یزدی، شاہی، خواجو کرمانی، بابا سودائی، ابن حسام، جمال ترکی تبریزی کاتبی، نظیری، اور امیر خسرو وغیرہ کے حوالے وہ اکثر دیتا ہے،

محمود گاواں کے اشعار مرصع، پرجوش، دلگداز اور پردرد ہیں، اس کے خیالات بلند اور اور جذبات پاکیزہ ہیں، الفاظ کی بندش چست اور محاروں کا استعمال برمحل ہے فصیح الفاظ اور صنائع و بدائع کا استعمال اس دور کی شاعری کی خصوصیات ہیں، اس دور میں الفاظ پر زیادہ زور صرف کیا جاتا تھا، اس سے شعر کی بے ساختگی مجروح ہو جاتی ہے، اور تصنع جھلکنے لگتا ہے محمود گاواں بھی اپنے ہم عصروں کی روش سے دامن نہ بچا سکا لیکن اس کا رجحان فطری شاعری کی طرف تھا، اس لئے اس کے اشعار فطری، غیر مبہم، واضح فصیح اور پرجوش ہیں، فلسفیانہ خیالات، اخلاقی درس، زندگی کے قیمتی تجربات اور نازک و پیچیدہ مسائل بھی اس کے اشعار میں ملتے ہیں، ان چیزوں نے اس کی شاعری کو فطری رنگ عطا کیا ہے، اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں صوفیانہ خیالات سموئے ہیں جس سے اس کی شاعری کا حسن بڑھ گیا ہے، اور تاثر میں اضافہ ہو گیا ہے،

اس کی شاعری کے باضابطہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ ریاست کے مسائل میں نہ الجھتا اور باضابطہ شاعری کرتا تو بلاشک وشبہ وہ اپنے دور کے بہترین شاعروں میں

گن جاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بے ساختہ اور قلم برداشتہ شعر کہے ہیں۔
اس کے کچھ منتخب اشعار درج ذیل ہیں،

شستم بہ آب چشمۂ اخلاص ہر دو دست — از لوح جان و صفحۂ دل ہرچہ غیر اوست

گر بے نقاب دیدۂ دل دید دیدہ دوست — کافر ولیست گر نظرش جز بسوی دوست

گرمی کنی عمارت این دل کہ شد خراب — انوار مہر بر دل ویران من بتاب

در امید وصل او دور حیات من صرف — ناوک حسرت شوق او دل شد ہلاک جان ہدف

چتر دولت تخت دل بے جم عشق ہیچ نیست — بے خط و داغ عاشقی باد سواد تن تلف

جیب لباس عمر تا کہ بوسۂ کفش — بندم از آنکہ آیدم دامن زندگی بکف

خالص چو گشت نقد روان ز آتش بلا — باشد بنام عشق تو تا لامکان روان

چون صبا در غنچۂ گل تنگ بو آن دہان — یافت زد بوسہ بکام و بوی خوش بگرفت زبان

عشق است در خمیر من و داغ بر دو رخ — پوشیدہ نیست از تو شعار و دثار من

نظرت حرف افزون است ز طاق فلک بیرون — کنوز درد و غم کائنات الا در دل محزون

کسوت عشق تو در قامت دل می دیدم — چو پوشیدہ بہ بالاش نہ کم بود نہ بیش

گر نظر بر من کنی دورم ز تو بے نسبتی — یک چون قطرہ کہ با ذات وارد الفتی

ز حسرت گشت چون یاقوت اشکم منقلب در خاک — کہ از جنس جواہر بود یاقوت شمالی

ز بسکہ تنگ شدست جہان اگر دو تر — ز بیداد تنگ چرخ افغان خیزان می کند

در جوہار عقل چون بخت شود بلند — دشمن با دعا و شہ کے میرسد گزند

ہر دعائیکہ شد از بندہ بحضرت مرجع — مستجاب است یقین چون شدہ از خود خضوع

کے بغیر تو چون رخ کشتگہ در ہمہ حال — کے بغیر تو باشد نزد عقل محال

کبوتر خانۂ روحانیاں را | نقاط و حروف کے دام ہست ارزن
علم است چوں حیات ابد اے پسر بکوش | وز چشمۂ حیاتِ خود آب حیات نوش
ہمہ عالم نگراں تا نظرِ بخت بلند | ہر کہ افتد کہ تو کیدم نگرانش باشی
چوں بشنوی سخن من اگر بفعل آری | کلید گنج سعادت در آستیں آری
مگر تو در نصیحت بدرج دل نہ نہی | بسے خوری زکف دہر سیلی خواری

عظیم صوفی عالم مولانا جامی اس کی شاعری کے بارے میں بلند رائے رکھتے تھے،[۵۱]

نظم و نثرش بیں کہ پنداری ز برجِ چرخ کرد | عقد پروین را در آثارِ بنات النعش جا
با خود افتاد است مخزونات گنج پر گہر | بر بساط عرض بعضے متصل بعضے جدا
فقرہ ہائے نثر او قوتِ دہ پشتِ ہنر | نکتہ ہائے نظم او روشن گرِ طبعِ ذکا

گاواں کے قصائد محمود گاواں نے ریاض الانشاء میں اپنے ایک[۵۲] عربی اور تین فارسی[۵۳] قصیدے شامل کئے ہیں، فارسی کا ایک قصیدہ ہمایوں[۵۴] شاہ (۸۶۲ھ تا ۸۶۵ھ / ۱۴۵۸ء تا ۱۴۶۱ء) اور دو سلطان محمود شاہ[۵۵] (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ / ۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۳ء) کی مدح میں ہیں، عربی[۵۶] قصیدہ سلطان محمد شاہ کی مدح میں ہے، اور بدیع ہمدانی کے ایک قصیدہ کے اسلوب میں لکھا گیا ہے، عربی قصیدہ سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی ہی کی طرح عربی اشعار بہ آسانی کہہ سکتا تھا،

ایک فارسی قصیدہ جو سلطان محمود شاہ کی مدح میں ہے، اس میں ۸۴[۵۷] اشعار ہیں، اور حکیم حسام الدین انوری کے ایک قصیدہ کے اسلوب میں کہا گیا ہے، انوری کے قصیدہ کا مطلع ہے،[۵۸]

---

[۵۱] کلیاتِ جامی ص ۵۳ اور ۵۴، کلیات میں غلطی سے بجائے "نکتہ" "تیغ" چھپ گیا ہے، [۵۲] ریاض الانشاء ص ۱۵۰ تا ۱۵۲، [۵۳] ایضاً ص ۱۴۳ تا ۱۵۰، ۱۵۱، ۳۹۹ تا ۴۰۲، [۵۴] ایضاً ۱۴۳ تا ۱۵۰، [۵۵] ایضاً ۳۹۹ تا ۴۰۲ [۵۶] ایضاً ۱۵۰ تا ۱۵۲، [۵۷] ایضاً ۱۴۳ تا ۱۴۶، [۵۸] قصائد ص ۲۴۷، یا ۲۴۰، اس بحر اور قوافی میں انوری

اے کردہ در رہ عشق تو اشکم بجوں بدل　　　وے ایزدم سرشتہ ز عشق تو در ازل

گاوان کے قصیدہ کا مطلع ہے،

اے مہر بے زوال تو اے طالع ازل　　　تا مہر این جنین بہ غم از ظلمت اجل

دوسرے قصیدہ میں ۳۵ اشعار ہیں اور خلاق المعانی کمال الدین اسمٰعیل کے ایک قصیدہ کو سامنے رکھکر کہا گیا ہے، جس کا مطلع ہے،

اے در محیط عشقت سرگشتہ نقطۂ دل

وے از جمال رویت خوش گشتہ مرکز دل

گاوان کا مطلع ہے،

شد شکل ضرب نیت بر دوش دل حمائل　　　ہیکل ز حرز سیفی وانگہ ہراس لے دل

تیسرا قصیدہ جو ہمایوں شاہ کی مدح میں ہے، اس میں ۳۸ اشعار ہیں، یہ قصیدہ کسی دوسرے کے قصیدے کے رنگ میں نہیں ہے، بلکہ آزادانہ لکھا گیا ہے، اس لئے اس میں اور تخیلیت پائی جاتی ہے، مطلع یہ ہے:-

عین عمرم کز غبار غربت و غم بود تار　　　شد کنوں روشن ز کحل خاک پای شہریار

(بقیہ حاشیہ ص　　) کے دو قصیدے ہیں، لیکن گاوان کے مطلع کو پیش نظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے، کہ اس کا قصیدہ، انوری کے مذکورہ قصیدہ کے جواب میں ہے، نہ کہ اس قصیدہ کے جواب میں جو کہ صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۲ (قصائد انوری) میں درج ہے، اور جس کا مطلع ہے:-

باکنوں کرسہ دولت خورشید در حمل　　　با خیر و السلامت و الامن قد نزل

۵ ریاض الانشاء ص ۱۴۹ تا ۱۵۰،

۶ کلیات کمال اسماعیل ۵۷ تا ۵۹،

اس کے قصائد میں تشبیب اور گریز نہیں ہے، قصائد کی ابتدا براہ راست مدح سے ہوتی ہے، فارسی میں قصیدہ گوئی عربی سے آئی ہے. لیکن فارسی قصیدہ گوئی میں اتنی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہو کہ اب وہ فارسی ہی کی صنف معلوم ہوتی ہے، فارسی میں اس صنف نے زبان و بیان اور موضوع دونوں ہی لحاظ سے ترقی کی، فارسی میں قصیدہ نگاری ابتدا ہی سے شاعری کی سب سے مشکل صنف سمجھی جاتی ہے، ممتاز شعرا ہی اس میدان میں قدم رکھتے تھے، فارسی کے پرانے قصیدہ نگار انوری، خاقانی، اور کمال الدین اسمٰعیل وغیرہ نزاکت خیال، شدت احساس، تعمق تخیل، شوکت زبان اور بندش الفاظ کے لئے مشہور ہیں، وہ عربی کے فصیح اور بلند آہنگ الفاظ، غیر معروف تلمیحات اور نئی تشبیہات کا استعمال نہایت عمدگی اور آسانی سے کرتے ہیں، محمود گاواں کے سامنے قصیدہ نگاری کے ایسے ہی نمونے تھے، اور قدرتی طور سے اسے اسی کلاسیکی اسلوب کی پیروی کرنی تھی۔

محمود گاواں غیر معمولی اوصاف اور علم و فضل کا حامل تھا، قصیدہ نگاری کے لئے شاعرانہ صلاحیت سے زیادہ تبحر علمی کی ضرورت ہے، اور محمود گاواں میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے وہ بلند معیار کے قصیدے لکھ سکتا تھا، اس نے باوقار عالمانہ اور معیاری زبان استعمال کی ہے بلند آہنگ محاورے، غیر معمولی مبالغہ، دور رس استعارے، اور اعلیٰ تشبیہیں استعمال کی ہیں علم ہیئت، علوم نجوم، اور دوسرے علم و فن کی اصطلاحات کے استعمال سے اس کے قصیدے میں عالمانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

بلاشبہ محمود گاواں ایک اچھا قصیدہ نگار ہے لیکن وہ انوری اور کمال اسمٰعیل کے درجہ تک نہیں پہنچتا، انوری اور کمال اسمٰعیل بے نظیر قصیدہ نگار ہیں، گاواں [illegible] کی شاعرانہ افضلیت کا اعتراف کرتا ہے، درج ذیل اشعار میں وہ اپنے آپ [illegible] علم

شاعر، نثر نگار بتاتا ہے، اور "علم و فضل اور دانش" میں کمال اسمٰعیل سے برتر کہتا ہے۔

چندیں وزیر کامل بودند نزد شاہاں	لیکن وجود تو بعلم بر جملہ ہست فاضل
ابن الفرات طبعم در معرض عبارات	نا ابن العمید و صاحب کم غیب فضائل
از نور آتش طبع و زحجتِ زبانم	مصباح نظم و نثرم روشن کند محافل
گر شد کمال در شعر بے مثل لیک نبود	در فضل و علم و دانش ایں بندہ را مماثل

محمود نے انوری اور کمال اسمٰعیل کے اسلوب کو اس طرح برتا ہے کہ ان کے بعد کا مقام اسے حاصل ہو جاتا ہے، شوکتِ زبان، بلندیِ خیال اور بندشِ الفاظ محمود کے یہاں ان دونوں شاعروں کے درجہ کے ہیں،

محمود گاواں اپنے کلام کو پر وقار بنانے کے لئے عربی کے ادق اور مشکل الفاظ استعمال کرتا ہے، کچھ الفاظ یہ ہیں[1]:-

ذابل، کلل، تل، ازھار، سنبل، صفرۂ وجل

کبھی کبھی شاعرانہ زبان و بیان کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ شعر مبہم اور گنجلک ہو جاتا ہے، جیسے[2]:-

---

[1] دوسرے قصیدہ کے مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ ہوں:-

از نکہتِ گلِ چمن نظم و نثر من	عالم بہشت گشت چہ شد میر دار جبل

[2]

تا یار و انہ باشد کاندر بہار عصرت	باشد نہال آمال در باغ عمر ذابل
سلطان محمد آں شہ غازی کہ شاہ چرخ	دید و ابہ رخ نہ ہیبت او صفرۂ وجل
ہر عالم جہالت گردش نجوم چرخ	از بار سنبلہ سست گشتہ بود سے تل
از بہر دفع دشمن پیشہ مثال تو	سلطان قدر او کند از نہ فلک کلل

(الف) از ہر دو کون جا نزا مادی دہان او بس　　آرے بہ لامکاں جاں دارد ہمیشہ منزل

(ب) سرقضا بر آرد بیروں زپردۂ غیب　　گر دست قدر فکرش بیروں کند انامل

اس کی کچھ تشبیہیں غیر فطری، نا مناسب اور قبیح ہیں، جو ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی ہیں؛

(الف) سیلاب اشک تو بنشاند بیکدم ار　　کانون چرخ پر شود از آتش زحل

(ب) ورنہ از مہب ست تو بوئے نسیم جود　　در بحر از غرق شدی کشتی امل

(ج) از نار اشک نقد ضمیرش بگاہ فکر　　در بوتہ سپہر شدہ نقد بے محل

مذکورۂ بالا قصائد کے کچھ اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں :-

بر شمع داں دل زاں شمع رواں نہادم　　تا دیدن رخت را بود جہات حائل

دل با چراغ عشقت محراب قبلۂ جاں　　تن بے خیال رویت خانہ است جا با طل

ز امید روز وصلش وز ضرب تیغ ہجرش　　نے مردہ ام نہ زندہ چوں مرغ نیم بسمل

جاں در لحاف تن خوش رفتہ بخواب غفلت　　آمد ندا کہ برخیز "یا ایھا المزمل"

بفگن کمند مدحت بر قصر قدر شاہی　　کافلاک با کواکب قصر اوست کھگل

سلطاں محمد آں شہ کز فرط کبریایش　　در موقف غلاماں صد سنجر است و طغرل

وہم از خیال شکلش بر لوح خاطر آرد　　آں چوں شریک باری و فارجت باطل

سرِ قضا بر آرد بیروں زپردۂ غیب　　گر دست قدر فکرش بیروں کند انامل

با رعطاش جز چرخ طاقت قد اشت دائم　　پشتش مقوس آمد از بسکہ گشت حامل

بر جود ابر باراں خندہ بقہقہ برق　　کز تیغ دست شاہست بحر محیط سائل

باد از بان بریدہ گر مرغ شاخ طوبیٰ — اندر ریاض جنت ہست از ثنات غافل

بر تخت ملک دانش نے کس شنید نے دید — شاہے بداد و بینش ذات ترا شاکل
قدر تو از بزرگی آن عالمیست کانرا — آمد سپہر اعظم در قرب استوا ظل
ہرگز نبود و نہ بود چون تو شہے و آنگہ — در بندگی و خدمت چون بندگان کامل
حمد ثنائے شہ چون بحرست طوق فہمست — از لطف پردہ عفو بر عیب من فرو ہل

دریائے شرق و غرب بعین الیقین عقل — اوراق گلشن کرمت را دو قطرہ طل
آن عالمیست قدر تو کز فرط کبریا — افلاک تسعہ است درو کمترین محل

اسعد ز سعد اصغر و اکبر شود یقین — گر باید از تو یک نظر تربیت زحل
باہمت اگر گرد جہان بر کشد خطے — ماند برون ز دائرۂ کن فکان اجل

ابقائے اعتبار عالم از وجود تو شد — گر نبودے وجود تو عالم کجا اثبات
در خورد پیالۂ قدرت فراز اوراق چرخ — کلک و جبر باد و محور عقل کل محیط دار
بر خوان نعمت کان تا ابد گسترده باد — حاسد ز آہ حسد شد سپہر دود و تار
مطبخ ز خیمۂ چرخ ازرق از دود دیگہا — محور قطبش عمود گلستان آمد وار
از حسب قدر تو نقطہ زمینہا سپہر — خارج المرکز شدہ بر ثبت شد دیگ دار

روزِ تان دولت و عہدِ ہمایونت ندید — کس بجز زلفِ بتان گشتہ بعالم تار تار
گر نسیمِ خلقِ تو بر سطحِ دریا بگذرد — ماہیان در قعرِ بحر آیند گیر خشکبار

عقل و نفس و چرخ و انجم از عناصر تا بتاج — پیشکش شد شاہ و قدرت را قطار اندر قطار
از بلندی ہائے قدرت اندر آنجا کر کہ ہست — چرخِ اعظم از غبارِ پائے قدرت آشکار
ملکہا گیری بہ تیغ و دشمنان داری بدار — ایں ہمہ شاہاں سگِ کوئے تو بایند گیر و دار
ملتمس مال است از تو دیگران ایک من — گنجِ معنی دارم و مالت گرداگرد مار
در شب یادِ لئے حیرت کاروانِ فکر را — صد شہا بشکست از شوقِ ضمیرم مستعار
تا بدوزم ہر قدر لطفت قبائے حمد و شکر — طبعِ تیزم سوزن است و رشتہ عمرات تار

تا کنم صید معانی بہر خوانِ مدحت
عقل مرکب فکر صحرا طبع نقادم سوار

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

اس میں امیر خسرو کی مثنویوں اور دواوین سے ان کی وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق اُن کے تاثرات و احساسات کو یکجا کر دیا گیا ہے، اور آخر میں انہی سے متعلق ان کی مثنویوں اور دواوین کے اشعار بھی نقل کر دیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر اس عہد کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، دارالمصنفین کی مقبول ترین کتاب۔ قیمت :-

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن

منیجر

جمہوریہ جزائر فلپائن

از محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔اے (علیگ)

جمہوریہ فلپائن جس کے جنوبی حصہ میں مسلمان اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کرنے کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں، مختلف حیثیتوں سے جنوب مشرقی ایشیا کا ایک اہم ملک ہے، اس کے شمال و مغرب میں بحر چین، مشرق میں بحر الکاہل اور جنوب میں بحر سیلبس واقع ہے، یہ دراصل سات ہزار ایک سو سات چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل مجمع الجزائر ہے، ان میں بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل ہیں، جو ابھی انسانی قدموں کے منتظر ہیں، اس مجمع الجزائر کا خشکی کا رقبہ مجموعی طور پر تین لاکھ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ تمام جزیرے خط استواء کے نزدیک اس کے شمال میں واقع ہیں۔ اور فارموسا سے لے کر بورنیو تک ان کا سلسلہ چلا گیا ہے، یہاں آتش فشاں پہاڑوں کی بڑی کثرت ہے۔ خوفناک زلزلوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے، اس کے فلپائن کہلانے جانے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ فرمانروائے اسپین فلپ ثانی کے عہد میں ۱۵۷۱ء میں اسکی دریافت ہوئی تھی، چنانچہ یہ ملک اسکی طرف منسوب ہو گیا۔

جمہوریہ فلپائن کی مجموعی آبادی حالیہ مردم شماری کے مطابق چار کروڑ دس لاکھ ہے، اس کا قومی پرچم نیلے اور سرخ دو افقی رنگوں پر مشتمل ہے۔ جس کے درمیان میں آٹھ شعاعوں کا ایک سفید سورج اور تین ستارے بنے ہوتے ہیں۔ فلپائن کا صدر مقام پہلے منیلا تھا، مگر

اب کچھ عرصہ سے کوئزن سٹی دارالسلطنت ہوگیا ہے۔اس کے چند اہم بڑے بڑے جزیروں کے نام اور ان کا رقبہ حسب ذیل ہے۔

لوزان (۴۱۸۳۵ مربع میل) منڈاناؤ (۳۶۳۸۱ مربع میل) سمار (۵۱۸۴) مربع میل) پالوان (۵۱،۵) مربع میل) منڈورو (۳۹۹۵ مربع میل) نیگروز (۴۹۶۳ مربع میل) لائٹے (۳۰۹۰ مربع میل) پانے (۴،۴۶۹ مربع میل) بوہول (۱۵۰۹ مربع میل) ماسبیٹ (۱۵۶۲) مربع میل،

فلپائن کے مشہور صنعتی مرکز اور قدیم پایہ تخت منیلا کی آبادی ۱۳ لاکھ ۶۵ ہزار اور جدید دارالحکومت کوئزن سٹی کی ۷ لاکھ ۵ ہزار ہے،

جزائر فلپائن نے ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک جمہوریہ کی حیثیت حاصل کی اس کے آئین میں برابر ترمیمات ہوتی رہیں، بالآخر ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک نیا آئین مرتب ہوا جو تاحال نافذ ہے،اسکی رو سے صدر مارکوس غیر معینہ مدت کے لیے ملک کے عہدۂ صدارت اور وزارت عظمیٰ دونوں پر بیک وقت فائز ہوئے ،حکومت کا نظام چلانے کے لیے درج ذیل تیرہ[۱۳] شعبہ جاتی سکریٹری صدر کی مدد کرتے ہیں۔

امور خارجہ[۱]، مالیات[۲]، قانون[۳]، دفاع[۴]، صحت[۵]، تعلیم[۶]، مواصلات[۷]، محنت[۸]، صنعت[۹]، تجارت[۱۰]، زراعت[۱۱]، عام خدمات[۱۲]، سماجی بہبود[۱۳]،

مجلس نمائندگان ۲۴ ممبران کی سینیٹ اور ۱۲۰ ارکان کے ہاؤس پر مشتمل ہے۔۲۱ سال کے تمام مردوں اور عورتوں کو جو انگریزی، اسپینی، پاکوئی اور قومی زبان لکھ پڑھ سکتے ہیں، ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، انتظامی طور پر پورا فلپائن ۶۸ صوبوں، ۶۱ منظور شدہ شہروں ۱۴۳۳ میونسپلٹیوں میں منقسم ہے، ہر صوبہ اپنی انتظامیہ خود منتخب کرتا ہے۔

فلپائن کی قومی زبان ٹیگالاگ کہلاتی ہے، لیکن سرکاری دفاتر اور پرائیویٹ شعبوں
میں انگریزی اور اسپینی زبان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ فلپائن میں ۸۰
مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، جن میں نو بہت اہمیت کی حامل ہیں، یوں تو یہاں کئی مذہب
پائے جاتے ہیں، لیکن اصلاً عیسائیوں کے مختلف فرقے اور مسلمان ہی قابل ذکر ہیں، یہاں مسلمانوں
کو مورو کہا جاتا ہے، جن کی موجودہ تعداد پچاس لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہ بیشتر
ملک کے جنوبی حصے میں آباد ہیں۔

یہاں ساٹھ فی صد عوام خواندہ ہیں، پرائمری سطح تک تعلیم مفت ہے، عجیب بات ہے
کہ سرکاری طور پر ٹیگالاگ کو قومی زبان قرار دیئے جانے کے باوجود تمام اسکولوں میں
ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے، حتی کہ فلپائنی زبان کو بھی انگریزی ہی کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے،
اور فلپائنیوں کی اکثریت انگریزی ہی بولتی بھی ہے، اسپینی زبان کی تعلیم ثانوی اسکولوں میں
لازمی اور کالجوں میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہوتی ہے، پورے ملک میں ۲ لاکھ
پچپن ہزار ثانوی اسکول اور ۹ ہزار کالج ہیں، اس کے علاوہ منیلا میں ۱۶۱۱ء سے ایک
یونیورسٹی بھی قائم ہے،

فلپائن کے سرکاری سکہ کا نام "پیسو" ہے، جو ۲۲ امریکی سینٹ کے مساوی ہوتا ہے،
اس کے علاوہ نصف پیسو، ربع پیسو، اور پیٹا کے سکے بھی رائج ہیں، یہ تمام سکے خالص
چاندی کے ہوتے ہیں، چنانچہ ایک پیسو بیس گرام چاندی پر مشتمل ہوتا ہے،

مجمع الجزائر فلپائن میں جنگلوں کی بڑی کثرت ہے، اس سے عمارتی لکڑی، ربڑ،
گوند، سبزیوں کا تیل، بانس، شاہ بلوط، سنگترے کی چھال اور [illegible] کا مسالہ بڑی کثرت سے
حاصل ہوتا ہے، فلپائن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ صنعت ہے، ایک کروڑ ساٹھ لاکھ

ہیکٹر زمین پر کاشت کی جاتی ہے، چاول، گنا، مکئی، سن، گری اور تمباکو اپنی کثرت پیداوار
کے لیے قابل ذکر ہیں یہاں پھلوں، میووں، مختلف سبزیوں، کافی، ربڑ اور روئی کی پیداوار
بہت کم ہوتی ہے۔

فلپائن میں معدنیات بھی اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ دنیا کے کسی دوسرے خطہ میں شاید ہی
ان کی نظیر مل سکے۔ پورا مجمع الجزائر لوہے، سیسہ، تانبہ، سونا، چاندی، نمک، کوئلہ، سیماب،
کھریا مٹی، اور کرومیٹ کی دولت اپنے سینے میں دفن کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ سامان ہر سال
لاکھوں ٹن کی مقدار میں بیرونی ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں کی شکر اپنی لطافت، صفائی
اور عمدگی کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں کی برآمدات میں لٹھے اور عمارتی لکڑی، تانبہ، گری، ناریل کا تیل، شربت انناس
پلائی ووڈ اور شکر قابل ذکر ہیں۔ ملکی معیشت کا اصل دارومدار ان اشیاء کی برآمدات اور ایسے
کثیر زر مبادلہ ہی پر ہے۔ اسی طرح یہاں کی درآمدات میں مشینیں، کپڑے، ایندھن، ذرائع
نقل وحمل کا سامان، معمولی دھاتیں اور کیمیکل اشیاء شامل ہیں۔ فلپائن اپنے حدود اربعہ کے
اعتبار سے چونکہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے مچھلیوں کو یہاں کی اقتصادیات اور
معیشت میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ہر سال اربوں ٹن مچھلی بیرونی ملکوں کو برآمد کی جاتی
ہے۔ چاول اور مچھلی یہاں کے باشندوں کی محبوب ترین غذا ہے۔

جزائر فلپائن میں گھریلو صنعت کا عام رواج ہے، خاص طور پر تو روزمرہ کی بنے ہوئے
کپڑے، چٹائیاں، مٹی کے برتن اور جالیدار ہیٹ وغیرہ بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر
گھروں کے اندر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہاں کارخانوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایک سروے کے
مطابق فلپائن میں ناریل کے تیل کی، ملیں، سگار اور سگریٹ کی ایک سو دو فیکٹریاں،

آٹھ ہزار تین سو چاول ملیں، ستر سو اٹھائیس جوتا بنانے کے کارخانے، ۵ ... اور
۲ ... صنعت کی ملیں قائم ہیں۔

فلپائن کی مسلح افواج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے، جس میں بری فوج تقریباً ایک لاکھ بحری فوج تیس ہزار، اور ہوائی فوج ستر ہزار جوانوں اور افسروں پر مشتمل ہے فضائیہ اور بحریہ جدید ترین آلات حرب سے لیس ہیں۔ ۱۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو فلپائن اور امریکہ کے درمیان ایک ۹۹ سالہ فوجی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے، اس کی رو سے امریکہ نے فلپائن کو زمینی، ہوائی اور بحری افواج کے لیے بہت سے حربی ساز و سامان کی سپلائی منظور کی تھی اسی سال ۲۱ مارچ کو ایک دوسرا معاہدہ ہوا، جس کے مطابق فوجی مشاورتی گروپ اور فوجی معاونین امریکہ سے یہاں آئے۔ ۳۰ اگست ۱۹۵۱ء کو واشنگٹن میں ایک باہمی تعاون کے معاہدہ پر دستخط ہوئے، جس کی توثیق شدہ دستاویزات کا تبادلہ منیلا میں ۲۷ اگست ۱۹۵۲ء کو ہوا، فلپائن جنوب مشرقی ایشیا کے مشترک دفاع کے معاہدہ پر دستخط کرنے والے ملکوں میں بھی شامل ہے،

فلپائن کی اجمالی تاریخ جزائر فلپائن کی تاریخ پانچ سو سال سے زیادہ قدیم ہے، اسکی دریافت کا سہرا میگلن نامی ایک اسپینی کے سر ہے، جس نے اپنی سمندری سیاحت کے دوران مارچ ۱۵۲۱ء میں سب سے پہلے جزیرہ ہومونہو کا انکشاف کیا، پھر میگلن ہی نے اسکے بعد شمال و جنوب میں منڈاناؤ، بوہول، سیبو اور میکتن کے جزیرے دریافت کئے۔ اس نے اپنی اس دریافت کو مجمع الجزائر سان لیزرس کے نام سے موسوم کیا لیکن اسپینیوں نے انکو مغربی جزائر کا نام دیا پرتگالی انکو مشرقی جزائر کہا کرتے تھے کیونکہ ان کیلئے یہ جزیرے مشرقی سمت کا کام کرتے تھے۔

۱۵۴۲ء میں، روئی لوپیز دی ولالوبس (۱۵۰۰ء – ۱۵۴۴ء) نے جزائر فلپائن کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ ولالوبس نے کچھ جزیرے میگلن کے دریافت کردہ جزائر کے شمال مغرب میں مزید دریافت کیے، اور انھیں اسپین کے ولی عہد شہزادے سے منسوب کرتے ہوئے "جزائر فلپیناز" کے نام سے موسوم کیا۔ فلپ ثانی کی تخت نشینی (۱۵۵۵ء – ۱۵۹۸ء) کے بعد ممتاز فاتح مائیگل لگاسپی (۱۵۰۲ء – ۱۵۷۲ء) کی سربراہی میں، ایک مہم ساحل میکسیکن پر چلائی گئی۔ اس مہم کے بارے میں ۱۵۶۱ء میں جو ہدایات جاری کی گئی تھیں ان میں جزائر فلپیناز سے مکمل مجمع الجزائر مراد لیا گیا تھا۔

لگاسپی نے ۱۵۶۵ء میں جزیرہ سیبو میں سان مائیگل نامی ایک بستی آباد کی، جو ان جزائر میں پہلی باضابطہ اسپینی بستی تھی، یہی بستی آگے چل کر ولا دی جیس کہلائی۔ اور پھر بعد میں اسی کو شہر سیبو کا نام دیا گیا، ۱۵۷۱ء میں منیلا کی بنیاد پڑی، اور وہ اسپینیوں کا مستقل دارالسلطنت قرار پایا۔

۱۷۶۲ء میں اسپین اور برطانیہ کے درمیان جنگ کے باعث ۱۳ جہازوں کا ایک برطانوی بیڑہ، امیر البحر سیموئل کارنش اور بریگیڈیر جنرل ولیم ڈریپر کی قیادت میں فلپائن بھیجا گیا، وہاں تقریباً چھ سو اسپینی سپاہی موجود تھے، حملہ آوروں کی تعداد کم وبیش ۲ ہزار آٹھ سو تیس تھی، شدید حملوں کے بعد منیلا پر برطانویوں کا قبضہ ہو گیا، بعد ازاں ایک صلح نامہ کے مطابق مکمل مجمع الجزائر برطانیہ کے زیر تسلط آگیا اور اسپینیوں کو نقصانات کے معاوضہ کے طور پر چالیس لاکھ پیسو ادا کر دیا گیا، لیکن پھر کچھ عرصہ بعد حالات میں انقلاب آیا اور ۱۷۶۴ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد جزائر فلپائن پر اسپین کا دوبارہ قبضہ ہو گیا، اور منیلا برطانوی شہریوں سے خالی کرا لیا گیا۔

اس کے بعد سے یہ جائزہ ہوا ہے اسپین کے زیر نگیں رہے۔ لیکن وہاں کے سیاسی حالات کبھی پرسکون نہیں رہے، خاص طور سے ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۵ء تک کا زمانہ تو غیر معمولی خلفشار اور بے چینی کا دور تھا، بکثرت اخبارات کے اجراء، تجارت کی وسعت، بیرونی ملکوں سے رسائل و کتب کی آمد سے مقامی باشندوں کے اندر بغاوت کے جراثیم سرایت کرنے لگے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ سہولیات سفر کے باعث یہاں کے باشندے یورپ جانے اور وہاں سے جدید افکار و خیالات لے کر واپس آنے لگے، اسطرح اسپینی حکمرانوں کی آمریت اور معاشی استحصال کے خلاف اہل فلپائن کی جدوجہد شروع ہوگئی، ۱۸۹۶ء میں جب حکومت نے تین سو فلپائنی باشندوں کو جیل میں ڈال دیا تو بغاوت کا لاوا ابل پڑا۔ اور اسپینی افواج اور فلپائنی باغیوں کے درمیان جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، باغیوں کا سرخیل اگنالڈو تھا، اسپینی افواج جنرل بلانکو کی سربراہی میں مدتوں مورچے سنبھالے رہیں، لیکن حالات کسی طرح قابو میں نہیں آرہے تھے،

حکومت اسپین نے فلپائن میں بغاوت کو کچلنے کے لئے یکے بعد دیگرے اپنے گورنروں اور فوجی کمانڈروں میں تبدیلی کی۔ یہاں تک کہ جنرل پریمو کا تقرر عمل میں آیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ حریت پسندوں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھاتا، کیوبا میں حالات اتنے دگرگوں ہوگئے کہ اسپینی حکومت نے جنرل پریمو کو بذریعہ تار، باغیوں سے فوراً صلح کر لینے کا حکم دیا، جس کے نتیجہ میں حریت پسندوں کے خلاف تمام فوجی کارروائیاں منسوخ کردی گئیں، اور ۱۲ دسمبر ۱۸۹۷ء کو معاہدہ "بیاکا بیٹو" عمل میں آیا، اس کی رو سے فلپائنی قائد بغاوت اگنالڈو اور اس کے ۳۰ رفقاء کو چار لاکھ پیسو کے ساتھ ہانگ کانگ جانے کی اجازت دیدی گئی، لیکن حکومت اسپین نے اس صلح کی شرائط کو تسلیم کرنے

انکار کر دیا۔ اور منیلا میں صلح کی تقریبات مسرت کے فوراً ہی بعد ان تمام لوگوں کے قتل کا

اعتبار ہی سلسلہ شروع ہو گیا جن کا تحریک حریت سے کوئی بھی تعلق تھا۔

فلپائن کے لیے اسپین اور امریکہ کے درمیان جنگ اور امریکہ کا قبضہ

۱۵ فروری ۱۸۹۸ء کو بندرگاہ ہوانا میں امریکی جہاز بارود سے اڑا دیا گیا، ۵ ار مارچ کو فلپائنی گورنر جنرل پرالمو کو معلوم ہوا کہ امریکی نائب امیرالبحر جارج ڈیوے ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر اپنی بحری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے، لہٰذا اس نے صورت حال پر غور کرنے کے لیے ایک مشاورتی میٹنگ طلب کی جس میں اسپینی امیرالبحر مونٹوجو نے نہایت صفائی کے ساتھ بتایا کہ جنگ کی صورت میں فلپائن کے بحری بیڑے کا تباہ ہو جانا یقینی ہے، اس نازک صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت اسپین نے فلپائن سے جنرل پرالمو کو واپس بلا کر جنرل آگسٹی کو اس کا جانشین مقرر کیا، لیکن قبل اس کے کہ نیا گورنر جنرل حالات کا جائزہ لے کر مناسب حفاظتی اقدامات کرتا ہانگ کانگ سے یہ اطلاع آئی کہ جارج ڈیوے منیلا کے لیے روانہ ہو چکا ہے، لہٰذا فلپائنی امیرالبحر مونٹوجو بعجلت تمام خلیج سوبیگ (Subic) ہوتا ہوا صوبہ کیویٹے پہونچا، اور اسپینی بیڑے کو یا تو مکمل طور پر تباہ کر دیا یا کم از کم ناکارہ بنا دیا، تاہم اسپینی حکومت نے ہتیار ڈالنے سے انکار کر دیا، لہٰذا امریکیوں نے کیویٹے پر قبضہ کر لیا۔

خلیج منیلا کی جنگ اور اسپینی جہازوں کی تباہی نے پورے مجمع الجزائر فلپائن میں اسپینی وقار کو سخت دھکا پہونچایا، اور پھر تقریباً ہر صوبہ میں بغاوت کی خوفناک لہر شروع ہو گئی۔ امریکہ نے جس کی حکومت ابھی تک صرف صوبہ کیویٹے تک محدود تھی اپنے اقتدار کو مزید وسیع و مستحکم کرنے کے لیے مقامی باشندوں کی اس بغاوت سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی چنانچہ اس نے اگنالڈو کو اپنے رفقا کے ساتھ ایک امریکی جہاز میں

کیپٹنے کی اجازت دیدی۔ اگنالڈو نے فلپائن واپس آکر اسپینیوں کے خلاف اپنی تحریک اتنے زور شور سے چلائی کہ اس کی آندھی میں اسپینی اقتدار کا تنکے کی طرح اڑ گیا۔ یہاں تک کہ سوائے شہر منیلا کے تقریباً لوزان کے پورے جزیرے پر اس نے قبضہ کر لیا اور ۱۳ اگست کو جنرل ویسلی میرٹ کی سرکردگی میں منیلا بھی امریکیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔

لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جس اگنالڈو کی مدد سے امریکیوں نے فلپائن سے اسپینی اقتدار کا خاتمہ کیا تھا۔ مقصد برآری کے بعد منیلا میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کیونکہ امریکیوں کو اس کی حریت پسندی سے خود اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اگنالڈو نے اس بدعہدی اور جفاشعاری کے باعث فلپائن کے مقامی باشندوں کے ساتھ مل کر امریکیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور گوریلا طرز کی جھڑپیں حریت پسندوں اور امریکیوں کے درمیان برابر ہوتی رہیں، جن کو امریکہ نے نہایت سختی کے ساتھ کچل دیا۔ بالآخر ۲۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو پورے مجمع الجزائر فلپائن پر امریکی پرچم لہرانے لگا۔

جولائی سنہ ۱۹۰۱ء میں وہاں فوجی راج ختم کر کے سول حکومت قائم کی گئی، اور صدر روزویلٹ نے غیر فوجی حکومت اور قانون ساز اداروں کے قیام کے ایکٹ پر دستخط کر دیئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء تک فلپائن میں برابر امریکی گورنر جنرل مامور ہوتے رہے۔ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کو فلپائن اسمبلی کے پہلے انتخابات ہوئے، جس میں ۵۹ نیشنلسٹ اور ۱۶ ترقی پسند گروپ اور ۲۰ آزاد امیدوار منتخب قرار دیئے گئے۔ نیشنلسٹ امیدواروں نے انتخابات سے قبل عوام سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اسمبلی کے لیے منتخب ہو گئے تو ملک بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔ لیکن اسمبلی کے پہلے ہی

اجلاس میں یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ ان منتخب امیدواروں کی اکثریت انتخاب سے پہلے کے اعلانات اور وعدوں پر ثابت قدم رہنے کے بجائے قانون ساز ادارہ پر اکتفا زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن بایں ہمہ آزادی کی جد وجہد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، آخرکار ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو فلپائن کا نیا آئین مرتب ہوا۔

۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۶ء میں اس میں مزید ترمیم کی گئی، اس کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو یہ آئین منسوخ کرکے ایک نیا آئین مرتب کیا گیا، جو اس وقت تک نافذ ہے۔ (باقی)

ہماری نئی کتابیں

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی جوہر کی یہ کوئی مکمل سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب لکھ کر انکی روح کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں انکی ہنگامہ خیز سیاسی و ملی زندگی سے متعلق بہت ہی مفید اور سبق آموز معلومات اکٹھا کر دیے ہیں، انکی لندن کی راونڈ ٹیبل کانفرس کی ولولہ انگیز تقریر بھی لکھی ہے جسکے بعد انھوں نے وہیں اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کر دی، قیمت ۵۰-۹

ہندوستان کے عہد ماضی میں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں مغلیہ عہد سے پہلے یعنی محمد بن قاسم فاتح سندھ سے لیکر سلاطین دہلی تک ہندوستان میں جو مسلمان حکمران گذرے ہیں، اون کی مذہبی رواداری، غیر مسلموں کے ساتھ اون کی فراخدلی اور [illegible] انسانیت و [illegible] آدم نوازی کے دلچسپ و دلکش واقعات تاریخ کے مستند ماخذوں اور حوالوں کے ذریعہ پیش کیے گئے ہیں، اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد زیر طبع ہے، مرتبہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمن، قیمت ۔۔۵

وفیات

پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

گذشتہ مئی میں ملک کے مشہور ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کی وفات سے ایک عظیم علمی سانحہ ہوا، بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد ان ہی کی علمی شخصیت ابھری، انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ رہ کر نہ صرف تربیت پائی، بلکہ ان کی شانتی نکیتن یونیورسٹی کی تاسیس میں اُن کا بھی حصہ تھا، بنگال کے اس فلسفی شاعر نے اُن کی جوانی ہی میں اُن کی قدر کرنی شروع کر دی تھی، اور اپنی ایک کتاب اُن کے نام سے معنون بھی کیا، اور ان کو بھاشا اچاریہ کا خطاب دیا، جس کے معنی زبانوں کا پیشوا ہے، اس خطاب کے وہ مستحق تھے، وہ بنگالی، سنسکرت، ہندی، پراکرت، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، آئرش، گوتھک اور خدا جانے کتنی زبانیں جانتے تھے،

کلکتہ اور لندن سے ڈگریاں حاصل کرکے کلکتہ یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے، یہاں رہ کر انھوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیئے، ان پر یونیورسٹی ہمیشہ ناز کرتی رہیگی، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کوئی علمی اعزاز ایسا نہ تھا جس سے وہ سرفراز نہیں کیے گئے، رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ ملایا، سماترا، جاوا، بالی اور تھائی لینڈ گئے، وہاں ہندوستانی آرٹ اور کلچر پر ان کے لکچرز بہت مقبول ہوئے، جس کے بعد علم و فضل ان کی بین الاقوامی تقریبوں میں مدعو ہونے لگے، اسی سلسلے میں بلجیم اور کوپن ہیگن کا سفر کیا، یورپ کے علمی اجتماعات

میں شرکت کے لئے کئی بار پیرس بلائے گئے، بیروت میں عربی و فارسی کی علمی و لسانی کانفرنس ہوئی تو وہاں خاص طور پر مدعو ہوئے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ اور ترکی کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجے گئے، پنسلونیا یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی مقرر ہوئے، امریکہ کے قیام میں کولمبیا اور ییل کی یونیورسٹیوں اور واشنگٹن کی علمی مجلسوں میں لکچر دیئے، راک فیلر فونڈیشن کی طرف سے میکسیکو کے مختلف شہروں میں خاص خاص موضوعات پر لکچر دینے کے لئے بھیجے گئے، پیکنگ یونیورسٹی اور چینی حکومت کی دعوت پر چین بھی گئے، روس کی سوویٹ اکیڈمی آف سائنس نے ان کو روس مدعو کیا، جہاں کے مختلف شہروں میں اُن کے لکچر ہوئے، یونسکو کی طرف سے جی چنگن یونیورسٹی میں بھی لکچر دیئے، پھر منگولیا جاکر وہاں اپنی علمی عظمت کا سکہ جمایا، کینبرا میں دولت مشترکہ کی پارلیمنٹری کانفرنس ہوئی تو اس میں ہندوستان کی نمایندگی کی، جاپان بھی گئے، جہاں ٹوکیو یونیورسٹی میں لکچر دیئے، وہاں سے فلپائن گئے، جہاں منیلا یونیورسٹی ...... کو مخاطب کیا، وہ لیتھونیا اور لیٹ ویا بھی مدعو ہوئے، ہندوستان کی طرف سے افریقہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں ہندوستان کی تاریخ اور کلچر پر لکچر دینے کے لئے بھیجے گئے، حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ماتحت محکمۂ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کی طرف سے گھانا، نائجیریا اور لائبیریا کی یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لئے مامور ہوئے، قاہرہ، ادیس ابابا، طہران، بخارسٹ اور روم جاکر بھی لکچر دیئے، فرانس کی دو یونیورسٹیوں کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تو وہاں بھی بلائے گئے، آرمینیا اور ہندوستان کے ثقافتی تعلقات پر مواد جمع کرنے کے لئے آرمینیا بھی بھیجے گئے، زیکوسلوکیا کی ایک یونیورسٹی کے چھ سو سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر مدعو ہوئے تو وہاں اُن کی قابلیت کا اعتراف ایک طلائی تمغہ دے کر کیا گیا، روم کی یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی، دنیا میں لسانیات کی جو بھی کانفرنس یا مجلس کہیں ہوتی چاہے یہ پولینڈ یا ہوائی یا نیویارک یا پیرس یا ٹورنٹو یا سری لنکا میں ہوتی

اس میں وہ ضرور ملائے جاتے، وہاں وہ پہنچ کر بڑا اچھا اثر پیدا کرتے، جس سے ہندوستان کے علمی وقار میں اضافہ ہوتا رہتا۔

اس بین الاقوامی علمی سفیر وضمیر کی قدر ملک کے اندر بھی اُن کے رُتبہ کے مطابق ہوتی رہی، برما بنگالی لٹریری کانفرنس، بنگال لٹریری کانفرنس، آل انڈیا اورنٹیل کانگریس اور آل انڈیا ہندی لٹریری کانفرنس وغیرہ کے اجلاسوں کی صدارت کی، ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے بعد دہلی کی ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہوئے، انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے بہت ہی اہم اور ممتاز رکن رہے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اُن کو ہر قسم کا اعزاز ملا۔ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے مستقل اعزازی رکن تھے، اور اس کی ساری علمی سرگرمیوں سے برابر دلچسپی لیتے رہتے، بنگال لیجسلیٹو کانسل کے پہلے رکن اور پھر اس کے صدر بھی ہوئے، ان غیر معمولی ملکی اور غیر ملکی علمی سرگرمیوں کے باوجود تصنیف و تالیف کے مشاغل بھی برابر جاری رکھے، بکثرت مضامین لکھنے کے ساتھ حسب ذیل کتابوں کے مصنف بھی ہوئے،

(۱) اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لینگویج (۲) انڈیا اینڈ اتھوپیا (۳) ورلڈ لٹریچر اینڈ ٹیگور (۴) ایرانیزم (۵) جے دیو (۶) انڈیا اے پولی گلوٹ نیشن (۷) اے شورٹ اینڈو آریا ہند وویڈنگ ، اینڈ ینی ٹی اینٹی ریچوئلز (۸) بنگلہ بھاشا پرسنگے وغیرہ، حکومت ہند نے ان کو پدم بھوشن اور پدم وی بھوشن کے خطابات دے کر اُن کی علمی خدمات کو سراہا،

اُن کی ہر قسم کی قدردانیوں کے باوجود اُن کی بعض تحریریں متنازعہ فیہ بن گئی تھیں، ان پر یہ نکتہ چینی ہوئی کہ انھوں نے راماین کے قصے کو ہومر سے مستعار بتایا ہے، اُن کی طرف سے یہ جواب تھا کہ انھوں نے راماین کو تو نہیں لیکن اُن کے نزدیک دس سروں والے راکشس کا وجود یونانی تخیل کی صدائے بازگشت ہے، کیونکہ ہندوؤں کے قدیم ترین خرافاتی ادب میں ایسے راکشس کا

ذکر نہیں ملتا، انھوں نے بعض بہت ہی پرانے شواہد سے اس پر بھی بحث کی ہے کہ رام اور سیتا بھائی بہن تھے، یا ازدواجی رشتے میں منسلک تھے، اس سے بھی ایک علمی سنسنی پھیلی،

اُن سے میری ذاتی ملاقاتیں بھی رہیں، وہ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، میں بھی یہیں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی نمائندگی بارہ برس تک کی، اس کے جلسوں میں ان کی اہم تقریریں ہوتیں، جو شوق سے سنی جاتیں، جلسہ ختم ہوتا تو اراکین ان کو گھیر لیتے، میں بھی ان سے ملتا رہتا، وہ دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے البیرونی پر ایک اہم یادگار جلد شائع ہوئی تھی، اس میں ان کا ایک مضمون "البیرونی اینڈ سنسکرت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، میں نے اس سے اپنی تصانیف اور مضامین میں بڑا استفادہ کیا تھا، ان سے اس مضمون پر دیر تک باتیں ہوئیں، میں نے کانسل کے ایک اجلاس میں اپنی ایک تقریر میں دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" کا ذکر کیا، تو ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس کتاب سے بڑی دلچسپی لی، اور اس کی جلدوں کی وی پی بھیجنے کو کہا، اعظم گڈھ آکر میں نے اس کی ایک جلد اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیج دی، جب یہ اُن کے پاس پہنچی تو انھوں نے مجھ کو انگریزی میں یہ خط لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے،

"جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب!

آپ کا خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء کو موصول ہوا، اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، اس خط کے ساتھ میرے لئے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ایک بہت ہی دل پذیر تحفہ ہے،

آپ لوگوں کا یہ خیال بہت ہی خوب رہا کہ ایک جلد میں اسلام کے ان تیرہ مصنفوں کی تحریروں کے اقتباسات جمع کر دیں جنھوں نے عربی زبان میں ہندوستان سے متعلق اپنے تاثرات لکھے تھے

کیا ہے، اس کتاب میں عربی عبارتوں کے ساتھ جو انکا اردو ترجمے دیئے گئے ہیں اس سے غیر معمولی سہولت پیدا ہوگئی ہے، عرب مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریریں بعض ملکوں کے قدیم عہد اور ازمنۂ وسطیٰ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت ہی قیمتی ماخذ ہیں، یہ ملک خواہ ایشیا یا یورپ یا افریقہ ہی کے کیوں نہ ہوں، مغربی افریقہ کے چار یا پانچ سو بلکہ ایک ہزار برس پہلے کے حالات جاننے کے لئے تو ان عرب مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریریں ہی واحد ماخذ بنی ہوئی ہیں شبلی اکیڈمی نے یہ کتاب (ہندوستان عربوں کی نظر میں) شائع کرکے ہندوستان سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب تو ایسی ہے کہ ریسرچ کرنے والوں کو اپنی الماری میں رکھنی چاہئے، جو پڑھا لکھا آدمی ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ اور کلچر سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کے پاس بھی یہ کتاب ہونی چاہئے، والسلام

آپ کا مخلص

سنیتی کمار چٹرجی

وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئے، ایک دن سب ہی کو یہاں سے کوچ کرنا ہے، مگر ان لوگوں میں ہیں، جو اپنے پیچھے اپنا شاندار نام اور کام چھوڑ جاتے ہیں، ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی، تو اُن کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا، بنگال کی جس کلچرل گیلری میں بنکم چندر، جے۔سی، بوس، اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں ہوں گی، وہاں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا بھی ہونا ضروری ہے،

ہندوستان عربوں کی نظر میں

حصہ اول و دوم قیمت :- ۵۰ – ۱۲ – ۱۲

مرتبہ :- ضیاء الدین اصلاحی

منیجر

غزل

از جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

اُس دل پہ میری آہ و فغاں کا اثر نہیں — کیسا ہے یہ چمن کہ صبا کا گذر نہیں

بیکار جستجو میں بھی اک لطفِ خاص ہے — دیکھوں گا میں اُدھر وہ خراماں جدھر نہیں

آنکھوں کے واسطے نہیں لازم کہ نور ہو — نرگس بھی چشم رکھتی ہے لیکن نظر نہیں

اک تیرا روئے ناز ہے اک میرا داغِ دل — میں خوب جانتا ہوں یہ شمس و قمر نہیں

کتنی کرشمہ ساز ہے یہ مشقِ ضبط بھی — محسوس ہو رہا ہے کہ دردِ جگر نہیں

اسرارِ آسماں کا سمجھنا محال ہے — ظلمت ہے جس طرف مہ و انجم اُدھر نہیں

جنبش زمینِ دل کو ہوئی کچھ نہ کچھ ضرور — کب آئے کب چلے گئے اتنی خبر نہیں

مشکل ہے کوئی اس کی ادا کو سمجھ سکے — وہ جلوہ گر ہے یوں کہ کہیں جلوہ گر نہیں

شام و سحر کا ساتھ رہا ہے مگر سلامؔ — اک شام ایسی آئے گی جس کی سحر نہیں

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

یہ معجزہ ہے عشق کا وہم و گماں سے دور — میں تیرے دل کے پاس ہوں چشمِ جہاں سے دور

صحنِ چمن میں آج یہ کیا دیکھتا ہوں میں — کچھ بال و پر ہیں بکھرے ہوئے آشیاں سے دور

سجدوں میں اب وہ کیفِ حضوری نہیں نصیب
کیا لطف بندگی کا ترے آستاں سے دور

کچھ اس ادا سے راہِ طلب میں ہوں گامزن
ہر کارواں کے ساتھ ہوں ہر کارواں سے دور

آخر کوئی حساب ہے ان کا بھی اے کریم
جو سجدہ کر چکا ہوں ترے آستاں سے دور

جوہر نہ پوچھ عظمتِ رفتہ کی داستاں
تابندہ اک ستارہ ہوں اور آسماں سے دور

غزل

از جناب محمد شرف الدین ساحل ناگپور

کسی چہرے پہ مسرت کا نمایاں نور نہیں
کیسی محفل ہے تری کوئی بھی مسرور نہیں

ذرہ ذرہ ہے مرے واسطے برقِ سرِ طور
طور تک ہو جو کلیمی سے مجھے منظور نہیں

انتہا دیکھ ذرا اپنے کرم کی اے دوست
کون ایسا ہے جو فریاد پہ مجبور نہیں

کیا کہوں سلطنتِ حسنِ بتاں کی خوبی
صرف دستور ہے پابندیٔ دستور نہیں

بے زبانی بھی محبت میں اثر رکھتی ہے
حسن سے شکوہ کروں مجھکو یہ منظور نہیں

ایک میں ہوں کہ تری یاد سے ہی کام مجھے
ایک تو ہے کہ مرا ذکر بھی منظور نہیں

جو بھی عاشق ہے وہ گردن زدنی ہے ساحل
کچھ خصوصیتِ قیدِ سرِ منصور نہیں

کلیاتِ شبلی اردو

ضخامت ۱۲۴ صفحے قیمت ۷۵ (۷۵-۳)

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

پرانے چراغ ۔ مرتبہ ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۴ مجلد مع گردپوش قیمت۔ عشے، پتہ مکتبۂ فردوس لکھنؤ۔

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے بعض ممتاز افراد کی وفات کے بعد لکھے تھے، ان میں علماء، مصنفین، مدرسین، شعراء، ارباب سلوک، قومی و ملی رہنما اور حکومت کے بعض اعلیٰ عہدیدار شامل ہیں، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا وصی اللہ فتحپوری، مولانا حید رحسن خاں ٹونکی، مولانا خلیل عرب، سید صدیق حسن آئی۔ سی۔ ایس، مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی وغیرہ، فاضل مصنف کے ان سب سے مخلصانہ روابط تھے، انھوں نے ان کی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، اس لئے ان کے دلآویز قلم سے ہرایک کی خدمات کے گوناگوں پہلو، زندگی کے مختلف نقوش اور شخصیت کے خط وخال پوری طرح نمایاں ہوگئے ہیں، اس مجموعہ کے ہر مقالہ سے لطف اندوز ہونا ناگزیر ہے لیکن مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا احمد علی لاہوری سے متعلق مقالات کے مطالعہ میں کچھ اور ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے مجموعہ کی ابتدا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے ذکر جمیل

ہوئی ہے اس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق کا خاص طور پر مفصل ذکر ہے ان تاثراتی مضامین میں خود مضمون نگار مصنف کے حسن مذاق، لطافت طبع، دینی و ملی حمیت، شوق و دلچسپی کی چیزوں، علمی اشتغال، جذبۂ خدمت و اخلاص، ذوق دعوت و تبلیغ اور دلسوزی و درد مندی کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں، یہ مجموعہ مختلف طبقوں کے ارباب کمال کے متعلق تاثرات و مشاہدات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ ہے، جو امید ہے کہ ہر طبقہ میں شوق سے پڑھا جائے گا۔

لغات القرآن ۔ مرتبہ۔ جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۳ قیمت۔ عمر پتہ (۱) محمد عبدالرشید خان صاحب مین روڈ، کامٹی ضلع ناگپور، (۲) عبدالکریم پاریکھ صاحب ٹمبر مرچنٹ، اتواری ناگپور (۸) (۳) حنیف بکڈپو، مومن پورہ ناگپور سٹی،

عربی میں قرآن مجید کے الفاظ و لغات پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اردو میں بھی بعض مفید کتابیں چھپی ہیں اس کتاب کے مصنف جناب عبدالکریم پاریکھ دین و ملت کی خدمت کا بڑا ولولہ رکھتے ہیں اور ان کو دعوت و تبلیغ کے کام سے خاص دلچسپی ہے، یہ کتاب ان کے اسی دینی و تبلیغی جذبہ کا مظہر ہے، اس میں ہر لفظ کو اس کی اسی شکل میں جس میں وہ قرآن مجید میں آیا ہے نقل کرکے اس کے معنی دئے گئے ہیں چنانچہ افعال کے مصادر کے بجائے ان کے مختلف صیغوں کے معنی لکھے ہیں، اور ضمیروں، اشارات بلکہ حروف و صلات تک کے معنی درج ہیں، ابتدا میں عربی کے نو اسباق بھی شامل ہیں، آسانی کے لئے پاروں، سورتوں اور رکوع کی تقسیم بھی کر دی گئی ہے، مصنف کے خیال میں اگر ایک ایک رکوع کے الفاظ حفظ کرلئے جائیں تو مشق کی کثرت سے قرآن کا ترجمہ کر لینا ممکن ہو جائے گا مگر راقم کی رائے میں طریق العوام مشغول لوگوں کے لئے یہ بات آسان نہیں ہے

اگر کوئی شخص اتنی ہی محنت و مشقت عربی زبان سیکھنے کے لیے کرے تو یہ زیادہ بہتر صورت ہوگی، مصنف نے یہ کتاب بڑے دینی ولولہ اور نیک جذبہ سے لکھی ہے، اس لئے بعض فروگذاشتوں کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے، انھوں نے عموماً فعل ماضی کے صیغے لکھکر مصدر کے معنی تحریر کئے ہیں، عربی کے تیسرے سبق کے صفحات ۲۳ و ۲۴ پر بھی یہی کیا ہے، کئی جگہ جو صیغے لکھے ہیں وہ قرآن میں مستعمل صیغوں سے مختلف ہیں، اس سے قاری کو بڑی الجھن پیش آئے گی مثلاً ص ۵۹ پر کتم (فعل ماضی) لکھکر مصدر کا ترجمہ کیا ہے حالانکہ قرآن میں تکتموا (مضارع مجزوم) استعمال ہوا ہے اس طرح کا سہو متعدد جگہ ہوا ہے، بعض لفظوں اور فقروں کے معنی میں بھی مسامحت ہوگئی ہے مثلاً غی (ص ۱۰۵) کے معنی سرکشی، بغاوت اور نافرمانی صحیح نہیں ہیں بلکہ گمراہی صحیح ہے اسی طرح یسومون کا ترجمہ سخت تکلیف پہنچائی کے بجائے سخت تکلیف پہنچاتے تھے، تثیر الارض (ص ۹۲) کے معنی زمین جوتی ہوئی کے بجائے زمین کو جوتتی ہو اور یقولا (ص ۱۰) کا ترجمہ کہا، ان دونوں نے کے بجائے، وہ دونوں کہہ دیتے تھے، مناسب ہوگا اسیطرح تسقی (۹۲) کا ترجمہ پانی دینے والی (بصیغہ فاعل) بھی خلاف احتیاط ہے، بعض الفاظ کے مشہور معنی ترک کرکے غیر معروف معنی لئے ہیں جیسے فوم ص ۲ کے معنی لہسن کے بجائے گیہوں اور باغ (ص ۹۱) کے معنی حاجت کرنے والے کے بجائے بے حکمی کرنے والا لکھا ہے، بعض جگہ جو الفاظ نقل کئے ہیں انکے معنی قرآن کے ماسبق و مابعد کی رعایت سے لکھے ہیں، مثلاً صرف مولود (ص ۱۰۰) لکھا ہے، اور معنی لڑکے والا دیا ہے، حالانکہ المولود لہ کے معنی ہیں، بعض جگہ جمع لفظوں کے معنی واحد اور واحد کے جمع تحریر کئے ہیں، جیسے امانی ص ۲۲، خطیۃ ص ۳۰، ظلمات ص ۴۰ وغیرہ بعض الفاظ اور ان کے معنی سہواً چھوٹ گئے ہیں، جیسے لن نصبر (۶۵) اور یعلمان (ص ۸۰)

وغیرہ، امید ہے کہ ان فروگذاشتوں کو آئندہ اڈیشن میں درست کر دیا جائیگا، اس کتاب کے کئی اڈیشن نکلے ہیں انشاء اللہ مصنف کے خلوص نیت و برکت سے یہ اڈیشن بھی مقبول ہوگا۔

سات تحریریں ۔ مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی تقطیع متوسط کاغذ کتابت طباعت بہتر صفحات ۱۷۰ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ پتہ۔ اردو پبلشرز ۶ تلک مارگ لکھنؤ۔

یہ حسب ذیل سات مضامین کا مجموعہ ہے (۱) مولانا ابوالکلام آزاد کی خط نگاری (۲) احتشام صاحب کے دیباچے (۳) شاعر مشرق علامہ اقبال اور انکا سنہ ولادت (۴) حالی کے شخصی مرثیے (۵) حیات سید سلیمان کی چند جھلکیاں (۶) مہدی حسن افادی (۷) حسرت موہانی کی سیاسی زندگی، یہ سب مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، اور مختلف رسالوں میں چھپے تھے اب انکو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے، مضامین محنت و مطالعہ سے لکھے گئے ہیں، اور ادبی و تنقیدی حیثیت سے مفید ہیں، خیالات بھی متوازن ہیں، مولانا حالی، علامہ سید سلیمان ندوی، مہدی افادی اور مولانا حسرت موہانی پر مضامین دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، اقبال کے سنہ ولادت کی مختلف روایتوں کو نقل کر کے اچھی بحث کی گئی ہے، مصنف نے جن مشاہیر علم و ادب کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کمالات کو موضوع بحث بنایا ہے انکی عظمت کے وہ معترف ہیں اسکے اظہار میں انھوں نے حسن ذوق اور سلیقہ سے کام لیا ہے، زبان اور انداز بیان بھی شگفتہ ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا۔

شمع فروزاں ۔ از جناب عروج زیدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت طباعت اچھی صفحات ۱۲۸ مجلد قیمت عہ پتہ (۱) نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی (۲) مکتبہ جہاں رامپور

(۳) عرفان زیدی، گھیر سیف الدین خان، رام پور۔

جناب عروج زیدی پختہ مشق شاعر ہیں، انکا کلام اردو کے مشہور رسالوں میں برابر چھپتا رہتا ہے، ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے مگر دوسرے اصناف سخن میں بھی جوہر طبع دکھا سکتے ہیں یہ عروج صاحب کے قطعات کا مجموعہ ہے، انکی طبیعت میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی ہے اسلئے کلام ابتذال سے خالی

اور درس آموز ہوتا ہے، وہ دور حاضر میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے باوجود انسانی قلوب کی بے نوری اور اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھکر سخت آزردہ ہیں اس لئے ان قطعات میں حسن اخلاق حسن عمل اور عظمت آدم کا پیام دیا ہے۔

اسرار نبوت، ہماری تعلیم کا مسئلہ۔ مرتبہ جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی
تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات بالترتیب، ۴۸ و ۴۰ قیمت بالترتیب
۵، ۴۰ پیسے، پتہ۔ فرقانیہ اکیڈمی ۱۴۳ پولیس روڈ، بنگلور ۲

مولوی شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور بڑے زود نویس ہیں موجودہ سائنسی امور فلکیاتی مسائل تسخیر قمر وغیرہ پر بعض کتابیں اور مضامین لکھکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، یہ دونوں کتابچے ان ہی کے قلم سے ہیں پہلے میں نبوت کے مقاصد سائنسی نقطہ نظر سے بیان کئے ہیں اس میں آفتاب فلکی (سورج) اور آفتاب رسالت (محمدؐ) کے خصوصیات بیان کر کے مختلف حیثیتوں سے انکی فیض رسانی وغیرہ کا ذکر ہے یہ کتابچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے لیکن کہیں کہیں بلا ضرورت نامناسب طور پر انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسے ہمارے لئے سمندروں سے پانی بھی ٹرانسپورٹ کرتا ہے (ص ۴) اسلامی سانچے میں ڈھلنے کی پالیسی کرانا (ص ۱۲) خوف و خشیت الہی کا ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے (ص ۲۵) اسکے لنک اپ سے امید و یقین کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں (ص ۳۰) تلاوت (ص ۲) کو نذر کر لکھا ہے حکم کی جمع احکامات (ص ۲۲، ۲۳) اور وجہ کی وجوہات (ص ۳۴) غلط ہے بہشت (ص ۱۳، ۱۴) (یعنی سقا) کا صحیح املا بہشتی ہے، شاہد کا ترجمہ نگراں (ص ۸) بہیڑ کا کہکشائیں (ص ۸) اور بکری کا دودھ رہا ہے (ص ۔ محل نظر ہے، دوسرے کتابچہ میں مسلمانوں کے اس زمانہ کے اہم اور ضروری مسئلہ تعلیم کے متعلق یہ مناسب خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کیلئے تو بقدر ضرورت دینی مسائل کا جان لینا اور نئے علوم و مسائل سے کچھ نہ کچھ لگاؤ رکھنا کافی ہو مگر مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دینی و دنیوی علوم کی جامع اور سرود میں کمال رکھنے والی ہو، اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے بعض تجویزیں پیش کی ہیں اس قسم کی تجویزیں پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں مگر اب قوم کے ارباب حل و عقد کی جانب سے عملی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے محض تجویزیں قلمبند کر دینے سے یہ پیچیدہ اور نازک مسئلہ حل ہو سکتا ہے نہ ملت کی تعمیر و ترقی ہو سکتی ہے۔ (ض)

جلد ۱۲۱ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۸ء عدد ۲

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آج سے دو سال پہلے ہندوستان اور پاکستان میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا گیا تھا جس میں دونوں ملکوں کے بین الاقوامی سمینار میں بعض محققوں اور دانشوروں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے بھی کہ نہیں؟ انھوں نے مستند اور معاصر تحریروں سے اس کا ثبوت طلب کیا، جو اس وقت فراہم نہ کرنے کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے امیر خسرو کی ارادت ثابت نہیں کی جا سکتی ہے،

راقم کے پاس بھی کچھ ایسے خطوط موصول ہوئے کہ اگر امیر خسرو واقعی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھے تو اس کو مستند حوالوں سے ثابت کیا جائے، سمینار ہی میں یہ سوال مضحک معلوم ہوا تھا، اور جب اس موضوع پر ابھی حال ہی میں ایک مقالہ لکھنے بیٹھا تو مذکورۂ بالا دانشوروں کا دعویٰ ایسے ہی بے سر و پا معلوم ہوا جیسے کسی زمانہ میں ایک محقق نے اپنی تحقیق کا دریا بہا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کربلا کا واقعہ پیش ہی نہیں آیا، حضرت امام حسینؓ نہ شہید ہوئے اور نہ کربلا میں مدفون ہیں۔ آج کل تو یہ تحقیقی مہم بھی جاری ہے کہ آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کو شاہجہاں نے نہیں بنوایا، بلکہ یہ راجپوت راجاؤں کے محلات پہلے سے تھے، بعض محققوں نے تو یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ کلیر شریف کے حضرت علاء الدین صابرؒ کا وجود تھا بھی کہ نہیں؟ ایک صاحب نے تو یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ جہاں مدفون ہیں وہ ان کا اصلی مرقد نہیں،

ایسی تحقیقات کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بعض تلوار کے دھنی خواہ مخواہ فساد فی الارض برپا کر دیتے ہیں، اسی طرح تحقیق کے بعض دھنی اپنا جوہر دکھا کر فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایت اور فساد فی الراسخ العقیدگی برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں،

سیمنار میں جن دانشوروں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے اس سے انکی
صرف تفریحی تحقیق کا اظہار ہوا تھا ورنہ اگر امیر خسرو کی مثنویاں اور تصانیف کا مطالعہ کرتے تو اس قسم کی تحقیق سوقیانہ تحقیق سمجھے
کو نیچا نہ دکھاتے کیونکہ امیر خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی شان میں جتنی منقبتیں کہی ہیں ان میں انہی ارادت
پر بڑا فخر کیا ہے اپنی مثنوی مطلع الانوار میں اپنے شیخ کی جو منقبت کہی ہے اس میں پہلے پیر کی فضیلت بیان کی ہے پھر لکھتے
ہیں کہ انھوں نے اپنے روحانی منعم ہی کی بدولت سب کچھ حاصل کیا اسی منقبت میں رقمطراز ہیں کہ ان کو حضرت خواجہ
کی غلامی یعنی مریدی پر فخر ہے اور وہ سلسلۂ نظامی میں منسلک ہو گئے ہیں جس کے بعد ان کو کسی اور مرشد کی ضرورت نہیں

مفتخر از دے بہ غلامی منم　　خواجہ نظام ست و نظامی منم

چو نظر مرحمتش گشت یار　　نیست مرا حاجت آموزگار

پھر خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انکو حضرت خواجہ کی تعلیم پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو اور اُن کو جو انوار حاصل ہوتے ہیں
ان کا کچھ پرتو انکے یعنی خسرو کے دل پر بھی پڑتا رہے (علی گڈھ اڈیشن ص ۲۳-۲۰) اپنی مثنوی لیلیٰ و مجنوں میں اپنے کو
حضرت خواجہ کا روحانی چاکر بتایا ہے (علی گڈھ اڈیشن ص ۱۴) آئینہ سکندری میں جب پیر تو در نعت لکھ لیتے ہیں تو کہتے
ہیں کہ اپنے پیغمبر پر در نثار کرتے وقت لولوئے شاہوار حاصل ہوئے تو یہ خیال آیا کہ ان موتیوں کا تحفہ اپنے پیر کی خد
میں پیش کروں، (علی گڈھ اڈیشن ص ۱۱)

ہشت بہشت میں جو منقبت لکھی اس میں ارادت کے آداب کے مطابق اپنے کو حضرت خواجہ کا غلام بتاتے ہیں
اور حشر میں انہی کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہوتے ہیں (ص ۱۵) مثنوی دول رانی میں حمد اور نعت لکھ چکے تو کہتے ہیں
کہ اب اپنے پیر کا ذکر کرتا ہے (ص ۱۵) اپنی مثنوی نہ سپہر میں دل کھول کر لکھا ہے کہ اُن کو اپنے شیخ کی ارادت میں ایک عظیم
پناہ مل گئی ہے اور وہ راہ مستقیم پر آگئے ہیں اور خوش ہیں کہ ان کو ایک دست گیر مل گیا ہے اس سلسلہ میں لکھتے ہیں
کہ اس شاہ کا ہاتھ میرے لئے ایک کشتی بن گیا ہے جس کے بعد (تصوف کا) بحر میرے لئے کھل گیا ہے میں اپنے
پیر کے صفات کا اظہار نہیں کر سکتا ہوں اسی لئے میں شرم سے اپنے سر کو اٹھا نہیں سکتا ہوں جب کہ میں
کوشش کرتا ہوں کہ میں نے ان سے جو کچھ پایا ان پر نچھاور کر دوں، (ص ۴۷)

طوالت کے خیال سے یہاں پر اشعار نہیں نقل کئے گئے ہیں، ان کے معانی دیدیئے گئے ہیں، مثنویوں کے صفحات کے حوالے سے ان کی تصدیق کی جا سکتی ہے، امیر خسرو کے معاصرین میں ان کی ارادت کی دھوم ہے، سیرالاولیاء حضرت امیر خورد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہی کے عہد میں لکھی گئی، اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر خسرو جب بلوغ کو پہنچے تو وہ سلطان المشائخ کی ارادت کے شرف سے مشرف ہوئے، اور طرح طرح کے مخصوص مراحم و شفقت سے مخصوص کئے گئے، ان پر خاص نظر کا لحاظ رکھا جاتا تھا، انھوں نے سلطان المشائخ امیر خسرو کے نانا راوت عرض کے گھر میں رہتے تھے، جو مندہ پل کے دروازہ کے پاس تھا، اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو اپنی محبت اور اعتقاد صادق کی وجہ سے حضرت خواجہ کے محرم اسرار بھی ہو گئے تھے، (ص ۳۰۱)

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف مولانا ضیاء الدین برنی امیر خسرو کے پیر بھائی گہرے دوست اور ہم نشیں تھے وہ لکھتے ہیں کہ میں امیر خسرو، امیر حسن اور میرے درمیان محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے ہیں، وہ نہ میرے بغیر رہ سکتے تھے، اور نہ میں ان کی ہم نشینی کے بغیر زندگی بسر کر سکتا تھا، انہی کا بیان ہے کہ امیر خسرو اپنے تمام فضل و کمال اور فن بلاغت کے ساتھ مستقیم الحال صوفی بھی تھے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا وہ متعدی اور لازمی عبادت میں یکساں تھے، اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، وہ شیخ (نظام الدین) کے خاص مریدوں میں تھے، میں نے اتنا عقیدتمند مرید کوئی اور نہیں دیکھا، عشق و محبت الٰہی سے ان کو پورا حصہ ملا تھا، صاحب سماع اور صاحب حال و وجد تھے، (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹)

ان معاصر شہادتوں کے بعد سمینار یا کسی مقالہ میں کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید نہ تھے، تو یہ فن تحقیق کی کیسی بے وقعتی ہوگی، راقم [illegible] اس سلسلہ میں مطالعہ کرنے بیٹھا تو امیر خسرو ایک صوفی کی حیثیت سے، ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہو گئی جو عنقریب شائع ہوگی، اس میں دکھایا گیا کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے صرف بہت ہی چہیتے مرید تھے، بلکہ [illegible] رہی، اسی کی بدولت وہ مستقیم الحال صوفی بھی، عشق الٰہی میں سرشار بھی، عشق رسول میں [illegible] بھی، صاحب حال و وجد بھی تھے،

مقالات

تقدیرِ امم اور علامہ اقبالؒ

از
ڈاکٹر محمد ریاض تہران یونیورسٹی،

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں اقوام و امم کے عروج و زوال کے بارے میں متعدد اہم نکتے ملتے ہیں، ان سب نکات کو یکجا کیا جائے تو ایک مبسوط کتاب بن جائے لیکن اس وقت اس موضوع کو ایک مقالہ تک محدود کرنا ہے، تقدیرِ امم در اصل ایک اہم بالشان مسئلہ ہے، جس پر تاریخ اور فلسفہ عمران کا کوئی ژرف بین عالم ہی گفتگو کر سکتا ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے متعدد فلاسفہ اور مفکرین کے نام تلاش کئے جا سکتے ہیں، جنھوں نے حیات و ممات ملل کے بارہ میں بحث کی ہے ان حضرات میں علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ ۱۴۳۲ء) کا نام زیادہ مشہور ہے، عصر حاضر کو ایران کے نامور شاعر ملک الشعراء محمد تقی بہار مشہدی (م ۱۹۵۱ء) نے قرنِ اقبال کہا ہے، اس لئے اس قرن کے اس خاص سال میں جس میں شاعرِ مشرق کی ولادت کو سو برس پورے ہو رہے ہیں، تقدیرِ امم کے سلسلے میں انکی فکر و نظر سے استفادہ کرنے کی خاص ضرورت ہے۔

قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت　　واحدے کز صد ہزاراں برگزشت

شاعران گشتند جیش تار و مار — وین مبارز کرد کار صد ہزار

ہیکلے شد از سخن گوئی بپا — گفت کل الصید فی جوف الفرا

عالم حجت نمی ماند تہی — فرق باشد از درم تا فربہی

اقبال کے یہاں [illegible] ایک کس تصور موجود ہے، جسے وہ جہانبانی سے بھی مشکل قرار دیتے ہیں۔

جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

مگر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کی جہانبانی اور جہاں بینی کے نظریات انکی حکمت دین کے تابع ہیں۔

ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اس لئے انکی دیگر تعلیمات کی طرح، تقدیر امم کے ضمن میں انکے افکار عالیہ بھی اس ایمانی بصیرت و فراست کے آئینہ دار ہیں، جس کی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے! فرماتے ہیں

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا — مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں۔

چو سرمہ رازی راز دیدہ فرو شستم — تقدیر امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

ایک اور جگہ یوں ارشاد ہے،

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مقصد یہ کہ تقدیر امم ہر زمانہ میں قرآن مجید سے ہویدا رہے گی مگر اسے دیکھنے کے لیے امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کے فلسفیانہ اور کلامی مباحث اور زمخشری کی عربی دلغوی موشگافیوں کے بجائے قلب کی جلا اور تزکیہ کی ضرورت ہے، تاکہ اس پر حقائق کا

(ملاحظہ ہو آیت ۳۴ پارہ ۸) ان کی عمریں کبھی مختصر ہوتی ہیں، اور کبھی طویل، انفرادی جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے جس طرح مضرت رساں چیزوں سے اجتناب، قوت بخش غذا، صحت مند ماحول اور محنت و ریاضت ضروری ہے، اسی طرح اقوام و ملل کو بھی درازیٔ عمر کے لیے سخت کوشی کی عادت ڈالنے، صداقت و عدالت کو دستور العمل بنانے اور عیش پرستی سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ تن آسان اور عیش پسند تو میں جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق ملاحظہ ہوں کہ شمشیر و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب سے دل بہلانے والوں کا انجام کیا ہوا،

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم		کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا		انگبیں جسکے جوانوں کو ہو تلخاب حیات

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود		زانکہ بر جندل گماں بردند عود

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام		وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام
میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے		شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اوپر کا ایک شعر مولانائے رومؒ (م ۲۷۲ ہجری) کا ہے جسے اقبال نے پیام مشرق اور بال جبریل میں تضمین کیا ہے۔ سخت کوشی و تن آسانی، جمعیت اور بے جمعیتی کے پیمانہ سے اقبال نے بعض اقوام کے عرصۂ حیات کو ناپا بھی ہے، بدیہی مثالیں تیموریان ہند اور ترکان عثمانی کی ہیں، پہلے خاندان نے کوئی ڈیڑھ سو برس تک جفاکشی اور سخت کوشی کو اپنا شعار بنائے رکھا (۱۵۲۶ تا ۱۷۰۷ء از بابر تا اورنگ زیب) مگر اس کے بعد یا قوم تن آسانی اور بے جمعیتی کا دور دورہ رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے چند سال بعد یہ خاندان ختم ہوگیا۔ اس کے مقابلے میں ترکان عثمانی کا ......

قوم صدیاں گزر جانے کے باوجود سرگرمِ کار ہے۔ نظم غلام قادر رُہیلہ (بانگِ درا)

کا یہ شعر غور طلب ہے کہ

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کہیں کہیں علامہ مرحوم تجاہلِ عارفانہ بھی اختیار فرماتے ہیں۔

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

در فشِ ملّتِ عثمانیاں دو بار بلند چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتادست

قرآنِ کریم میں کئی غلط کار اقوام کا عبرت انگیز انجام بیان کیا گیا ہے،

اقوامِ سابق کے بڑے جرائم خدا فراموشی، شرک، بدکاری، غرور اور بد معاملگی

ان معائب میں اقوامِ حاضر بھی ملوث ہیں، ان مجرموں کو جلد یا بدیر اپنے اعمالِ بد کی

سزا ملے گی۔ مسلمان بھی اس دارو گیر سے محفوظ نہیں رہیں گے مگر اقبال کا خیال ہے کہ

ملّتِ اسلامیہ اپنے قصوروں کی بنا پر آلام و مصائب سے دوچار ہوتی رہے گی مگر صفحۂ

ہستی سے معدوم نہیں ہوگی، کیونکہ چراغِ اسلام کبھی گل نہ ہو سکے گا۔ اللہ اپنے نور کو

پورا کر کے رہے گا۔

گرچہ ملّت ہم بمیرد مثلِ فرد از اجل فرمان پذیرد مثلِ فرد

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

از اجل این قوم بے پرواستے استوار از نحن نزّلنا ستے

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است از فسردن این چراغ آسودہ است

تاریخِ اسلام کے مطالعے سے انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ متعدد ہولناک فتنوں کے

اور یہ ملت اسلامیہ ہنوز بفضل اللہ موجود ہے مگر وہ جس مقام پر رہا کرتی تھی (فلک عظمت اور ارمغان حجاز حضور حق) انھوں نے عصر حاضر کی مسلمان قوم کی بے عملی کا اظہار بھی کیا ہے۔ موجودہ امت مسلمہ کا انحطاط واضح ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں میں عمل کی اساس اسلام سے روگردانی بھی، الا ماشاء اللہ۔ اقوام و ملل کا تغیر و تبدل اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں۔ (۱۲۰۹، ۱۲۳) اس لئے اقبال ایک جگہ یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ مسلمان شاید مٹ جائیں، اور ان کی جگہ ایک اور ملت اسلامیہ عالم ظہور میں آجائے جو قرآن مجید کی تعلیمات پر بہتر طریقہ پر عمل پیرا ہو۔ دوسری جگہ وہ اس ملت منتظر کے ظہور کی دعا فرماتے اور اس کے اوصاف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

منزل و مقصود قرآن دیگر است — رسم و آئین مسلمان دیگر است
در دل او آتش سوزنده نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زنده نیست
بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد — در ایاغ او نه مے دیدم نه درد
ما همی خواهیم ز دنیائے پیر — آن که باشد هم بشیر و هم نذیر
محفل ما بے مے و بے ساقی است — ساز قرآن را نواها باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسمان دارد هزاران زخمه ور
ذکر حق از امتان آمد غنی — از زمان و از مکان آمد غنی
حق اگر از پیش ما بردار دش — پیش قومی دیگری بگذار دش
از مسلمان دیده ام تقلید و ظن — هر زمان جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزی که محرومش کنند — آتش خود بر دل دیگر زنند

مسلمانان ادات و زنده پوش است — دل او جبرئیل اندر خروش است

یا نقش دگر ملت بہ بینم — کہ این ملت جہان را بار دوش است
دگر ملت کہ کارے پیش گیرد — دگر ملت کہ زشت و خوب گیرد
نگر ملا بکی عالم رضامند — دو عالم را بدوش خویشتن گیرد
دگر قومے کہ ذکر لا الٰہش — برآرد از دل شب صبحگاہی
شناسد منزلش را آفتابے — کہ ریگ کہکشان روبیدہ راہش

تعزیر اجتماعی | اس اصول کا مدعا یہ ہے کہ فطرت الٰہی کی نظر میں کسی ملت کا کام ایک یا چند افراد کے مقابلے میں کہیں اہم ہے، قرآن مجید میں ابو لہب، بلعم باعور، فرعون اور قارون جیسے چند افراد کی تعزیر و تعذیب کا ذکر آیا ہے، مگر اللہ نے سیاق وہاں بھی ملت کا ذکر زیادہ اہم ہے، کیونکہ افراد بہرحال اقوام کا جزو ہوتے ہیں،

اللہ تعالیٰ جماعت اور قوم کے کام کو برکت دیتا ہے، مگر ایسی غلط اندازیوں کے خدشے بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے ملی اور قومی کاموں کے مالہ و ما علیہ کو پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ سامنے رکھنا چاہئے ورنہ اجتماعی خطائیں ناقابل تعزیر اور ناقابل معافی ہوتی ہیں،

ناہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت — ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں — تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو — تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی — بُراں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

مجھ کو معلوم ہیں پیران حرم کے انداز — ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف
اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے　　قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

یہاں ضمنی طور پر اقبال کے فرد و ملت (یعنی خودی و بیخودی) کے نظریات کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر ہے، انکی تفصیل اسرار خودی، اور رموز بیخودی، نام کی مثنویوں میں ہے، اقبال کا یہ فلسفہ نصف صدی سے عالمگیر ہو چکا ہے، اقبال نے فرد کی تعمیر سیرت (خودی) کو قومی خدمت کے تابع رکھا ہے، (بیخودی) کیونکہ انکا محبوب فرد، روسو کا امیل، نہیں ہے، بلکہ اپنے مسلمان معاشرے کا خدمت گزار اور بہی خواہ ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں، اور بیرون دریا کچھ نہیں
فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در جماعت خود شکن گردد خودی　　تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

مگر اقبال کی نظر میں، قوم، کا نظریہ، سیاسیات کی کتب اور مغربی تصور قومیت سے مختلف ہے، ان کے اشعار، انگریزی خطبات (خطبہ پنجم خصوصاً) مقالات، مکاتیب اور بیانات میں اسلامی بین الاقوامیت کے علاوہ مسلمان ممالک کی انفرادی، قومیت بھی نمایاں ہے، (خطبات میں ایران اور ترک کے حوالے سے) اقبال اس معاملے میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۰) کے ہم خیال ہیں جو مسلمان ممالک کے انفرادی تشخص کے حامی تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے ممکن العمل اتحاد اور اشتراک کے داعی بھی یہ نکتہ قابل ذکر ہے، کہ مسلمانوں کے تصور، قوم میں، دین، ایک محور و مرکز ہے، اور دیگر معاملات اسی سے مربوط ہیں،

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے ابتک بیخبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو — ملت و دولت ہے فقط حفظ حرم کا ایک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

علامۂ موصوف بجا طور پر فرماتے ہیں کہ افراد اور ملت کا رابطہ ناقابل انفصال ہے اس لیے دانا دل افراد برے دن آجانے پر ملت و قوم سے قطع روابط نہیں کرتے بلکہ خزاں کی پژمردگی کو خندۂ بہار کی آمد کے انتظار میں برداشت کرتے رہتے ہیں۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور — خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے

شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

بال جبریل میں اقبال نے مولانائے رومؒ کے مندرجہ ذیل شعر کو تضمین کیا ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ صاحب دل، دردمند فرد کی دل آزاری قوم کے زوال کا موجب بن جاتی ہے

نظم پیر رومی

ایمانی اب ملاں میں نہیں وہ رنگ و بو — مرد کیوں کر ہو گیا اس کا لہو

وارثی تا دل صاحب دلے نامد بدرد — ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

کسی دردمند اور مخلص صاحب دل شخص کی بد دعا کی تاثیر، روحانیت پر ایمان رکھنے والے افراد کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں ہو سکتی کہ بقول سعدی۔

دو آتش سوزاں نکند با سپند — آنچہ کند دود دل دردمند

مگر بالعموم اقبال نے قوم کو افراد پر حتی کہ بادشاہوں پر بھی ترجیح دی ہے۔

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت — خراج شہر و گنج کان و یم رفت

امم را از شہاں پایندہ تر دان — نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت؟

احساس ذمہ داری | اس اصول کا دائرہ عمل انفرادی اور اجتماعی زندگی کو محیط ہے، جدید عمرانیات و سیاسیات کے ماہر بھی اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے ہیں، قرآن مجید میں یہ اصول بڑی سادگی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے (ملاحظہ ہو ۱۶:۴۴ - ۶۰) اور ایک کی بدعملی کسی دوسرے کے لیے باعث وبال و عذاب نہیں ہو سکتی۔ احساس ذمہ داری کے ذریعے فرد و ملت اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ وہ ترقی و سربلندی کے کسی معیار پر ہیں، اور ملت کی پسماندگی کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ یہ خودی اور بیخودی کے ممکنات کا محاسبہ اور تجزیہ ہے، اور اسی کی مناسبت سے اقبال نے جوانوں اور معاشرے کے ذمہ دار و فعال افراد کے اعمال کی اس قدر تعریف کی ہے۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات — جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

اگر جوان ہوں میری قوم کے جسور و غیور — قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ۔۔۔ ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے ۔۔۔ وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے ۔۔۔ پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا ۔۔۔ پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے ۔۔۔ بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

احساسِ ذمہ داری کا فقدان، تقدیرِ امم کا ایک المیہ ہے، کسی کارواں کو اگر اپنے متاع کے لٹ جانے کا احساس ہو تو امید رکھنا چاہیے کہ آیندہ وہ زیادہ محتاط رہیں گے اور تلافیِ مافات کی کوشش بھی کریں گے لیکن احساسِ ذمہ داری سے محروم افراد نہ محتاط رہیں گے نہ تلافی کی فکر کریں گے،

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایک قطعہ میں (ضربِ کلیم) اقبال برصغیر کے باشندوں سے گلہ و شکوہ کرتے ہیں کہ ان کے احساسِ ذمہ داری کے فقدان نے اس سرزمین کو انگریزوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ ان کا یہ شکوہ کتنا صحیح تھا!

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک ۔۔۔ بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ ۔۔۔ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر ۔۔۔ افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو ۔۔۔ مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

احساسِ ذمہ داری اور احساسِ جواب دہی ایک تصویر کے دو رخ ہیں خصوصاً اقبال کے نزدیک معاشرے میں جو کہ مسلمان معاشرے میں حاکم ملت کے خادم ہوتے ہیں، جنھیں خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس تو ہونا ہی چاہیے مگر وہ افرادِ ملت کے سامنے بھی

جواب دہ ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے کئی ادوار میں ایسے حکمرانوں کی مثالیں موجود ہیں جو حکمرانہ نہیں بلکہ خادمانہ انداز رکھتے تھے، ان کی درویشانہ زندگی سب کے سامنے تھی اور وہ خدمت اور جواب دہی کی دعوت دیتے رہے ہیں، اقبال نے کئی مواقع پر ایسے حکمرانوں کی مثالیں دی ہیں جیسے!

سروری در دین ما خدمت گری است — عدل فاروقیؓ و فقر حیدریؓ است

قائد ملت شہنشاہ مراد — تیغ او را برق و تندر خانہ زاد

ہم فقیرے ہم شہ گردوں فرے — اردشیرے با روان بوذرؓ ے

غرق بودش در زرہ بالا و دوش — در میان سینہ دل موئینہ پوش

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند — مثل سلمانؓ در مدائن بودہ اند

حکمرانے بود و سامانے نداشت — دست او جز تیغ و قرآنے نداشت (۲۰۶)

طبع روشن مرد حق را آبروست — خدمت خلق خدا مقصود اوست

خدمت از رسم و رہ پیغمبری است — مزد خدمت خواستن سوداگری است

اصول تغیر (تغیر استعداد) قرآن مجید کا وہ اہم اصول ہے جسے تقدیر امم میں بے حد اہمیت حاصل ہے اور اقبال نے اسے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اس اصول کے ایک حصہ کو جدید علم سیاست کی رو سے، ذہنی کشادہ اور روشن فکری کہہ سکتے ہیں اسلامی اجتہاد بھی یہی ہے، اجتہاد میں قرآن و سنت اور اجماع کی روشنی میں قیاس سے کام لیتے ہوئے علمائے مسائل کا اسلامی تعلیمات سے انطباق کرتے ہیں۔ اصول تغیر کے دوسرے حصے کو سرنوشت یا تقدیر کہتے ہیں اختصار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ

اقبال نے مسائل حیات کا مردانہ سامنا کرنے کی دعوت دیتے ہیں، نیز تقدیر شکنی اور تغیر تقادیر کے نکتے سمجھاتے ہیں۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں (ب د)

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے (ض ک)

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں — ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی (ب ج)

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام؟ — یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر — ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

قرآن مجید میں کوشش و عمل کو بے حد اہمیت دی گئی ہے، (۵۳ | ۳۹) اس کے نزدیک افراد و ملل کی حالت میں تغیر و تبدل کے بغیر ان کی تقدیر نہیں بدلتی (۱۳ | ۱۱) سورۂ رعد کی اس آیت کی (جسے اقبال نے دیباچۂ پیام مشرق میں نقل کیا ہے)، مثبت و منفی تعبیرات ممکن ہیں۔ افراد یا ملل کی سرنوشت متعین نہیں ہے، ضمیر کی تطہیر اور عمل کی تصحیح سے قوموں کی زندگی بدل جاتی ہے، افراد یا اقوام کی صلاحیت و استعداد کی بہتری سے انکا مقدر بہتر ہو جاتا ہے، اور استعداد کی خامی اور صلاحیت کے نقص کی وجہ سے ان کی سرنوشت بھی زشت اور حوصلہ شکن صورت میں نمایاں ہوتی ہے، انہی تشاقی معانی میں اقبال صدق و مروت کو اپنا معمول بنانے والی اقوام کی اجتہادی غلطیوں کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور انکی تقدیر کو منقلب اور متغیر قرار دیتے ہیں۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں انکی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی انکی　　معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال　　یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

علامہ مرحوم نے نثر میں ان خیالات کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور میں نے اپنی فارسی تصنیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔" (دیباچہ پیام مشرق)

اقبال کی یہ تحریر تقریباً ۱۹۲۳ء کی ہے، یہ صحیح ہے کہ نفس میں تغیر و انقلاب لانے اور توکل، تدبیر و تقدیر نیز قناعت کے تازہ معانی بیان کرنے کا کام اقبال نے زیادہ اپنی فارسی کتابوں کے ذریعہ انجام دیا، مگر ان کی اردو شاعری اور اردو و انگریزی تحریریں بھی ان معانی و مطالب سے خالی نہیں ہیں۔ فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر　　تہ این گنبد گرداں رہے ہست
اگر باور نداری، خیز و دریاب　　کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست
کالیدی ز تقدیر بصحت کہ بودلست　　آں حلقۂ زنجیر ہاں مشکل بدست

نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکم تقدیر دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

ارضیاں نقد خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی، او دیگر است

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود — این زمین و آسماں دیگر شود (ع ق ن)

بعض دیگر اکابر ملت کی طرح اقبال نے مسئلۂ جبر و اختیار یا تقدیر مقید و آزاد پہ کافی لکھا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے سرنوشت ساز اعمال میں آزاد ہے، مگر اطاعت خدا اس کی آزادی میں اضافے کا موجب بنتی ہے، وہ جس حد تک خدا کا مطیع ہوگا خدائی تو تیں اسی قدر اس کی معاون و مطیع ہوں گی۔ شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں کہا تھا،

توہم گردن از حکمِ داور مپیچ — کہ گردن نپیچد ز حکم تو ہیچ

اقبال اس بات کو یوں فرماتے ہیں (مثنوی اسرار خودی، اطاعت مرحلۂ اول خودی،)

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرماں پذیری کس شود — آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو — از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

اقبال نے قناعت اور توکل کے عرف عام کے معانی قبول نہیں کئے، ان کے نزدیک جبر و قدر کے بارے میں راہ وسط اختیار کرنا ہی معقول روش ہے، ہم ایچی

ممکن استعداد سے کام کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ کامیابی کے لیے خدا سے استعانت اور استمداد کرنا بھی صحیح ہے۔ توکل و قناعت یہی ہے، بے عملی و بے کاری نہ توکل و قناعت ہے نہ تقدیر سے مربوط ہے۔

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
(ض ک)
غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا — زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی — عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا — دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ

جاوید نامہ (فلک مشتری) میں اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ مومن خوشنودیٔ خدا کے کام انجام دیتا ہے، اور خدا بھی اس کے دل خواہ کاموں کی تکمیل میں اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ صحابہؓ کرام کے کارناموں کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ آخر ان کے کام محدود و نامکمل کیوں نہ رہے؟ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید نے کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مومن کی تدبیر ہمیشہ تقدیر کی شریک و دمساز ہوتی ہے۔

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ — لرزد از نیروے او ابلیس و مرگ
جبر دیں مرد صاحب ہمت است — جبر مردان از کمالِ قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر — جبر مرد خام را آغوش قبر
جبر خالدؓ عالمے برہم زند — جبر ما بیخ و بنِ ما بر کند
کار مردان است تسلیم و رضا — بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ　　نے خودی را، نے خدا را دیدۂ

مرد مومن با خدا دارد نیاز　　با تو ما سازیم، تو با ما بساز

عزم او خلاق تقدیر حق است　　روز ہیجا، تیر او تیر حق است

اس ضمن میں بال جبریل، کا درج ذیل شعر، شاعر کے بیان کا ایک نمایاں اعجاز ہے،

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ذیل کے اردو اشعار اسی سیاق میں ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی　　کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ　　خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

مگر مجھے اعتراف ہے کہ چشم سرمہ سا، میں تقدیر کی گہرائیاں نظر آنے کی بات سمجھی نہیں جا سکی:-

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں　　نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے

مندرجہ بالا چار اصولوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسے اصول تصانیفِ اقبال میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ جو حکمت قرآنی سے ماخوذ و مستنیر ہیں، اور تقدیر امم سے ان کا گہرا تعلق ہے، ہم انھیں اجمالاً بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کے موجودہ زوال و انحطاط کے بارے میں اقبال کے افکار کی طرف اشارہ کریں گے، اسی کے ضمن میں بعض اور امور کا ذکر بھی آجائے گا۔

عروج امم کے وسائل

اقبال کے نزدیک انفرادی عروج، خودی ہے اور عروج امم بے خودی۔ ان کے نزدیک عروج امم کے کئی وسائل ہیں مگر توحید یقین محکم

نظامِ تعلیم، جوش کردار، اور فکر و عمل کی جدت، غالباً ان وسائل میں اہم ترین یقین، عقیدہ و عمل کی غیر مذہب اور پائدار قوت ہے، اور تقدیر امم میں اسکی بے حد اہمیت ہے،

دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم ہے وہ قوت کہ حریف اسکی نہیں عقل حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اسکی کبھی شمشیر محمدؐ ہے کبھی چوب کلیمؑ
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اقبال کا یقین، قرآن مجید میں مذکور ایمان کے مرادف ہے اس کا عمل بلکہ سخت کوشی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے، اقبال نے اپنے انگریزی خطبات کے دیباچہ میں اس قرآنی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے، یقین کی تعریف میں ان کے متعدد اشعار اس بے یقین عصر میں ایمان آفریں ہیں،

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یقیں مثل خلیل آتش نشینی یقیں، اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست یقیں بے صحبتِ روح الامیں نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے قدم بیباک نہ کس در کمیں نیست

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کے تعلیمی افکار پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے عام مبصروں اور اساتذہ یا دارس کے اعتقاد کے پردے میں یہ بات روشن کی ہے کہ تعلیم کا منشا صاحبِ شخصیت افراد کی تیاری اور ملّی ضمیر کی تشکیل ہے۔

جب پیرِ فلک نے ورقِ ایام کا الٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل — دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی — فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی — دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی — ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
(ب د)

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
(ب ج)

چو می بینی کہ رہزن کارواں کشت — چہ پرسی کاروانے را چساں کشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی — کہ ازوے روحِ قومے می تواں کشت

جوشِ کردار، اور جدتِ فکر و عمل کے بارے میں بالترتیب اقبال نے نپولین (م ۱۸۲۱ء) اور مسولینی (م ۱۹۴۵ء) کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ مرحوم تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر فرانس اور اٹلی سے گزر رہے تھے۔ وہاں نپولین کی قبر دیکھی اور مسولینی سے ملاقات کی۔ انھوں نے اپنے جو تاثرات بیان کیے ہیں، وہ بالِ جبریل کی دو نظموں کی صورت

میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ نپولین یا مسولینی اقبال کے نقطۂ نظر سے کوئی مثالی حکمراں نہ تھے، بلکہ موخرالذکر پر بعد میں انھوں نے تنقید بھی کی تھی مگر دوسروں کے اچھے اوصاف کی تعریف کرنے میں اقبال نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے،

راز ہے، راز ہے، تقدیر جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب — ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی — ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

بانگِ درا کا ایک قطعہ ارتقا "جس میں اقبال مسلمانانِ عرب کی مبالغت آمیز زندگی کی مثال دیتے ہیں، اس ضمن میں اور بھی معنی خیز ہے، اس کا آخری فارسی شعر فیضی ترشیزی (گیارہویں صدی ہجری کے ایک ایرانی شاعر، مقیم حیدرآباد دکن) کا ہے،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحرگاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی
"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

(باقی)

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات

از

عشرت افروز، ایم اے کراچی

"یہ مقالہ عشرت افروز نے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کی فرمائش پر اس وقت لکھا تھا جب وہ ایم اے کی طالبہ تھیں، مضمون اچھا معلوم ہوا اس لئے قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اب وہ اپنے شوہر [illegible] ام بی بی ایس کے ساتھ کراچی میں ہیں" (معارف)

ابتدائی تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی کی ولادت باسعادت ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۲ھ میں صوبہ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں ہوئی، جو پٹنہ سے ۲۴ میل، اور قصبہ بہار شریف سے ۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ گاؤں ۱۹۴۷ء سے پہلے بڑا مردم خیز سمجھا جاتا تھا، یہاں کے ہر گھر میں انگریزی اور عربی تعلیم کا رواج تھا، سید صاحب قبلہ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب سے پائی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے پھلواری شریف ضلع پٹنہ بھیج دیئے گئے، جہاں کی صحبتوں میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، یہاں کے قیام کے زمانہ میں مولانا عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناولوں کا مطالعہ دلچسپی سے کرتے تھے خود بھی لکھا کرتے تھے۔

جب مولانا عبد الحلیم شرر کا ناول منصور موہنا چھپا اور جب [illegible]

ابتدائی مضمون نگاری | پھلواری شریف میں بعض اسباب کی بنا پر ان کی تعلیم کا سلسلہ صرف ایک ہی سال رہا۔ وہاں سے دربھنگہ تشریف لے گئے، داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ ایک تحریر تعلیم نسواں کے عنوان سے لکھی، جو اس قدر پسند کی گئی کہ اس زمانہ کے صوبہ بہار کے مقبول اخبار اپنچ میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی، اپنچ پٹنہ سے مولوی عبدالرحیم کی ادارت میں نکلتا تھا، اور یہ انگریزی اخبار لندن پنچ کے طرز پر جاری کیا گیا تھا، اور زیادہ تر مزاحیہ انداز میں سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی خرابیوں کا سد باب کرتا تھا، رفتہ رفتہ اس کی اشاعت اتنی بڑھ گئی تھی کہ سنجیدہ مقالہ نگاروں کا بھی جولانگاہ بن گیا تھا، اور اس کے ذریعہ سے صوبہ بہار میں بہت سے ہونہار مضمون نگار پیدا ہوتے رہے،

سنہ ۱۹۰۱ء میں سید صاحب اعلیٰ عربی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوئے، لکھنؤ کی سرزمین میں انکی ادبی و علمی نشوونما خوب ہوئی، ان کو علم و ادب کا ذوق فطری تھا، اسلئے لکھنؤ کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اُن کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، تو اس وقت اُن کی نظر لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" کی طرف اٹھی، مخزن کے ابتدائی دور کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں شیخ محمد اقبال (جو آگے چل کر اسلامی دنیا کے مایۂ ناز شاعر ہوئے) ظفر علی خاں، سید سجاد حیدر، حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی، چودھری خوشی محمد ناظر، حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق، منشی نادر علی خاں صاحب کاکوروی، میر غلام بھیک نیرنگ، لالہ سری رام، منشی دیا نراین نگم، پنڈت شیو نراین شمیم وغیرہ تھے، یہ تمام اصحاب قلم مخزن کے افق پر ستارے بنکر نمودار ہوئے مگر آگے چل کر اردو ادب کے مہرو ماہ بنکر چمکے، مولانا سید سلیمان بھی ان لوگوں کی صف میں آکھڑے ہوئے، اور اس رسالہ میں "وقت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، اس رسالہ میں اُن کا مقالہ چھپا، تو اُن کی ہمت افزائی ہوئی، تو پھر اس زمانہ کے دوسرے مشہور و مقبول رسالہ علی گڑھ منتھلی میگزین میں طبع آزمائی کی، یہ رسالہ گو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا ایک ماہوار

رسالہ تھا، مگر اس کے علمی و ادبی مضامین کی وجہ سے اس کی دھوم تمام ہندوستان میں تھی، اس میں سید صاحب کا ایک مضمون علم اور اسلام کے عنوان سے چھپا، (حیات سلیمان ص ۱۷)

ندوہ میں طلبہ مشاعرے بھی کیا کرتے تھے کبھی کبھی شہر میں بھی مشاعرے ہوتے، سید صاحب ان میں شرکت کرتے تھے، وہ اس زمانہ میں امیر مینائی کے کلام سے متاثر تھے، ان کا دیوان مرآۃ الغیب برابر مطالعہ میں رکھتے، جب کبھی طالب علمانہ انداز میں غزل کہتے تو امیر مینائی ہی کے رنگ میں کہتے، ان کا ایک شعر یہ ہے،

سر سے قدم تک ہو پردہ لے حیا تری　　　حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

(حیات سلیمان ص ۱۸)

"ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" سید صاحب موصوف نے نہ صرف اپنی مضمون نگاری سے ارباب علم کو اپنی طرف متوجہ کیا، بلکہ دارالعلوم ندوہ کے اساتذہ اور ارباب حل و عقد بھی اُن کے روشن مستقبل سے بڑا امید ہو رہے تھے، اس زمانہ میں شاہ سلیمان پھلواروی کی نمایاں حیثیت تھی، وہ ندوۃ العلماء سے بھی دلچسپی لیتے رہتے تھے، ان کی جوہر شناس نظر دوربین نے سید صاحب موصوف کے علمی مستقبل کو صحیح طور سے پرکھا، خود سید صاحب معارف کے شذرات (جولائی [illegible]ء) میں مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، مجھے اپنے عزیزے کم نہیں سمجھتے، میرے والد مرحوم ان کے ہم پیر اور اُن کے خسر کے مسترشد تھے، میرے بھائی مرحوم طب میں اُن کے شاگرد تھے، میں نے بچپن میں پھلواری کے قیام کے زمانہ میں اُن سے ابتدائی منطق کے دو چار سبق پڑھے تھے، وہ جب [illegible] میں ندوہ کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تھے اور مستقل قیام ندوہ میں اختیار فرمایا تھا، تو اُن کی بزرگانہ عنایت

اور چند دنوں بعد انہوں نے میری علمی ترقیوں میں مدد دی، یاد ہو کہ اسی زمانہ میں نواب
محسن الملک مرحوم دار العلوم ندوہ کے معاینہ کے لئے تشریف لائے تھے شاہ صاحب
نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہجہانپوری کو اتفاقاً
پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا
شاہ صاحب نے یہ کہکر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں، اور آپ کو اپنا قصیدہ سنائیں گے
نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں اُن کا امتحان نہیں
لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی اُن پر ایمان لا چکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے
ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں، میں نے
اپنا قصیدہ پڑھا جو افسوس ہے کہ اب موجود نہیں، تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں
تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوائیے، اس کو یہ
پڑھیں، تو البتہ، اس زمانہ میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے،
وہ منگوائے گئے، اور میں نے ان کو پڑھا، اور صحیح ترجمہ کیا، تو بے حد خوش ہوئے
شاہ صاحب بھی بیحد محظوظ ہوئے، اور اس زمانہ کے اخبارات وکیل، وطن اور
کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معاینہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا
ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا، ان کی اس تحریر میں
ایک فقرہ یہ بھی تھا، کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ یہ بہار بہ روئے
میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا، رحمہ اللہ

مولانا شبلی کی علمی و ادبی خصوصیات

یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، ۱۹۰۵ء میں علامہ
شبلی نعمانیؒ دار العلوم ندوہ کے معتمد ہو کر لکھنؤ آئے، تو انہوں نے [illegible]

ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ علامہ شبلی مرحوم مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۱۸۸۷ء)، المامون (۱۸۸۹ء)
سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء)، کلیات فارسی (۱۸۹۳ء)، سفرنامہ مصر و شام (۱۸۹۴ء)، رسائل شبلی (۱۸۹۸ء)
الفاروق (۱۸۹۹ء)، الغزالی (۱۹۰۲ء)، علم الکلام (مارچ ۱۹۰۳ء)، الکلام (۱۹۰۳ء)، سوانح
مولانائے روم (۱۹۰۶ء) کے مصنف بن چکے تھے، اسی زمانہ میں موازنۂ انیس و دبیر بھی لکھی جا چکی
تھی، مگر شائع نہیں ہوئی تھی، ان کتابوں کی اشاعت سے وہ ایک شاعر، شیریں مقال، جلیل القدر
مورخ، اعلیٰ ناقد اور بے مثل ادیب کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے
تھے، ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے طرز انشاء کے موجد تھے، سرسید
مرحوم اُن کے طرز تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ تو لکھنؤ اور دلی کے لئے
باعثِ رشک ہیں، المامون کے دیباچہ میں سرسید مرحوم رقمطراز ہیں:

"یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے
کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا .... ہمارے لائق مصنف (مولانا شبلی)
نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو
ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت
پر موجود ہے، جو خوبصورت ہے، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ
خوبصورتی کو بڑھایا، نہ خوبصورت بنایا ہے، اور نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا، اور حقیقت
یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

(دیباچہ المامون [illegible])

مولانا حالی بھی علامہ شبلی کے طرز انشاء اور اسلوب بیان کے معترف تھے، وہ ان کی
تصنیفات کو بہت شوق سے پڑھتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مصرعہ
ھنئ لتکونی التصنیف کل لسانہ آپ کا وجود قوم کے لئے باعث فخر ہے خدا
تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ وسلامت رکھے۔"

(حیات شبلی ص ۵۰۴ - ۵۰۵)

بعد کے ارباب بصیرت نے علامہ شبلیؒ کی انشا پردازی کی داد حسب ذیل الفاظ میں کیا خوب دی ہے:-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوے خاصہ کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔" (افادات مہدی ص ۱۰۰)

علامہ شبلی نہ صرف اپنی انشا کی فصاحت بلاغت، صفائی، شستگی اور پاکیزگی کے لئے ممتاز ہوئے، بلکہ اپنے علم کی جامعیت کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا شبلیؒ اپنے زمانہ کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے، نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ، ریفارمر، جریدہ نگار، فقیہ، محدث، سب کچھ ہو سکتا تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی، کہ انھوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم صحیحہ و فنون متنوعہ کو اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا، اور ان سب میں شہرت کے مستحق ہو گئے"

ولیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

کثیر الاشواق اور جامع الاذواق ہونے کے باوجود علامہ شبلی نے تصنیف و تالیف کے بلند نمونے اور تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار کو کسی حال میں نہیں چھوڑا، چنانچہ ایک جرمن مستشرق لکھتا ہے، کہ

اہلِ مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں، تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں، گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوئے ہیں"

محمد یحییٰ تنہا سیر المصنفین جلد دوم ص ۳۲۵ میں لکھتے ہیں:۔

"بلاشبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں، آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوط علمی رائے اور منطقی استدلال ہے، ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے، اور طرزِ ادا میں دلآویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے، عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے، یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں، اسی کے ساتھ مولانا مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ اجنبیت باقی نہیں رہتی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے، آپ کی تصانیف کے مطالعے سے دنیائے اسلام کی وسعت، عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے، غیر اقوام ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت سے متاثر ہوتی ہیں

ہو جاتی ہیں، یہ کتاب بس سال چند ہی امام محمی اور مقالہ ذکی ہیں ہے اپنی آپ نظیر ہیں۔

علامہ شبلی کے اثرات علامہ شبلی کی تمام ادبی و علمی خصوصیات سے مولانا سید سلیمان ندوی ندوہ کے قیام ہی کے زمانہ میں متاثر ہو رہے تھے، چنانچہ علامہ شبلی نے جب دارالعلوم ندوہ کی معتمدی قبول کی تو مولانا سید سلیمان ندوی کو غیر معمولی مسرت ہوئی، اور ندوہ میں ان کی تشریف آوری کے سلسلہ میں اپنی خوشی کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا، جس کے بعض اشعار یہاں پر صرف اس لئے نقل کئے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو کہ علامہ شبلی کے علم و فضل اور ادب و انشاء کا اثر سید صاحب موصوف پر اس وقت تک کتنا پڑ چکا تھا،

عصائے موسوی کلکش ید بیضا ست قرطاسش سطور صفحہ اش چوں جعد بر رخسار نورانی
صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشن حکمت مدادش از پئے چشم ورق کحل صفاہانی
گراں تر چند او را نقش بود از گنج قارونی نمی ارزد بیک حرفش ہمہ ساماں سامانی
عنان خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش ز بانگ طبل صیتش پر فضائے کون امکانی
خجل از حسن نثرش لعبتان چلۂ گردوں عرق از در نظمش بر جبین ابر نیسانی
بخواہم از خداوند کہ نامش حی قیوم است بماند زندہ جاویدا یا شبلی نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرۃ الاستاذ بر خوانم ندا آمد مرا از پردۂ ناموس ربانی

دلیل فضل ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد
بہ پیش مور مرسلہ نہی کہ ہمنام سلیمانی

علامہ شبلی کی نظر کیمیا اثر علامہ شبلی نے جب سید صاحب موصوف کی ادبی تربیت میں اہتمام لیا تو استاد کی نظر کیمیا اثر سے ان میں اور بھی زیادہ جلا پیدا ہونے لگی، علامہ شبلی میں کچے خام کو کندن بنانے کا بھی غیر معمولی وصف تھا، اس لئے اور کاملوں کی پیرو فقیری کے زیادہ ہی اثر کی صحبت میں

عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق صاحب (ناظم انجمن ترقی اردو) سید سجاد حیدر یلدرم، سید محفوظ علی، شیخ محمد عنایت اللہ (سابق ناظم دارالترجمہ) چودھری خوشی محمد اور مسعود علی محوی وغیرہ ہیں، علم و ادب اور شعر و سخن کا چسکا پڑا، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے جو حیدر آباد دکن کے جج ہوئے، اپنے مجموعہ نظم فارسی "نذر عقیدت" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں،

"علی گڑھ کالج کے بی۔ اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد بھی تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے، بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، مولانا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا اثر تھا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے، اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک و صاف ہو گئے، اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی، اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہو سکا"

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں:

"مجھکو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے تاریخ و ادب فارسی کا ذوق یہیں نشو و نما پذیر ہوا۔"[۱]

استاد سے استفادہ | علامہ شبلی کی علمی صحبت و تربیت سے سید صاحب موصوف بھی زیادہ سے زیادہ مستفید ہوئے، چنانچہ مئی ۱۹۰۵ء میں سید صاحب موصوف کا ایک مقالہ "علم ہیئت" بوجب الندوہ میں شائع ہوا تو اس مضمون کے متعلق علامہ شبلی خود جون ۱۹۰۵ء کے الندوہ

---

[۱] منقول از حیات شبلی، مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۵۲، ۱۰۱

کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں کہ،

"ہم کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ جو مضمون ہمارے دارالعلوم کے ایک طالب علم کا پچھلے پرچہ میں شائع ہوا وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، جناب مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے ایک خط حال میں ہم کو لکھا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فَبَارَکَ فِیْھَا وَفِیْ طَلَبَتِھَا وَفِیْ تَعْلِیْمِھَا "مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کافی تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت، ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی، کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی"۔

مولانائے موصوف نے جو کچھ لکھا ہے، اسکی واقعیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مسلمانوں میں جو لوگ علمی معرکوں کے علمبردار ہیں وہ وہی ہیں جو عربی تعلیم یافتہ اور انگریزی مذاق سے آشنا ہیں، محض انگریزی دانی نے آج تک کوئی صاحب قلم نہیں پیدا کیا، آئندہ کی نسبت کون رائے دے سکتا ہے،

الندوہ کے اڈیٹر علامہ شبلی اور مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی تھے لیکن کام دیکھ بھال کی خدمت سید صاحب موصوف ہی کے سپرد تھی، اس زمانہ میں علامہ شبلی کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبارات و رسائل آیا کرتے تھے، جن کو سید صاحب موصوف بالالتزام پڑھتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی، اس ذوق نے غیر شعوری طور پر ان کی اردو انشاء پردازی کو بھی متاثر کیا،

استاد کی تقلید | جنوری سنہ ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں سید صاحب نے "امام بخاری" پر ایک مقالہ تحریر کیا، اور اس کی تمہید میں لکھا کہ

صحیح بخاری کو مسلمانوں میں جو عام مقبولیت حاصل ہے، اس کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ صحت کے لحاظ سے کتاب اللہ کے بعد اس کو جگہ دی گئی، لیکن افسوس ہے کہ بہت کم لوگ اس کے نامور جامع کے حالات سے واقف ہوں گے، اس لئے اس مضمون میں ہم موصوف کے حالات جمع کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

اس میں اسلوب بیان اور طریقہ ادا وہی اختیار کیا گیا جو علامہ شبلی نے المامون اور سیرۃ النعمان میں اختیار کیا تھا، عبارت بھی صاف اور سلیس ہے،

الندوہ میں مضمون نگاری | سنہ ۱۹۰۶ء کے جون، جولائی اور اکتوبر کے الندوہ میں سید صاحب موصوف کے حسب ذیل تین مضامین اور شائع ہوئے، (۱) القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، (۲) جامع ازہر (۳) قوت باصرہ اور نور، دوسرا مضمون تو ایک مصری فاضل کے عربی مقالہ کا ترجمہ ہے، مگر یہ ترجمہ اپنی عبارت کی روانی اور سلاست کی وجہ سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، بقیہ دو مضامین کا طرز بیان متکلمانہ ہے، اس وقت تک علم کلام سے سید صاحب موصوف کو کافی دلچسپی ہو چکی تھی، اور یہ علامہ شبلی کی صحبت کا اثر تھا، چنانچہ الندوہ (نومبر ۱۹۰۴ء) میں سید صاحب خود لکھتے ہیں کہ

"علم کلام کا شوق تمام تر علامہ شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے"

امام مالک سے عقیدت | اس زمانہ میں علم حدیث سے اُن کی دلچسپی غیر معمولی طریقہ پر بڑھ رہی تھی، محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالک نے اُن کے دل پر قبضہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا امام مالک سے اُن کو بیحد گرویدگی پیدا ہو گئی، چنانچہ جنوری سنہ [illegible] کے الندوہ میں امام مالک پر ایک مقالہ لکھا، یہ مقالہ بڑھ کر ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا، سید صاحب موصوف اس کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"مجھکو علم حدیث کی ابتداے طلب سے امام موصوف اور اُن کی موطا سے بدرجۂ غایت
عقیدت رہی ہے، اسی کا اثر ہے جس نے مجھے اس غرض کے انجام پر آمادہ کیا، چنانچہ طالب علمی
کے زمانہ میں میں نے اس کا سلسلہ شروع کیا، اور جنوری ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں اس پر
ایک مضمون لکھا، فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا، ابھی
(امام مالک کی) تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا، اور اجتہادات کی بحث شروع تھی
اور جو اصل میں اس کتاب کا جوہر ہو سکتا تھا، کہ حضرۃ الاستاذ (مولانا شبلی) نے وفات
پائی، اور دم نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ کر سب سے پہلے سیرۃ نبویؐ کی تکمیل
کی جائے، اسی بنا پر جہاں تک حیات امام مالک کی مسافت طے ہو چکی تھی، قلم کا
مسافر وہیں پہنچکر رک گیا، اور اب آیندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل
معلوم ہوتی ہے، اس لئے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، اس کو وقف ناظرین کیا جاتا ہے"

حیات امام مالک

حیات امام مالک سید صاحب موصوف کی پہلی تصنیف ہے، اور جس ادھورے
اور نامکمل طریقہ پر اس کو لکھ کر شائع کیا گیا تھا، اس کا اعتراف خود سید صاحب موصوف کی
مذکورۂ بالا تحریر میں ہے، پھر بھی اکتوبر ۱۹۳۶ء کے نگار میں ایک نوخیز مضمون نگار نے اس
کتاب پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا کہ

"مجھے توقع تھی کہ .... مصنف نے واقعات و حالات پوری کاوش
سے جمع کئے ہوں گے، معلومات میں اضافہ ہوگا، لیکن ادب و انشا کی خامیاں، تحقیق
وجستجو کا فقدان، اسقام و نقائص کی فراوانی، تصحیفات و اغلاط کی کثرت دیکھکر
سخت مایوسی ہوئی"

معترض نے سید صاحب موصوف کے اسقام و نقائص اور تصحیفات و اغلاط [illegible]

کی ہے، وہ راقم کے اصل موضوع سے خارج ہے، ورنہ اس سے بھی بحث کیجاتی، کہ معترض
کے اکثر اعتراضات اپنی جگہ پر درست نہیں، معترض اس کے بھی مدعی ہیں، کہ سید صاحب موصوف
کی حیات امام مالک" میں ادب وانشاء کی خامیاں ہیں، مگر معترض کے تیس صفحہ کے مقالہ میں
کہیں ایک جگہ بھی ادب وانشاء کی خامیاں نہیں دکھائی گئی ہیں، سید صاحب موصوف کی
یہ پہلی تصنیف ہے، جو گویا اُن کی طالب علمی کے زمانہ میں لکھی گئی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں
ادب وانشاء کا وہ نمونہ موجود نہیں، جو آگے چل کر اُن کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں،
پھر اس کتاب سے اُن کی آیندہ علمی وادبی صلاحیتوں کی پوری غمازی ہوتی ہے، اس کتاب
کی خامیوں کے باوجود سنہ ۱۹۴۴ء تک اس کے کئی اڈیشن نکلے،

الندوہ کی سب اڈیٹری سید صاحب کا دار العلوم ندوہ میں سنہ ۱۹۰۶ء میں تعلیم کا آخری سال تھا،
کہ الندوہ کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، ان سے پہلے یہ خدمت مولانا ابو الکلام کے سپرد تھی،
اسی رسالہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابو الکلام کے نام کو بلند کیا، اور
اُن کی علمی شہرت بڑھی، تو اخباروں اور رسالوں سے اُن کی مانگ شروع ہوگئی، اور جب وہ
الندوہ کی سب اڈیٹری چھوڑ کر سنہ ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر میں چلے گئے، تو سید صاحب موصوف
کے کاندھوں پر الندوہ کا بوجھ رکھ دیا گیا، اسی سال سید صاحب موصوف اور ان کے ندوہ کے
فارغ التحصیل رفقاء کی دستار بندی تھی، اس کا جلسہ رفاہ عام لکھنؤ میں ہوا، سید صاحب نے اس جلسہ
میں فلسفہ جدید و قدیم پر تقریر کی، مجمع بہت بڑا تھا، اہل علم بھی شریک تھے، کسی نے اٹھ کر
سید صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو جانیں کہ مدرسہ کی تعلیم کیسی ہے،
سید صاحب نے کہا کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھکو بتایا جائے، میں اس وقت عربی زبان میں اس پر
تقریر کروں، [illegible] خواجہ غلام الثقلین بی اے، ال ال بی نے ایک موضوع دیا، اور سید صاحب

بھی زدہ ہی دیر کے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، علامہ شبلی خود اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

"تمام جلسہ محو حیرت تھا، اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفرین کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی" (مکاتیب شبلی ص ۵۰۰-۱۵۷)

علامہ شبلی نے نہایت خوشی میں اٹھ کر اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا (ندیم ستمبر ۱۹۴۰ء، حیات سلیمان)

الندوہ کے مضامین، سید صاحب موصوف نے الندوہ کی سب ایڈیٹری کی خدمت فروری ۱۹۱۰ء تک انجام دی، اور اس زمانہ میں حسب ذیل مضامین لکھے،

شمار	مضامین	سنہ
۱	علم ہیئت اور مسلمان	مئی ۱۹۰۶ء
۲	مولانا بحر العلوم	"
۳	عربی زبان کی وسعت	(جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۰۶ء)
۴	مسلمانوں کی بے تعصبی	ستمبر ۱۹۰۶ء
۵	عرب کے یورپین سیاح	"
۶	طبقات الارض	(اکتوبر ۱۹۰۶ء)
۷	برنابا کی انجیل	"
۸	لارڈ کارزن	مارچ ۱۹۰۷ء
۹	حضرت عائشہؓ	اپریل "
۱۰	تمدن اسلامی مصنفہ جرجی زیدان	(اکتوبر ۱۹۰۷ء)
۱۱	ابن خلکان و تاریخ ابن خلکان	اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء
۱۲	ایمان بالغیب	دسمبر ۱۹۰۷ء
۱۳	مکررات القرآن	(جنوری ۱۹۰۸ء)
۱۴	خاتونانِ اسلام کی شجاعت	"
۱۵	اسلام اور تمدن	(فروری سنہ)
۱۶	اسلامی رصد خانے	(مارچ و مئی سنہ)
۱۷	سدرہ و صحف انبیاء	جون "
۱۸	صحابہ کی تعداد و طبقات در وفیات	اگست "

شمار	مضامین	سنہ	شمار	مضامین	سنہ
۱۹	قیامت	ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۱	علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق	دسمبر ۱۹۱۰ء
۲۰	تحریم شراب	اکتوبر ۱۹۰۸ء			

الندوہ کے مضامین پر تبصرہ

سید صاحب کے مذکورہ بالا ابتدائی مقالات کی طویل فہرست اس لیے دی گئی ہے کہ اس سے اندازہ ہو کہ وہ اپنے استاد ہی کی طرح علمی حیثیت سے کثیر الاشواق، اور جامع الاذواق ہو رہے تھے، یہ مضامین ہیئت، علم اللسان، طبقات الارض، مذہب، تاریخ، سیر، سوانح اور عمرانیات پر مشتمل ہیں، اور ان میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہے، اور وہ یہ کہ علمائے اسلام اور پیروانِ اسلام نے دنیا کے سامنے کیا کیا چیزیں پیش کیں، آگے چل کر اسی جذبہ نے ان کو اسلامی دنیا کا ایک بہت ہی متبحر، جید اور مستند عالم بنا دیا، ان میں سے بعض مقالات اب تک شوق سے پڑھے جاتے ہیں، مثلاً مقالہ "خاتونانِ اسلام کی شجاعت" ایک علٰحدہ رسالہ کی صورت میں "خواتین اسلام کی بہادری" کے نام سے شائع ہو گیا ہے، اور اس کے متعدد اڈیشن مختلف جگہوں سے نکل چکے ہیں، "اسلامی رصد خانے" کے متعلق سید صاحب موصوف ۱۹۳۳ء میں خیام لکھتے وقت ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں کہ

"میں نے الندوہ کے ماہ تاریخ اعداد مئی ۱۹۰۹ء میں اسلامی رصد خانوں پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس سے زیادہ مکمل مضمون اس باب میں اب تک میری نظر سے نہیں گذرا"

(خیام ص ۱۲۱)

یہ مقالات جس حسن سلیقہ اور طرز نگارش سے لکھے جا رہے تھے، ان سے اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ سید صاحب موصوف آئندہ نہ صرف ایک متبحر عالم ہوں گے، بلکہ ادب و انشا میں بھی اپنے استاد کی روایت کو قائم رکھیں گے، اسی لیے بعض

خشک مضامین بھی اُن کے خاص اسلوب بیان کی وجہ سے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں،
مثلاً عربی زبان کی وسعت" کی ابتدا اس رنگین طریقہ پر کرتے ہیں،

"آغاز عالم میں جب انسان اپنی طفولیت کے منازل طے کر رہا تھا، تو دلی جذبات وخیالات کا اظہار اشاروں سے کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر مفرد الفاظ کی اعانت سے اظہار مطلب کرنے لگا، رفتہ رفتہ الفاظ میں ترکیب پیدا ہوئی، جملے بنے، ایک مصدر سے صیغوں کے مختلف برجوں سے طلوع ہونے لگا، عبارت بنی جس میں فصاحت وبلاغت کا طرہ لگا، لفظی ومعنوی صنائع اسباب آرایش بنے، اور اس طرح بیسیوں منزلیں طے کرتی ہوئی ایک خوش آواز، شیریں متمدن زبان طیار ہوئی، آج دنیا میں تقریباً کئی ہزار زبانوں کے سرسبز درخت لگے ہیں، ہر ایک کا رنگ وبو، قد وقامت، ذائقہ دوسرے سے مختلف ہے، مگر علم اللسان (فیلالوجی) کے ماہرین نے مستحکم قرائن سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام زبانیں دراصل متحد النسل ہیں، اور چند درختوں کی ڈالیاں ہیں، یہ اس وقت کا قصہ ہے کہ جب دنیا ایک مختصر سی آبادی کا نام تھا اور یہ مختصر آبادی چند خاندانوں سے عبارت تھی، یہ خاندان بڑھے، اور اس کثرت سے بڑھے، کہ وہ چھوٹی سی آبادی ان کو اپنے دامن میں پناہ نہ دے سکی، اس لئے یہ خاندان مختلف سمتوں میں پھیل گئے گو اس سے پہلے ان سب کی زبان ایک تھی، مگر اب آب وہوا ضروریات اخلاق کے اختلاف سے اس زبان میں تراش وخراش ہو کر ایسی ہیئت بدلی، کہ ایک ہی زبان کے مختلف حصوں میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئی،

(الندوہ جولائی ۱۹۰۷ء)

مقالاتِ سلیمان میں "کتب بینی کا شوق" میں ایک جگہ عربی عبارت کا ترجمہ کتنے دلنشین انداز میں کیا ہے :-

"اے میری کتابو! تم میری جلیس و انیس ہو، تمہارے ظریفانہ کلام سے نشاط اور تمہاری ناصحانہ باتوں سے تفکر پیدا ہوتا ہے، تم پچھلوں اور پہلوں کو ایک عالم میں جمع کر دیتی ہو، تمہارے منہ میں زبان نہیں، لیکن تم زندوں اور مردوں کے افسانے سناتی ہو، تم ہمسایہ ہو لیکن ظلم نہیں کرتیں، عزیز ہو لیکن غیبت نہیں کرتیں، دوست ہو لیکن مصیبت میں ساتھ نہیں چھوڑتیں"

مولانا شبلی کی تعریف | یہ سید صاحب موصوف کے قلم کی ان جولانیوں سے علامہ شبلی اندرونی طور پر برابر مسرور ہو رہے تھے، مگر لائق شاگرد پر بھی نگاہیں بھی پڑ رہی تھیں، چنانچہ الندوہ کے دسمبر میں ۱۹۰۸ء اور جنوری ۱۹۰۹ء میں سید صاحب کے دو مضامین "ایمان بالغیب" اور "مکررات القرآن" شائع ہوئے، تو مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں :-

"دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آ چلا، البتہ عبارت کی ابھی کچھ کمزوری باقی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی" (مکاتیب شبلی)

اسی مکتوب میں مولانا شبلی اپنے محبوب شاگرد کو لکھتے ہیں :-

"یہ بھی ہو کہ تم کو مصر بھیجا جائے"

درس الادب و لغاتِ جدیدہ کی تالیف | اس وقت سید صاحب موصوف ندوہ میں جدید عربی کے معلم تھے، مگر استاد کی آرزو پوری نہ ہو سکی، کیونکہ اس زمانہ کی مصری [illegible] شبلی صاحب کو مصر جانے کی اجازت نہ دی، سید صاحب [illegible]

اس لئے اس زمانہ میں اپنے استاذ کی تجویز کے مطابق دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو اب بھی بعض مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، پھر سنہ ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، اور یہ کام سید صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کیا، سنہ ۱۹۱۲ء میں ندوہ کا جب سالانہ جلاس لکھنؤ میں ہوا، تو اس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری اڈیٹر المنار کے سامنے یہ کتاب پیش کی گئی، بعد میں لغاتِ جدیدہ کے نام سے شائع ہوئی، اور یہ عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دقتوں کے حل کرنے میں اب تک بیحد معاون ہے، سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا شبلی کے قائم کردہ شعبہ سیرۃ النبی میں اُن کے لٹریری اسسٹنٹ بھی مقرر ہوئے،

الندوہ کے اور مضامین | سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک سید صاحب نے الندوہ میں جو مضامین لکھے ان میں سے بعض یہ ہیں :-

مضمون	تاریخ	مضمون	تاریخ
اشتراکیت اور اسلام	مئی ۱۹۱۱ء	مستشرقین یورپ	نومبر ۱۱ء
دنیا کا بزرگ ترین انسان	جون ”	ایک جرمن کا اسلام پر لکچر	دسمبر ”
مستشرقین یورپ	جولائی ”	کتب خانۂ اسکندریہ	”
اندھوں کی تعلیم	”	فناء مادہ	جنوری ۱۹۱۲ء
اسماء القرآن	اگست ”	عذاب	فروری ”
مستشرقین یورپ	”	مستشرقین یورپ	”
جزیہ	”	دار العلوم بیروت	مارچ ”
مصر کے مدارس	”	سید رشید رضا	”
الاحتساب فی الاسلام	ستمبر ”	طبقات ابن سعد	[illegible]

فرقۂ خفیہ   مارچ ۱۹۱۲ء

روس کے مسلمانوں کے کچھ متفرق حالات   مئی ۱۳ء

ان مضامین پر تبصرہ | ان تمام مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب موصوف شدید مذہبی پابندی کے ساتھ ایک روشن خیال عالم بننا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے پرانی مذہبی چیزوں کو زمانہ کے مذاق کے مطابق جدید رنگ میں پیش کیا، یہی وصف اُن کے اسا تذہ کے ساتھ بھی مخصوص ہے، سید صاحب موصوف کا مخاطب انگریزی دان طبقہ بھی تھا، اس لئے اُن کے مضامین میں زیادہ تر رنگ وہی ہے، جو عموماً انگریزی زبان کے اہل قلم اختیار کرتے ہیں، مضامین کی تمہید اور خاتمہ میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو جملوں کی ساخت اور ترکیبوں کی بندش بھی خالص انگریزی دان انشا پردازوں کے انداز کی ہوتی ہے، اسی لئے انگریزی داں حلقہ میں بھی ان کے مضامین شوق سے پڑھے گئے۔

الندوہ کا خاتمہ | مئی ۱۲ء میں سید صاحب موصوف الندوہ کی اڈیٹری سے علٰحدہ ہو گئے، اُن کے جانے کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہو گیا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولینا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، ندوہ کے بعض فرزندوں نے اس رسالہ کو جاری رکھنے کی کوشش کی، اور اگست ۱۶ء تک چلتا رہا، مگر اس میں وہ روح نہیں تھی جو مولانا شبلی کی اڈیٹری اور سید صاحب موصوف کی سب اڈیٹری کے زمانہ میں تھی، بالآخر ۱۶ء میں وہ بالکل بند ہو گیا، ۱۹۳۰ء میں ندوہ کے بعض پرجوش طلبہ نے اس بھولی ہوئی روداد کو پھر تازہ کرنے کی کوشش کی، اس میں بعض اچھے مضامین شائع ہوئے خصوصاً "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے ہندوستان کے تمام مشاہیر نے بہت ہی مفید اور دلچسپ مضامین لکھے لیکن اس کا معیار زیادہ بلند نہ ہو سکا، پھر ناسازگار حالات کی بنا پر اس کو بند

جلد بند کر دینا پڑا،

الندوہ کے کارنامے اس رسالے نے صرف دارالعلوم ندوہ کے مقاصد کی حسب خواہ تبلیغ کی، اور ہندوستان میں عربی تعلیم کی اہمیت مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی، بلکہ علمی حیثیت سے اس کے کارنامے بہت ہی قابل قدر اور اہم ہیں، اس میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب کی تعلیم پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے ہیں، ان مضامین سے علماء میں ایک حرکت پیدا ہوئی، اور اُن کو احساس ہوا کہ ان کا علمی دائرہ صرف منطق و فلسفہ کی درسی کتابوں کی شرحیں، حاشیے، اور تعلیقات لکھنے، یا مناظرانہ رسائل تالیف کرنے ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلام اور علوم اسلامیہ کے جدید مباحث کا ایک وسیع میدان پڑا ہے، یہ تمام مضامین جس نئے طرز نگارش اور نئے پیرایہ بیان میں لکھے گئے، وہ نوجوانوں خصوصاً نوجوان علماء کے لئے مشعل ہدایت کا کام دینے لگے، چنانچہ الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے، وہ حسب ذیل بتائے گئے ہیں،

۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا،

۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا،

۳- علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا،

۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا،

۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا،

الندوہ کے ان تمام علمی نتائج میں علامہ شبلی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے ساتھ سید صاحب [illegible] برابر کے شریک کیے جا سکتے ہیں کیونکہ الندوہ کے مضامین کا شمار کیا جائے تو [illegible] سب سے زیادہ مضامین انہی کے نکلیں گے بعض پرچے تو شروع سے آخر تک انہی کی تحریروں [illegible]

(باقی)

ملا ناظم ہروی

از۔ ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری، ڈی۔ لٹ، استاد فارسی ٹی ان بی کالج بھاگلپور

ایران کا صفوی خاندان اپنی علمی و ادبی سرپرستی کے لیے مشہور رہا ہے، اس خانوادہ کے تین حکمران شاہ عباس اعظم، شاہ صفی، اور عباس ثانی اور اسمٰعیل شاہ طہماسپ بڑے ہی صاحبِ علم، سخن سنج اور سخن شناس گزرے ہیں، اس دور کے شعرا کی تعداد کافی ہے، انہی میں صائب، وحشی، کلیم، عرفی، ہاتف، فصیحی، والہ ہروی اور مرزا جلال اسیر جیسے جلیل القدر شعرا تھے، ان میں سے کچھ شعرا ہندوستان آئے، اور یہیں زندگی بسر کی اور ان سے سبک ہندی منسوب ہوا، سبک ہندی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے، کہ اس میں زیادہ تر مشکل آفرینی اور پیچ در پیچ عبارتیں ہیں، لیکن یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح نہیں، اس سبک میں معنا مین کی دلکشی کے ساتھ نکتہ رسی، باریک بینی اور دقت لفظی کی اچھی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

ناظم ہروی کا تعلق اسی دور سے یعنی گیارہویں صدی کے دور اول سے اس کے تقریباً اواخر (سنہ [illegible] تک) ہے، یہ زمانہ صفوی حکومت کا عہد زریں کہلائے جانے کا مستحق ہے، ناظم ہروی کا تعلق تو صفوی دربار سے نہیں رہا، لیکن وہ عباس قلی خان شاملو کے دربار سے

منسلک تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کا بیگلر بیگ تھا، سرو آزاد میں ہے،
وہ حسن خان شاملو کا بیٹا تھا، جو خراسان کا گورنر رہا۔ فارسی شاعری کا دلدادہ اور
خود بھی ایک اچھا شاعر تھا، طاہر نصرآبادی نے اپنے نسخہ میں لکھا ہے کہ اس نے تین
ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا ہے، مرزا فصیحی جیسا شاعر بھی شروع میں اسی کے دربار
سے وابستہ رہا، اور اس کا مصاحب خاص رہا لیکن بعد میں شاہ عباس اعظم کے
دربار کا شاعر منتخب ہوا، اور اس سے کئی بار بیش بہا انعامات حاصل کیے، ناظم ہروی
کو بھی حسن خان شاملو کی سرپرستی حاصل رہی، ناظم کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوا
کہ اس نے حسن خان شاملو کی شان میں قصیدے کہے، بہت سی غزلیں اور قطعے بھی اسکی
تعریف میں کہے، مجمع النفائس، مخزن الغرائب، خلاصۃ الکلام اور نشتر عشق میں ہے کہ وہ
مرزا فصیحی کا شاگرد تھا، جو شاملو خان کے دربار سے وابستہ رہا، اس لیے بظاہر معلوم
ہوتا ہے، کہ اپنے استاذ ہی کی وساطت سے حسن خان شاملو کے دربار میں رسائی ہوئی ہوگی
یا جب وہ بیٹے کے دربار سے منسلک تھا، تو باپ کے دربار میں پہونچنا کوئی مشکل کام
نہ تھا۔ مجمع الفصحاء میں ہے کہ وہ حسن خان شاملو کا مداح رہا ہے۔

مداح حسن خان شاملو حاکم خراسان بود، از جانب یکے از شاہان صفوی
اکثر مقاطع غزلہا بلکہ اکثر غزلیات در تعاریف خان مسطور است"[1]

سرو آزاد میں ہے،

در خدمت عباس قلی خان ولد حسن خان شاملو اعتبار عظیم داشت بہمت
بفیض رسائی سروم می گذاشت، (ص ۱۰۵)

---

[1] مجمع الفصحاء ص ۴۰۴ دیوان ناظم ہروی قلمی غزل ص ۳۵۴

لیکن وہ باضابطہ طور پر عباس قلی خان شاملو کے دربار کا شاعر تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کا بیگلر بیگ تھا۔

اور ولدیت | بیشتر تذکرہ نگاروں نے ناظم ہروی کا ذکر ملا ناظم ہروی کے نام سے کیا ہے، طاہر نصرآبادی جو ناظم کا ہمعصر ہے اپنے تذکرہ میں اسے ملا ناظم ہراتی کے نام سے یاد کرتا ہے[1] مخزن الغرائب کے مولف احمد علی ہاشمی نے "ملا فرخ حسین" کے نام سے اسکا ذکر کیا ہے، لیکن اس نام کی تصدیق کسی دوسرے تذکرہ سے نہیں ہوتی، اصل یہ ہے اس کا نام علی رضا تھا، اور یہ خود ناظم کے ان اشعار سے ظاہر ہے[2]

در آغاز فطرت در آوان مبدا　　علی بود نامم رضا بود کارم
چو گشتم ملقب بہ ناظم یقین شد　　کہ ذرہ در ملک نظم اختیارم

علی رضا ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے والد کا نام شاہ رضا سبزواری تھا، برٹش میوزیم کیٹلاگ[3] اور خدابخش لائبریری کے انگریزی کیٹلاگ[4] دونوں میں درج ہے، کہ وہ شاہ رضا سبزواری کا بیٹا تھا، اس لیے باپ کے نام کی مناسبت سے علی رضا نام ہونا عین قرین قیاس ہے، البتہ ناظم تخلص کی شہرت و مقبولیت نے نظروں پر اصل نام کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا۔

تاریخ و جائے پیدائش | ناظم کی تاریخ پیدائش کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا، خود شاعر نے اپنے دیوان میں اسکی طرف اشارہ نہیں کیا، لیکن برٹش میوزیم کے کیٹلاگ جلد سوم میں قصص الخاقانی کے مولف کا قول ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ۱۰۷۵ھ میں ناظم کی عمر ۰۰ سے زائد تھی[5]۔ اس قول کے

---

[1] تذکرہ طاہر نصرآبادی ص ۲۴۰ [2] دیوان ناظم قلمی قصیدہ ۵ [3] برٹش میوزیم کیٹلاگ ج ۲ ص ۷۰۳ [4] انگریزی کیٹلاگ خدابخش لائبریری، [5] برٹش میوزیم کیٹلاگ ج ۳ ص ۱۰۹۲

مطابق اگر اس کی عمر ۶۰ سال سے اوپر یعنی ۶۰ اور ۶۵ سال کے درمیان تسلیم کر لی تو اس حساب سے اس کا سنہ پیدائش ۱۰۱۱ھ سے ۱۰۱۶ھ کے درمیان ہو ہے، جائے پیدائش خراسان کا علاقہ ہرات ہے، جو ان دنوں حکومت افغانستان ماتحت ہے، ناظم نے اپنے دیوان میں جابجا اشارہ بھی کیا ہے کہ اس کا مولد و وطن ہے، اپنے ایک شعر میں خراسان سے اپنی نسبت کا یوں اظہار کرتا ہے،

طالب از آمل و ناظم ز خراسان برخا　　بو دیوان فصاحت بد و مصرعہ محتاج

طاہر نصر آبادی نے لکھا ہے کہ وہ ہراتی ہے اور ہرات میں یکتا ہے،

ہراتیست و در آں ولایت وحید است[۲]

اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں وہ حسن خان شاملو سے ہرات و خراسان کی استدعا ذیل کے اشعار میں کرتا ہے۔

بدوران چنیں فرخندہ شاہی　　کہ عشرت داشت ہر سو ہر نگاہی[۳]

ہرات کامرانی را نگہدار　　خراسان بزرگی را نگہدار

شاعرانہ تعلی میں خراسان کو اپنے وجود کی بنا پر "گنجینۂ انفاس مسیحا" کہتا ہے

وطن از من شدہ گنجینۂ انفاس مسیحا[۴]

ابتدائی تعلیم اور استاد | ناظم کی ابتدائی تعلیم کی بابت بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں یہی ہے کہ ہرات ہی میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ مجمع النفائس[۵]، مخزن خلاصۃ الکلام اور نشتر عشق کے مولفین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ فن شاعری استاد ہرات کا مشہور شاعر اور خراسان کے گورنر کا درباری شاعر مرزا فصیحی

[۱] دیوان ناظم قلمی [۲] تذکرہ طاہر نصر آبادی [۳] مثنوی یوسف زلیخا قلمی دیباچہ میں لکھتا دیوان ناظم قلمی قصیدا [۴] [۵] مجمع النفائس قلمی ص ۴۰۰ [۶] مخزن الغرائب قلمی ص ۹۲۵

ناظم کو اپنے استاد سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ ایک شعر میں وہ فصیحی سے جدا ہونے پر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے:۔

جام دیدار فصیحی داشت ناظم نشہ ای کز و لم ہجران چند ی سالہ را آوارہ کرد[1]

یہ فصیحی ہروی وہی ہے، جس کے تین مشہور شاگرد والہ ہروی، جلال اسیر، ناظم ہروی ہوئے، عجیب اتفاق کہ یہ تینوں ایران سے ہندوستان آئے، خود فصیحی کو ہندوستان آنے کی آرزو تھی، مگر یہ آرزو تشنہ رہی، البتہ اس نے اپنا دیوان نقل کر کے آگرہ بھیج دیا۔[2]

عباس قلی خان شاملو اور ناظم | ناظم اور اس کی ادبی خدمات کا حقیقی قدر داں عباس قلی خان شاملو تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کے مستقل بیگلر بیگ تھا، ناظم نے اگرچہ حسن خان شاملو گورنر خراسان کی تعریف میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن ان کی نوعیت اور حیثیت اضافی ہی ہے، اصلاً وہ عباس شاملو کا شاعر تھا، اسپرنگر اپنے کیٹلاگ میں لکھتا ہے کہ ناظم عباس قلی خاں شاملو کا درباری اور خراسان کا بہترین شاعر تھا[3] برٹش میوزیم کیٹلاگ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ناظم کی ساری زندگی خان مذکور کے دربار میں گذری[4]، خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگ کے مطابق ناظم، عباس قلی خان کا درباری شاعر اور عزیز ترین مصاحب تھا، اپنے ممدوح کی فرمائش پر مثنوی "یوسف و زلیخا" لکھی[5]۔ طاہر نصر آبادی اور والہ داغستانی نے ان دونوں کے تعلقات پر خاصی روشنی ڈالی ہے، تذکرہ نصر آبادی میں ہے،

۱؎ دیوان ناظم قلمی ۔ ۲؎ مجمع النفائس قلمی ص ۵۰۴ ۳؎ اسپرنگر کیٹلاگ ص ۴۰ ۴؎ برٹش میوزیم کیٹلاگ ص [illegible] ۵؎ کیٹلاگ نمبر [illegible]

"در خدمت عالی جاہ عباس قلی خان اعتبار عظیم داشت، چنانچہ در یوسف و زلیخا مدح مشارٌ الیہ در نہایت قدرت کردہ"

والہ داغستانی رقمطراز ہے،

"در خدمت عباس قلی خان شاملو کہ در زمان شاہ سلیمان مغفور بیگلر بیگی باستقلال ہرات بود، بسر بردہ خان مزبور مراعات نسبت بوے می فرمود و مثنوی یوسف و زلیخا را بفرمودۂ این خان والاشان گفتہ داد سخنوری دراں دادہ در مدت چہاردہ سال باتمام رسانیدہ است"[1]

مثنوی یوسف وزلیخا | ناظم ہروی کی یہ مثنوی فارسی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہے، یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ۱۴ سال کی مدت میں اس مثنوی کی تکمیل ہوئی، مولف خلاصۃ الکلام نے لکھا ہے کہ چودہ سال میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا،

"و در مدت چہاردہ سال باہتمام رسانیدہ"[2]

نشترعشق نے مدت تحریر کے ساتھ سنہ اختتام بھی ذکر کیا ہے ۔

"... در عرصۂ چہاردہ سال سنہ یک ہزار و ہفتاد و دو باتمام رسانیدہ"[3]

ید بیضا کے مولف کا بھی یہی خیال ہے ۔

"و اتمام آن کتاب در سنہ اثنین و سبعین و الف اتفاق افتادہ"[4]

خود ناظم کے قول کے مطابق اس مثنوی کی تاریخ آغاز و انجام اس طرح ہے،

ز ہجرت دہ ہزار و پنجہ و ہشت ۔ ز مولودش سخن خوش دو و ماں شد

نگارش زاں درین فرصت فروغست ۔ کہ سال چاردہ سن بلوغست

---

[1] ریاض الشعراء ص ۴۰۰ [2] خلاصۃ الکلام قلمی [3] نشترعشق قلمی ص ۱۸۱۰ [4] ید بیضا قلمی ص ۲۳۲

مثنوی میں ایک باب عباس علی خان شاملو کی مدح میں ہے، جس میں ناظم اپنی محبت و غایت تعلق کے اظہار کے بعد بڑے دلچسپ انداز میں مثنوی کی وجہ تالیف بیان کرتا ہے

بہ بخت شاملو عباس خانست — کہ چوں دولت مقدس ذودمانست

نمی ترسم بگویم ہرچہ باشد — کم از شاہست و بیش از ہرچہ باشد

آگے کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے بادۂ سخن سے سرشار پایا تو نگاہیں اٹھائیں اور کہا اے میرے مداح تیرے اشعار نہایت درخشندہ ہیں، غزل میں تیرا جواب نہیں، تیرے قصائد بزم احباب کے لیے شمع وفا اور تو اقلیم سخن کا بادشاہ ہے، پھر کیا وجہ کہ مثنوی میں تیرا طائر فکر آمادۂ پرواز نہیں۔

چرا در مثنوی فکرت رسا نیست — نمی دانم چرا نا شد چرا نیست

تو سلطنت کی طرح شب و روز میرے ہمراہ ہے، صرف سلطنت کا ہمدم ہی نہیں بہی خواہ بھی ہے، پھر (اس صنف میں) تیرا بے ترنم رہنا زیب نہیں دیتا تو ایسا نہ کر کہ تیرا پھول غنچہ ہی رہے، نشہ شراب خمخانہ میں قید رہے،

چو دولت روز و شب ہمراہ باشی — نہ دولت دوست دولت خواہ باشی

نخواہیش کہ باشی بے ترنم — گلت در غنچہ باشد بادہ در خم

جب سارے اسباب مہیا ہیں، ستم ہے کہ ایسے میں تیرا ہنر جوہر نہ دکھائے ہیں دشواری کی صورت میں تیرے لیے خزانے کے در وا کر دوں گا، یہ باتیں سن کر ناظم پھول کی طرح کھل اٹھا، نشہ شراب کی طرح جوش میں آیا اور کہا۔

بحالت صیغہ غنائی توان بکرد — تو کی چون کہ اذفرمان می توان کرد

لیکن ساتھ ہی یہ عذر بھی پیش کیا کہ یہ قصہ تو پہلے ہی نظم ہو چکا ہے، قصہ پارینہ کی

بازخوانی سے کیا حاصل ہو اس پر شاملو نے کہا دنیا کے تمام راستے پیش پا و پامال ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان راہوں پر چلنا ہی چھوڑ دیا جائے، یہ سننے کے بعد ناظم تیار ہو گیا

کمر بستم بتحصیل رضائیش زبان دادم بترتیب دعائیش

الٰہی تا ز یوسف و زلیخا کنند آرایش معنی دانشا

بمصر بخت فرمانش رواں باد کہ فرمانم باین نظم بدواں داد

ہندوستان میں ناظم کی آمد | بیشتر تذکرہ نگار حضرات اس کی ہندوستان کی آمد کے بارے میں خاموش ہیں لیکن مخزن الغرائب کے مولف نے بہ صراحت عہد شاہجہانی میں اس کی آمد کا ذکر کیا ہے، شاہجہان کے آخری دور میں وہ ہندوستان آیا اور شاہزادہ شجاع سے وابستہ ہو گیا لیکن شجاع کی ہزیمت و زوال کے بعد وہ جہانگیر نگر معروف ڈھاکہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گیا۔

"در آخر عہد شاہجہان بہند آمدہ بملازمت شاہزادہ شجاع بسر می برد بعد مفقود شدن شاہزادہ مذکور، در جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ کہ از ولایت بنگالہ است رحل اقامت انداخت و بتدریس مشغول گشتہ بود"[1]

ناظم کے دیوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان آنے کی خواہش اسے عرصہ سے تھی وہ ہرات کے لوگوں اور ان کی ناقدری سے دل برداشتہ ہو چکا تھا، شیراز کے راستہ سے وہ ہندوستان روانہ ہوا۔

چنان مشتاق بال افشانی ہندم کہ در ایں اگر از زلف خوباں دام بگشاید آزادم

صدف وا چشم بر راہ ہند ہر سو نیستم نزدیک اگر چون قطرۂ نیساں ز چشم ابر افتادم

چناں دلگیرم از بیقدری آن وطن ناظم کہ ہنگام وداع غم فزای دشمنان شادم

۱؎ مخزن الغرائب [illegible] ۱۰۰

ناظم کا زمانۂ پیری عمر کے آخری حصے کے بارے میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں، البتہ اس کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ عزلت وخمول کی نذر ہوا، وہ خود گمنام رہنا زیادہ پسند کرتا تھا، شہرت ونام ونمود سے وحشت سی ہو گئی تھی، عنقا کی طرح معدوم ہونے کی تمنا تھی۔

ناظم از بس مست ذوق گوشہ گیری گشتہ ام　　ہردم از خود تا بجلوہ گاہ عنقائی روم[۱]

زمانۂ پیری اپنے ساتھ ضعف، لاغری اور اعصاب شکستگی ساتھ لایا تھا، اس کا خیال تھا کہ جس طرح بوسیدہ کپڑا رفو قبول نہیں کرتا، اسی طرح بوسیدہ وکہنہ بدن بھی دوا اور علاج کے لائق نہیں رہتا۔

مخمورم وسوی بادہ نتوانم رفت　　مشتاقم و راہ ارادہ نتوانم رفت

پیری و ضعیفی چنان کرد وسوار　　کز خاطر کس پیادہ نتوانم رفت[۲]

فکر دوا کم نکند ضعف بدن را　　بسیار مزن بخیہ قبا کہنہ تن را[۳]

عمر کے اس دور میں نہ خواہشیں رہ گئی تھیں، نہ ہی تلخ وشیریں کا احساس، اب سلیمان کی سروسامانی نہیں چیونٹی کی قناعت مدنظر تھی۔

پری از ما بر رنگ خواہش دیدہ ہوس　　تلخی از ما رفتہ چوں گل در شکر افتادہ ایم[۴]

ہمین از ضعیفی بسا ما غرور　　اگر مور گردی سلیمان مباش[۵]

اسی ضعف وکمزوری کے عالم میں ناظم ۱۰۸۱ھ میں اس عالم سے چل بسا، مخزن الغرائب کے مطابق عاشورہ کے روز فجر کی نماز میں سجدہ کی حالت میں اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

مرزا محمد طاہر نصرآبادی کو ناظم ہروی کے حسب ذیل اشعار زیادہ پسند آئے تھے۔

---

۱ دیوان ناظم قلمی　۲ ایضاً　۳ ایضاً　۴ ایضاً　۵ ایضاً

اسی لیے انھوں نے اپنے تذکرہ میں انھیں نقل کیا ہے[1]

دلم از لعل تو جز حرف جفا نشنیداست   از گل عمر کسی بوی وفا نشنیداست
ناظم من ہر کہ بر حرف تو آید بزبان   زانکہ معنی کسی از لفظ جدا نشنیداست

نامی از خویش در جہان بگذار   زندگانی برای مردن نیست

منکر کے از مرید شدن پیر میشود   چوبی کہ از کمان بجہد تیر میشود
باشد کمال مردم بیمغز در زوال   نی را چو سوختند طباشیر میشود
بلبل آرزو کہ شد بیضہ شکن دل بستم   کہ مکافات ز آہن قفسی می سازد
گر مرا امروز ساماں داد گردوں مفت اوست   بسکہ محتاجم ہمیشہ بے نیاز قانع میشوم
از غلط بخشی ابنای زمان نیست عجب (میآید)   گز گہر آب ستانند و بدریا بخشند
گر خدا را از برای رزق طاعت میکنی   خانہ میسازی و بر بام مش زراعت میکنی
آسماں گر دو تو گر دو گر توانی راست شد   شاہد این گفتگو انگشت در انگشتری است
از لطافت بسکہ روحانی سرشت افتادہ است   گیرمش گر در بغل پندارم آغوشم تہی است
دست از کرم بعذر تنک مایگی مشوی   برگی در آب کشتی صد مور میشود
گردن رغبت مکش بر افسر زرین کلاہ   این گل آتش کہ بر سر زد کہ سرتاپا نسوخت

اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کے کلام کی داد دی ہے، محمد افضل سرخوش نے لکھا ہے،

"استاد خوش خیال و صاحب زبان بودہ، مثنوی یوسف و زلیخا بالاً ئے

---

[1] تذکرہ طاہر نصرآبادی۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱

بیقراری عضو عضوم را بکام دل رسانید — زخم تیغت بر تنم چون ماہ نو سیارہ شد

بسکہ از بے اعتباریہای خود شرمندہ ام — آنچنان سوی تو می آیم کہ گویا می روم

مخزن الغرائب میں احمد علی سندیلوی نے اسکے بارہ میں "فاضل کامل بود" لکھ کر خراج تحسین پیش کیا ہے، اور اس کے کلام کا ایک طویل انتخاب پیش کیا ہے جس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

بیا ساقی و رنگین کن بساط محفل ما را — بیک پیمانہ خون ساغر بدست آور دل ما را

ز روی درد میگرند مجروحان دمی رسم — کز آب تیغ شوید زخم دست قاتل ما را

ہیچکس را بر تو حکمی نیست ناظم را بسوز — وعدہ یا د کردن و جای دگر بودن چرا

اینقدر ای لیلی دنیا چہ مینازی بخویش — وای گر دیوانہ میبود و صحرای ترا

دل آئینۂ حسن ترکان نست — بر جا کجا عکس پیکان نست

خم شوق خمخانۂ بیخودی — کمر بستۂ شوق فرمان نست

شفاعت چہ در حسن طاعت کدام — امید خلائق ز احسان نست

نداری لباس تصور دلے — دو عالم سری در گریبان نست

کافیست خرقۂ ز لباس جہان مرا — آنہم برای سر گریبان کشیدن ست

بیکار نمی توان نشستن — دل چاک زنم چو پیرہن نیست

گر دست عرق ز شرم رویت — بر چہرہ بوستان سمن نیست

حق بر طرف تست کہ جو باے بہارے — بوئے گل چاک بگریبان زسیاست

ای اجل چندین مکن تعجیل ماہم عاقبت — مشت خاکی در گریبان کفن خواہم کرد

بشمعی نامہ از درد دل خود کردام انشا — کہ مکتوب عزیزان را بہر دانہ میدانند

ہر کسی را کشندہ ای باشد — شعر ناظم قاتل شعر است

جمہوریہ جزائرِ فلپائن

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے (علیگ)

(۲)

فلپائنی مسلمانوں کا مسئلہ فلپائن میں اسلام کے داخلہ کا قدیم ترین ثبوت ۱۳۸۰ء میں ملتا ہے، جب ایک مشہور عرب عالم اور قاضی جن کا نام مقدم بتایا جاتا ہے، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں پہلی بار ان جزائر میں پہونچے، اور ملکا کے والی سلطان محمد شاہ کو مشرف باسلام کیا، مقدم کی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں فلپائن کے متعدد جزیرے آفتاب اسلام کی شعاعوں سے منور ہوگئے، پھر اس کے بعد وہاں تجارت و تبلیغ کی راہ سے مسلمانوں کی آمد اور دائرہ اسلام کی وسعت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ سولو، باسائین، اخینداناؤ، پالوان اور منڈانا وغیرہ تمام جزائر مسلمانوں کی صدائے تکبیر سے گونج اٹھے، اور رفتہ رفتہ فلپائن کے ایک وسیع و عریض علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا،

سولہویں صدی کے ربع اول میں جب اسپین نے فلپائن میں اپنے اقتدار کی بساط بچھائی تو وہاں ماجنداناؤ، اور سولو دو بڑی بڑی اسلامی ریاستیں موجود تھیں، جو اسپینی تسلط سے محفوظ رہیں، اُن کے علاوہ منڈناؤ، بیانے، پالاوان، وغیرہ کے علاقوں میں بھی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں، چونکہ یہاں کے مسلمان امریکہ اور اسپین کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہے

اس لئے اُن کی تعداد اور علاقے برابر سمٹتے گئے، اور اب صرف جنوبی فلپائن میں جزائر تاوی تاوی، سولو، باسیلان، ماجندانا ؤ، اور لاناؤ ڈی سور میں مسلمان غیر معمولی اکثریت میں ہیں، ان جزائر میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۵۵ لاکھ بیان کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے باشندوں کے اعتبار سے یہ آبادی دس فیصد سے زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اقتدار ان سے ہمہ وقت خوف محسوس کرتا رہتا ہے، اسی باعث جنوبی فلپائن میں مسلمان متعصب عیسائیوں کے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں،

یوں تو فلپائن میں مسلمانوں پر ظلم کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا لیکن ستمبر ۱۹۷۲ء میں جب سے صدر مارکوس نے مارشل لا نافذ کیا ہے، صورت حال بے حد سنگین ہوگئی ہے، پورے جنوبی فلپائن میں خوف و دہشت کی فضا طاری ہے، چاروں جنوبی جزیروں میں تکریالا وا کو صدر مارکوس نے جبراً مسلمانوں سے خالی کرا کے غیر مسلم خطہ بنا دیا ہے، عیسائیوں کو ترغیبی لالچ دے کر شمالی حصے سے جنوب میں سولو، کوتا باتو، تاوی تاوی، اور زمبوانگا، وغیرہ کی بارہ ہزار چھ سو مربع کیلو میٹر کی زرخیز اور معدنی ذخائر سے مالا مال زمین میں منتقل کیا جا رہا ہے،

مارچ اپریل ۱۹۷۳ء میں حکومت نے جزیرہ لاناؤ ڈیل سور کے متعدد شہروں میں فوجی یلغار کر دی، جس کے نتیجہ میں بکثرت غریب کسان اور مچھیرے قتل و زخمی ہوئے، اس حملہ میں لاکھوں پیسہ کے مالی نقصان کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں مسجدیں، مکانات، اسکول، اور دکانیں وغیرہ تباہ کر دی گئیں، اور اس طرح حکومت کے لئے جنوبی خطہ میں عیسائیت کے فروغ کی مزید راہ ہموار ہوگئی،

اس منظم ظلم و بربریت کا مقابلہ کرنے کے لئے جنوبی فلپائن کے مسلمانوں نے "مورو قومی آزادی محاذ" (MNLF) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا بنیادی مقصد [illegible]

حشیانہ مظالم کا مقابلہ اور جنوبی فلپائن میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ایک خود مختار حکومت بانگسا مورو" (Bangsa Moro) کے قیام کا مطالبہ ہے، چنانچہ اس محاذ اور حکومت فلپائن کے درمیان کئی برس سے شدید ترین جنگ ہوتی رہی جس میں ۱۵ ہزار عام شہری مسلمان اور تین ہزار بانگسا مورو فوج کے جوانوں نے جام شہادت نوش کیا، ان معرکوں میں فلپائنی فوجوں کے ہاتھ سے بے حد مظالم ہوئے، بکثرت عبادتگاہیں، بستیاں، قبرستان، مویشی برباد ہوئے، اور گاؤں کے گاؤں تہس نہس ہو گئے، کہا جاتا ہے، کہ دوسری عالمی جنگ میں بھی فلپائن میں اتنی تباہی نہیں ہوئی تھی، ۱۰ / مارچ ۱۹۷۸ء کو ایک مقام کوری ہیدور میں عیسائیوں نے ۶۴ مسلم نوجوانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، مسلمانوں کے دو لاکھ مکانات اور ۲۸۵ مسجدیں مسمار کر دی گئیں، اس خونناک خانہ جنگی میں بیس لاکھ مسلمانوں کو بے گھر اور ایک لاکھ کو جلاوطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا،

معاہدۂ طرابلس | مورو قومی آزادی محاذ کی بغاوت اور فلپائنی افواج کی بربریت کو روکنے کے لئے بنغازی، جدہ، کوالالمپور، استنبول اور طرابلس میں متعدد اسلامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ سے مذاکرات کر کے جنوبی فلپائن کے مسلمانوں کے مسائل کا پرامن و پائدار سیاسی حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، جدہ کانفرنس میں مورو قومی آزادی محاذ نے مصالحت کا حسب ذیل چار نکاتی فارمولا پیش کیا تھا

۱۔ حکومت فلپائن بانگسا مورو عوام کے مضبوط اتحاد اور جزائر منڈاناؤ، باسیلان، سولو، اور پالاوان میں بنگسا مورو وطن کی قومی یکجہتی کو تسلیم کرلے،

۲۔ حکومت فلپائن، منڈاناؤ، باسیلان، سولو اور پالاوان پر مشتمل بنگسا مورو وطن

کی مکمل خود مختار فرمانروائی کو تسلیم کرے،

۳۔ حکومت فلپائن اپنے ملکی ڈھانچہ (Framework) کے اندر منڈاناؤ، سولو، باسیلان اور پالوان کی سیاسی خود مختاری کو تسلیم کرے،

۴۔ حکومت فلپائن تسلیم کرے کہ مجوزہ خود مختار خطہ کا خارجی دفاع مرکزی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوگی، جب کہ اندرونی امن وسلامتی کا قیام خود مختار حکومت بنگسا مورو کے فرائض میں شامل ہوگا،

اس کے بعد لیبیا، سعودی عرب، جمہوریہ سینیگال اور صومالیہ کے نمایندوں پر مشتمل ایک چار فریقی وزارتی کمیشن قائم ہوا، جس نے جنوبی فلپائن کے مسئلہ کو حل کرنے اور حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ کے درمیان مصالحت کرانے میں بہت نمایاں اور سرگرم کردار ادا کیا، بالآخر یہ مساعی بار آور ہوئیں، اور ۱۵ سے ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء تک طرابلس (لیبیا) میں ڈاکٹر علی عبدالسلام الترکی (وزیر خارجہ حکومت لیبیا) کی صدارت میں فریقین کے درمیان امن مذاکرات کا ایک اہم دور ہوا، جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر آٹھ روز تک غور وفکر کرنے کے بعد اتفاق رائے کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا، ذیل میں ہم اس کی اہم دفعات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں،

۱۔ جمہوریہ فلپائن کی وحدت واستحکام کے دائرے میں رہ کر جنوبی حصہ میں ایک خود مختار مسلم ریاست کا قیام،

۲۔ یہ خود مختار مسلم خطہ درج ذیل جزائر اور صوبوں سے تشکیل پائے گا،:-
باسیلان، سولو، تاوی تاوی، زمبوانگا دیل سور، زمبوانگا دیل نورتی، ماگنداناؤ، سلطان کودارات، نورث کوٹاباٹو، لاناؤ [illegible] [illegible]

کوتاباتی، لاناؤ دی سور، پالاوان، اور وہ تمام گاؤں اور شہر جو مذکورہ علاقوں میں واقع ہیں،

۳۔ خارجہ پالیسی مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہوگی،

۴۔ اس مجوزہ خود مختار مسلم ریاست میں مسلمانوں کو اپنی مخصوص عدالتیں قائم کرنے کا حق ہوگا، جن میں قانون اسلامی کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے، مسلمانوں کو تمام عدالتوں میں بشمول سپریم کورٹ مناسب نمائندگی دی جائے گی،

۵۔ جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کو اپنے اسکول کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنیکا حق حاصل ہوگا،

۶۔ مسلمان خود اپنا نظام حکومت اختیار کرسکیں گے،

۷۔ جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کا خود اپنا مخصوص مالی اور اقتصادی نظام ہوگا،

۸۔ معدنیات مرکزی حکومت کے لئے مخصوص ہوں گے، البتہ وہ معدنی اشیاء اور ان کی آمدنی کا ایک معقول حصہ خود مختار مسلم حکومت کے لئے مقرر کردے گی،

۹۔ اس معاہدہ پر دستخط کے فوراً بعد جنگ بندی کا اعلان کردیا جائیگا، جنگ بندی کے نفاذ کی نگرانی کے لئے حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کی جائے،

۱۰۔ مذکورہ کمیٹی کے سپرد درج ذیل امور کی نگرانی کا کام بھی ہوگا:-

تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی، تمام پناہ گزینوں کی واپسی جنہوں نے جنوبی فلپائن میں اپنے گھر بار کو چھوڑ دیا تھا، نقل وحرکت اور جلسے جلوس کی مکمل آزادی،

۱۱۔ جنوبی فلپائن میں خود مختار مسلم حکومت کے قیام سے متعلق آخری معاہدہ پر حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ اور موتمر اسلامی کے درمیان دستخط جمہوریہ فلپائن

کے شہر منیلا میں ہوں گے،

۱۲۔ منیلا میں معاہدہ پر دستخط کے مطابق خود مختار خطہ میں ایک عارضی حکومت قائم ہو جائے گی، یہ عارضی حکومت (Adhock Govt) اس وقت تک کام کرتی رہے گی جب تک کہ باضابطہ منتخب شدہ اسمبلی کی حکومت تشکیل نہیں ہو پائی

اس معاہدہ کا مکمل متن بہت طویل ہے، جو امپیکٹ (لندن) اخبار، العالم الاسلامی (سعودی عرب) اور دوسرے اہم اخباروں میں شائع ہوا ہے، اس پر حکومت فلپائن کی جانب سے وزارت دفاع کے انڈر سکریٹری کارمیلوس باربیرا اور مورو قومی آزادی محاذ کی طرف سے اس کے صدر نور سوارسی نے دستخط کئے ہیں،

جنوبی فلپائن کی اس مجوزہ خود مختار مسلم ریاست "بنگ مورو" کا بری رقبہ ۶۷ ہزار سات سو اکیس مربع کیلومیٹر ہے، اس کے باشندوں کی تعداد ستر لاکھ ہے، جن میں سے ۵۵ لاکھ مسلمان اور باقی عیسائی اور بت پرست وغیرہ ہیں، شہر زمبوانگا اس مجوزہ نئی اسلامی مملکت کا متوقع دارالسلطنت ہے،

معاہدۂ طرابلس پر عملدرآمد کے سلسلہ میں صدر مارکوس کا رویہ	لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں تک حوصلہ افزا اقدامات ہو جانے کے باوجود کیا مورو ہوم لینڈ کا قیام واقعی شرمندۂ تکمیل ہو سکے گا؟

اس بارے میں ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ صدر مارکوس کے بیانات اور اقدامات میں زبردست تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف وہ عالمی برادری خصوصاً اسلامی ممالک سے تحسین وستائش حاصل کرنے کے لئے جنوبی فلپائن کو خود مختاری دینے کو تیار معلوم ہوتے ہیں، دوسری طرف ان کے عملی اقدامات واضح طور پر ان کے قیام امن کے ارادوں کو مشتبہ بناتے ہیں، پہلے تو صدر مارکوس نے مجوزہ خود مختار خطہ میں شامل

علاقوں میں یہ استصواب رائے کرانے کا شوشہ چھوڑ دیا، کہ یہ صوبے خود کو مجوزہ حکومت خود مختار میں ملانا پسند کرتے ہیں، ؟؟ لیکن اس ریفرنڈم کے لئے پہلے تو بار بار تاریخیں ملتوی ہوتی رہیں، پھر جب ۲۲ اپریل ۷۷ء کو بالآخر یہ رائے شماری عمل میں آئی تو کہا گیا کہ رائے دہندگان نے اپنے صوبوں کے خود مختار مسلم خطہ میں انضمام کے خلاف ووٹ دیا ہے، مورو قومی آزادی محاذ نے اس ریفرنڈم کی تجویز کو پہلے ہی مسترد کر دیا تھا، کیونکہ وہ اس نام نہاد استصواب رائے کی حقیقت اور اس کے متوقع نتیجہ سے بخوبی واقف تھے،

درحقیقت صدر مارکوس قیام امن اور معاہدۂ طرابلس کی تکمیل کیلئے سنجیدہ اور مخلص نہیں معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ مورو قومی آزادی محاذ نے اپنے رویہ میں غیر معمولی لچک کا ثبوت دیا ہے، وہ اسلامی کانفرنس کے ایماء پر نہ صرف آزادی کامل کے مطالبہ سے دستبردار ہو گیا، بلکہ سیاسی خود مختاری کے مطالبہ میں بھی کافی کمی کر دی ہے،

صدر مارکوس کے ارادوں کے بارے میں شکوک وشبہات کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے، کہ ان کی اہلیہ مسز امیلڈا مارکوس نے (جنھوں نے معاہدۂ طرابلس میں ایک اہم رول ادا کیا تھا) جب میثاق طرابلس کو تعطل پر جاتے دیکھا، تو وہ بعجلت تمام کرنل قذافی سے صلاح ومشورہ کرنے کے لئے لیبیا پہونچ گئیں، لیکن دوسری طرف یہاں منیلا میں صدر مارکوس نے متعدد مسلم دشمن اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا، مثلاً:

۱۔ مورو قومی محاذ کے خلاف ایک خصوصی فوج کی تنظیم،

۲۔ فلپائن کی مسلح افواج کی جنوبی فلپائن میں دوبارہ تعیناتی،

۳۔ مورو نہرست علاقوں میں بری، بحری اور فضائی افواج کے محفوظ (Reserve) دستوں کا قیام،

۴۔ مجوزہ خودمختار خطہ کے لئے منظور شدہ علاقوں کے باشندوں کو خود اختیاری کے خلاف برانگیختہ کرنا،

۵۔ مورو مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف کی تخم ریزی،

۶۔ مورو قومی آزادی محاذ پر جنگ بندی کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرنا،

واقعہ یہ ہے کہ جنوبی فلپائن کے انتشار اور خانہ جنگی کے باعث مسلم ممالک سے جمہوریہ فلپائن کے تعلقات ہمیشہ سے خراب چلے آرہے تھے، اور وہ اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، صدر مارکوس اس صورت حال سے سخت پریشان تھے، چنانچہ انھوں نے ان مسلم ملکوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے جدہ کانفرنس میں جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کی ایک با اختیار حکومت کے قیام کا وعدہ کیا، اور اب معاہدۂ طرابلس کے بعد بقول کارمیلو س باربیرو (جنھوں نے اس معاہدہ پر فلپائنی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے دستخط ثبت کئے ہیں) "ان مذاکرات سے نہ صرف مسلم ملکوں نے فلپائن کو اپنا دوست بنالیا ہے بلکہ اس کو آئندہ مئی میں طرابلس میں ہونے والی اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس میں بحیثیت مشاہد (Observer) مدعو بھی کیا ہے"

دوسرے یہ کہ مجوزہ خودمختار بنگسا مورو حکومت میں جو علاقے شامل کرنا طے کئے گئے ہیں وہ بہت ہی دولتمند زرخیز، معدنی ذخائر اور مچھلیوں کی کثرت سے مالا مال ہیں، معاہدۂ طرابلس میں مسلمانوں کے مستقل ومخصوص مالی، اور اقتصادی نظام کی تجویز بھی منظور کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ حکومت فلپائن اتنی آسانی کے ساتھ اپنی معیشت کی اس بنیاد کو ختم کرنے پر تیار نہیں ہوسکتی ہے، جنوبی فلپائن کے مسلم قائدین کا خیال ہے کہ مسلم ممالک خصوصاً مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے موثر دباؤ کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، کیونکہ آج فلپائن کی ضرورت کا ۹۰ فی صد

مشرق وسطیٰ ہی سے درآمد کیا جاتا ہے،

مسلم وزرائے خارجہ کی گذشتہ ماہ ہونیوالی کانفرنس نے صدر مارکوس پر معاہدۂ طرابلس سے انحراف
۔ام عائد کرتے ہوئے اُن کی دوہری حکمت عملی پر اپنی شدید ناراضگی اور تشویش کا اظہار
ہے، مارکوس کے اس رویّہ کی وجہ سے کئی ماہ کی خوش آیند توقعات کے بعد فلپائن کی
بت حال پھر تشویشناک اور غیر یقینی ہو گئی ہے

کرنل قذافی نے جو فریقین کے درمیان مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش تھے،
ں برداشتہ ہو کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اب حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی
ذ اپنے مسائل سے جس طرح بھی چاہیں خود ہی نبرد آزما ہوں،

محاذ کے سکریٹری نور سواری نے بھی مذکورہ کانفرنس میں بطور مشاہد تقریر کرتے
ے کہا کہ:-

"مورو قومی آزادی محاذ کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں
رہ گیا ہے کہ وہ از سرِ نو اپنی مسلح جد وجہد کا آغاز کرے، اور
مکمل آزادی کے اس مطالبہ کو پھر دہرائے، جس سے اسلامی کانفرنس
کے ایما پر وہ دستبردار ہو گیا تھا"

اب فلپائن کی تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ معاملہ کو چار فریقی وزارتی کمیشن
سپرد کر دیا گیا ہے، جو مورو قومی آزادی محاذ اور حکومت فلپائن کے درمیان مصالحت
کرانے کی کوشش جاری رکھے گا،

......۞......

مولانا محمد سلیم کیرانوی مرحوم

از عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا محمد سلیم صاحب سے میری ملاقات پہلی بار شاید قرول باغ دہلی میں ہوئی، اس زمانہ میں انھوں نے وہاں مدرسۂ صولتیہ کے تعارف اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے دفتر قائم کیا تھا، اور ایک ماہوار رسالہ نکالتے تھے، جامعہ ملیہ بھی اس زمانہ میں قرول باغ ہی میں تھی، اسکی وجہ سے میرا وہاں آنا جانا ہوتا رہتا تھا، خیال آتا ہے کہ وہ ایک بار لکھنؤ میں بھی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں انھیں دیکھا تھا، یہ ملاقاتیں سرسری تھیں، گفتگو بھی زیادہ تر رسمی ہوئی، مگر مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی سے نسبت اور مدرسۂ صولتیہ کے تعلق کی بنا پر دل میں انکی غیر معمولی عزت تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ کا مسلمانان ہند پر بڑا احسان ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد سارا ملک عیسائیت کے نرغے میں آگیا تھا، مشنری اس زور و قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ کچھ ہی عرصہ میں پورا ملک عیسائی ہو جائے گا، مسلمان خاص طور سے زد میں تھے، اس زمانہ میں انگریزوں کا جو رعب اور دبدبہ تھا اس کے سامنے بڑے بڑوں کے پتے پانی ہوتے تھے، ایسی وحشت انگیز فضا میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ نے جان پر کھیل کر مقابلہ کی ہمت کی، اس زمانہ میں پادری فنڈر کا بڑا غلغلہ تھا، وہ بڑا زور آور مناظر سمجھا جاتا تھا،

حکومت کی پشت پناہی نے اسے بہت بیباک بنادیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ نے اسے دعوت مبارزت دی، بالآخر ۱۲۷۰ھ میں آگرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر مجلس مناظرہ منعقد ہوئی، اس موقع پر مولانا کے ساتھ ڈاکٹر محمد وزیر بھی تھے تاکہ حسب ضرورت انگریزی میں مولانا کی ترجمانی کرسکیں۔

مولانا نے بائبل کی تحریف اور نسخ پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ پادری فنڈر لاجواب ہوگیا، اس شکست نے مشنریوں کے حوصلے پست کردئے اور نصرانیت کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، لیکن انگریزی حکومت کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی، آج آزادی کے دور میں ہم اس زمانہ کے انگریزی رعب و داب کا اندازہ نہیں کرسکتے ہیں، پادری فنڈر کی شکست تو بہت بڑی بات تھی، اس سے بہت چھوٹی باتوں پر دار و رسن کی نوبت آجاتی تھی، مولانا رحمۃ اللہ کو لوگوں نے اس صورت حال سے باخبر کیا، اور مشورہ دیا کہ ہندوستان سے باہر نکل جائیں، انھوں نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کرلی، وہیں اپنی مایۂ ناز کتاب اظہار الحق تصنیف کی جو مسیحی عقائد و خیالات کی تردید میں اب تک لاجواب سمجھی جاتی ہے۔

پادری فنڈر ساری دنیا میں مشہور تھا، اس کی شکست سارے مسلم ممالک میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی اور مولانا رحمۃ اللہ رحمۃ اللہ کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جانے لگا، یہ سلطان عبد الحمید کا زمانہ تھا، انھوں نے مولانا کو قسطنطنیہ بلایا، بڑا اعزاز و اکرام کیا اور خواہش کی کہ آستانۂ خلافت کے قریب قیام کریں، مگر مولانا نے ہجرت کے ثواب کو ضائع کرنا پسند نہ کیا اور سلطان سے اجازت لے کر مکہ معظمہ واپس آگئے، اسکے بعد بھی کئی بار طلب کئے گئے اور اسی خواہش کا اظہار کیا گیا مگر مولانا نے معذرت کردی اور ساری زندگی بیت اللہ کے جوار میں گذار دی، مکہ معظمہ میں انھوں نے ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس کی خدمات آج تک جاری ہیں۔

۱۳۰۸ھ میں مولانا نے وفات پائی، ان کے بعد ان کے بھتیجے مولانا محمد سعید نے مدرسہ صولتیہ کا

انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ خدمت ان کے صاحبزادہ مولانا محمد سلیم کے سپرد ہوئی، انھوں نے اپنی ساری زندگی اس کام میں لگادی، اس اثناء میں حجاز میں بڑے انقلاب آئے، پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس غداری کا انجام اچھا نہیں ہوا، ساری دنیائے اسلام نے اس حرکت پر بیزاری کا اظہار کیا، چند ہی برس میں والئ نجد شاہ عبد العزیز ابن سعود نے اسے شکست دے کر حجاز سے نکال باہر کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔

یہ سارے انقلابات مولانا محمد سلیم کے سامنے ہوئے، وہ تفصیل سے اس دور کے حالات سناتے تھے، کہتے تھے کہ حرمین شریفین کے ساتھ ترکوں کو والہانہ عقیدت تھی، وہ دل سے اپنے کو خادم الحرمین سمجھتے تھے، جنگ عظیم کے زمانہ میں حرم شریف کے اندر کھڑے ہو کر شریف حسین نے انور پاشا کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا لیکن اس اقرار کے باوجود انور پاشا کے رخصت ہوتے ہی بغاوت کر دی اور برطانوی حکومت کی مدد کر ترک سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا حال بھی سناتے تھے، سعودی حکومت کے آغاز سے اس وقت تک کے حالات سے بھی خوب واقف تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کے حافظہ میں محفوظ تھے جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتے

۱۹۶۲ء میں جب جامعہ کے بعض احباب (ارشاد الحق مرحوم، عبد الرزاق صاحب اور سعید انصاری صاحب) کے ساتھ حج کا ارادہ ہوا تو قیام کے لئے مدرسہ صولتیہ کا خیال آیا، مولانا محمد سلیم صاحب کو اس ارادہ کی اطلاع دی اور جہاز کا نام اور تاریخ بھی لکھ دی، جب ہم لوگ جدہ پہونچے تو مولانا کے فرستادہ قاری عبد الرؤف مدینۃ الحجاج میں خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھے، دوسرے دن مکہ معظمہ میں مولانا سے ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے ملے اور فرمایا، پوچھنے کی کیا بات تھی، صولتیہ تو مولویوں کا گھر ہے، ان کی کریم النفسی کرایہ کے ذکر سے گریز کر رہی تھی، لیکن ہم لوگوں نے مدرسہ کا نقصان گوارا نہ کیا اور کرایہ ادا کر دیا، تقریباً ڈھائی ماہ مکہ معظمہ میں قیام رہا، ان کے

سلیہ میں یہ دن بڑے آرام سے گزرے، ان کی مجلس بڑی باغ و بہار ہوتی تھی، بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے
سیکڑوں لطائف و ظرائف نوکِ زبان تھے، قصص و امثال کی تو کوئی حد نہ تھی، بات میں بات نکلتی اور قصہ پر قصہ
چھڑتا اور سامعین ایسے محو ہوتے کہ گھنٹوں گزر جاتے اور اٹھنے کا جی نہ چاہتا، ان کے معلومات و ملفوظات اگر
قلمبند ہوگئے ہوتے تو بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے، گزشتہ ساٹھ برس کی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی،
شاید ہی کوئی دوسرا شخص واقعات اور ان کے علل و اسباب سے اس قدر واقف ہو، میں نے کہا کہ یہ حالات
قیدِ تحریر میں آجاتے تو آئندہ مورخ کے لئے بڑے کارآمد ہوتے، کہنے لگے کہ عرصہ ہوا کچھ واقعات لکھے تھے لیکن پتہ
نہیں اب کہاں ہیں، ان کے صاحبزادہ مولوی محمد شمیم کو بھی ایک بار توجہ دلائی تھی، خدا کرے وہ کاغذات مل جائیں
اور شمیم صاحب انھیں مرتب کرکے شائع کردیں۔

حجاج کی خدمت کا بہت شوق تھا، ان کی راحت رسانی کی پوری تدبیر کرتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں شاہ
معین الدین احمد صاحب مرحوم کے ساتھ دوبارہ حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا کی خدمت میں بھی
حاضری کا موقع ملا، شاہ صاحب حضرت شاہ احمد عبدالحق ردولی کی اولاد میں تھے جو مخدوم جلال الدین پانی پتی کے خلیفہ تھے
اور مولانا محمد سلیم صاحب حضرت جلال الدین پانی پتی کی نسل سے تھے، اس رشتہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے
بہت تعلق تھا، بڑی یگانگت سے ملے اور دیر تک بزرگوں کا تذکرہ ہوتا رہا، عمر کافی ہو چکی تھی مگر نشاطِ طبع میں
کوئی فرق نہیں آیا تھا، لطفِ بیان اور حلاوتِ لسان کا وہی عالم تھا، بلبلِ ہزار داستان کی طرح بولتے اور چہکتے
گلفشانیٔ گفتار دیدنی ہوتی، ثقاہت میں ظرافت اور سنجیدگی میں مزاح کی ایسی آمیزش کم دیکھنے میں آئی ہے۔
اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ زبان گہربار جلد خاموش ہونے والی ہے، سال ہی بھر میں شاہ معین الدین احمد اللہ کو
پیارے ہوگئے اور ان کے دو برس بعد مولانا محمد سلیم نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا، اللہ تعالیٰ اپنے سایۂ رحمت
میں جگہ عنایت فرمائے۔

مولوی محمد شمیم نے ان کی زندگی ہی میں تمام کاموں کو سنبھال لیا تھا، اللہ انھیں توفیق عطا فرمائے کہ

کہ اپنے نامور باپ کی روایات کو قائم رکھیں، ہندوستانی حجاج روز افزوں گرانی سے بے حد پریشان ہیں، متوسط طبقہ کی استطاعت روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے، اس وقت انھیں سہارے کی ضرورت ہے، کسی زمانہ میں حرمین شریفین میں متعدد رباطیں موجود تھیں مگر اب وہ یا تو ختم ہو گئی ہیں یا خاتمہ کے قریب ہیں شمیم صاحب اگر حاجیوں کے لئے سستی قیام گاہوں کا انتظام کر سکیں تو ثواب دارین کے مستحق ہوں گے، اس سلسلہ میں سعودی حکومت اور ہندوستانی گورنمنٹ دونوں کی طرف سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

مدرسہ صولتیہ کو اپنے زمانۂ قیام ہی سے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی مولانا رحمۃ اللہ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد نے اسے عالم اسلام کا مشہور مدرسہ بنا دیا تھا، اس کے فیض یافتگان بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہوتے تھے، ساری دنیا میں اب حالات پہلے سے بہت کچھ بدل گئے ہیں، اس انقلاب سے سعودی عرب بھی متاثر ہوا ہے، تعلیم و تربیت کے میدان میں بہت اصلاحات ہوئی ہیں اور ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان تغیرات کی روشنی میں مدرسہ کو بھی مناسب اصلاحات کرنی ہوں گی۔

مدرسہ صولتیہ میں ایک زمانہ میں ہندوستانی طلبہ کافی جایا کرتے تھے اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے ہندوستان کے مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، اس بارہ میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، اس کام کے لئے ہندوستان کے اہل خیر سے کافی وظائف مل سکتے ہیں۔ اس طرح اہل ہند اس درسگاہ سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہو سکیں گے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ اور مولانا محمد سلیم مرحوم کے مقاصد پایۂ تکمیل کو پہونچ سکیں گے، خدا کرے مولوی محمد شمیم کے ہاتھوں مدرسۂ صولتیہ کے ایک شاندار دور کا آغاز ہو۔

باب التقریظ والانتقاد

"ارمغانِ نعت"

از۔ ضیاء الدین اصلاحی

مرتبہ۔ جناب شفیق بریلوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ،

صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت عشکہ پتہ:۔ مکتبہ خاتون پاکستان پوسٹ بکس ۹۹۰ کراچی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عزت، محبت، عظمت اور اہمیت مسلمانوں کے نزدیک ہے، اس بنا پر وہ آستانۂ رسالت پر اخلاص وعقیدت کا نذرانہ پیش کرنے میں وسیلۂ مغفرت خیال کرتے ہیں اور آپ کی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے آپکے پیام کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، اسی غرض سے سیرتِ نبوی پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔

نثر نگاروں کی طرح شاعروں نے بھی بارگاہ نبوت میں عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کئے ہیں اور آپ کی سیرتِ طیبہ سے اپنے فرط تعلق کا اظہار کیا ہے بعض شاعروں نے تو بجز نعت کے دوسری اصناف سخن سے اپنی زبان آلودہ کرنا بھی پسند نہیں کیا، اور انھوں نے اپنی مشقِ سخن اور جولانی طبع کا دائرہ بس اسی مقدس صنف تک ہی محدود رکھا ہے۔

جناب شفیق بریلوی اڈیٹر ماہنامہ خاتون پاکستان کو اس صنفِ سخن سے بڑی دلچسپی ہے، ان کے رسالے کے رسول نمبروں کا حصہ منظم گلشنِ نعت کے رنگ برنگ پھولوں کو

معطر رہتا تھا، اس میں اردو، عربی اور فارسی کا جو نعتیہ کلام شائع ہوتا رہا، اب اس کو اضافہ کے بعد "ارمغان نعت" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس میں گذشتہ چودہ سو سال کا منتخب نعتیہ کلام آگیا ہے، عربی فارسی اور ترکی وغیرہ میں اس طرح کے مجموعے موجود تھے لیکن اردو میں یہ غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ بعض علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی، اور پشتو وغیرہ کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، آخر میں بعض ہندو شعرا کا منظوم خراج عقیدت بھی ہے۔

اس مجموعہ سے ناظرین کو متعدد نعت نگاروں کا علم پہلی بار ہوگا، صحابہ کرام میں حضرت حسانؓ حضرت کعبؓ بن زہیرؓ، اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نعت گو اور مداح رسول کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں، لیکن مصنف کی محنت و جستجو سے اس میں خلفاے راشدینؓ حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت ابو سفیانؓ بن حارث کے علاوہ آپ کے شفیق و غمگسار چچا ابو طالب کے نعتیہ ترانے بھی ملیں گے، اور امام زین العابدینؒ اور علامہ بوصیری کی طرح امام ابو حنیفہؒ علامہ ابن خلدونؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی نعتوں کی سوغات کو بھی شامل کیا گیا ہے، عربی نعت نگاروں کی بزم قدس میں ہندوستان کے شاہ ولی اللہؒ دہلوی، آزاد بلگرامی، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز اور ابوطاہر سیف الدین بھی نظر آتے ہیں، فارسی نعت گویوں میں بھی ہندوستانی شعرا کی فہرست طویل ہے اردو کے نعت گو شاعروں کی صف میں کئی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کی شہرت اور دوسری حیثیتوں سے ہے مگر جناب شفیق کی تلاش سے مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولوی اسماعیل میرٹھی، سردار عبدالرب نشتر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ کی نعتیں بھی جمع ہوگئی ہیں، مصنف نے طوالت کے

خوف سے ہر شاعر کی صرف ایک ہی نعت پر اکتفا کی ہے، اور بعض طویل نعتوں کا انتخاب دیا ہے، شاعروں کے سنینِ وفات بھی دے گئے ہیں، اسی اعتبار سے ان کے ناموں کی ترتیب بھی ہے۔

نعت گوئی کے لئے دل کی مستی و سرشاری اور دماغ کی ہوشیاری و بیداری دونوں ضروری ہیں، کیونکہ اس میں آنحضرت صلعم کی ذاتِ اقدس کی محض تعریف و توصیف ہی نہیں ہوتی، بلکہ یہ آپ کے اوصاف و کمالات کی ایسی مصوری کا نام ہے جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو، اس لیے ایک نعت گو شاعر کو حبِ رسول میں سرشار ہونے کے ساتھ ہی نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی صحیح روح، عہدِ رسالت کے واقعات اور آیات و احادیث سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ افراط و تفریط سے بچ کر احتیاط اور جذبۂ احترام کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر سکے، اس کے بغیر ہر قدم پر لغزش کا امکان رہتا ہے، اور اس راہ میں ادنیٰ لغزش سے ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے شعرا بھی اس نازک مقام پر لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ ؎

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

اور عرفی جیسے شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا:

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحراست آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

بعض نعت گو شعرا الوہیت و نبوت کے حدود میں فرق نہیں کرتے، وہ نبوت کو الوہیت سے ملا دیتے ہیں، اس افراط و غلو کے مقابلہ میں دوسری طرف تفریط

دستۂ ادب کا یہ حال ہے کہ بعض شاعر نبوت کی ذاتِ پاک کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے وہی پیرایہ اختیار کرتے ہیں، جو عشق مجازی کے معشوقوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، درحقیقت آپکی ذاتِ مبارک میں نبوت و عبدیت دونوں کے کمالات ختم ہو گئے ہیں، اس لیے جو تصور بھی ان کے منافی ہوگا، اس کا انتساب آپ کی جانب گمراہی ہے، اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کی اکثر نعتیں جوشِ عقیدت سے لبریز ہونے کے باوجود افراط و تفریط سے خالی ہیں، نبوت کی عظمت و جلالت اور خصائص محمدیؐ کے بیان میں الوہیت کی تقدیس و تنزیہ کو مدنظر رکھا گیا ہے، درج ذیل عربی، فارسی اور اردو کے ایک ایک شعر سے اس کا اندازہ ہوگا۔

دع ما ادعته النصاری فی نبیھم ۔ واحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم
(بوصیری)

صرف وہ بات چھوڑ دو جس کا دعوی نصرانیوں نے اپنے نبی کے بارہ میں کیا ہو،
اس کے علاوہ جو تمہارا جی چاہے حضورؐ کی مدح میں کہو،

مخواں او را خدا از بہر امر شرع و حفظ دیں ۔ دگر ہر وصف کش می خواہی اندر مدحش املا کن
(شاہ عبدالحق رح)

فرشتے قبر میں پوچھیں گے گر مجھ سے تو کہدوں گا ۔ کہ ہوں بندہ خدا کا اور ہوں شیدا محمدؐ کا

اکثر نعتیں آیات و احادیث، اسلامی تاریخ کے واقعات کی تلمیحات، دینی حرمت، اسلامی روح اور شاعرانہ لطافتوں سے معمور ہیں۔

شاعروں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کے نام تحریر کرنے اور نمونے کے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں، ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے یہ لکھنا کافی ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانی رح معارف کے مدیر اول مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولوی اقبال احمد خان سہیل کا نعتیہ کلام بھی اس میں موجود ہے۔

شروع میں پاکستان کے مشہور عالم اور ندوہ کے لائق فرزند مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی کے قلم سے ایک پرمغز مقدمہ ہے، اس میں نعت کے لغوی و اصطلاحی معنی بتانے کے بعد عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں اس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، مولانا نے بڑی تحقیق و کاوش سے یہ ثابت کیا ہے کہ نعت کی ابتدا عہد نبوت ہی میں ہو چکی تھی، اس ضمن میں بائیس نعت گو صحابۂ کرام کے نام اور ان کے ایک ایک شعر بھی دیئے ہیں، بعد کی صدیوں میں جن عربی شاعروں نے اس فن کی جانب زیادہ توجہ کی تھی، ان کی بھی فہرست دی ہے، فارسی، ترکی اور اردو کے بھی اہم نعت گو شاعروں کے نام اور بعض کے کلام کی خصوصیات کا بھی ذکر ہے، پندرہ صفحہ کا یہ مقدمہ بڑی تحقیق و محنت سے لکھا گیا ہے، پاکستان کے ایک اور صاحب علم و قلم مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی نے وہ سب آیتیں اکٹھا کر دی ہیں، جن میں رسول اللہ کی مدح و منقبت اور آپ کے خصائل و کمالات بیان ہوئے ہیں۔

ہندی میں بھی نعتیہ شاعری کا اچھا ذخیرہ موجود ہے، پنجابی، سندھی، اور پشتو وغیرہ کی طرح اس کا بھی انتخاب اردو رسم الخط میں ہو جاتا تو مناسب تھا، حضرت خواجہ گیسو دراز، محمد قلی قطب شاہ، شاہ [illegible] جان گنگوہی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور کبیر داس کی نعتیہ نظمیں ہندی اور پوربی ہی میں ہیں، لیکن ان کو اردو میں خلط ملط کر دیا گیا ہے، ایسے مجموعہ میں استیعاب و استقصا بہت مشکل ہے، مصنف کی کوشش کے باوجود بعض اچھے نعت گو شاعروں کا کلام رہ گیا ہے، ایسے نام جو اس وقت ذہن میں [illegible] شاہ [illegible] دہلوی، سر سید احمد خاں، راسخ عظیم آبادی، [illegible] احسان [illegible] جہان پوری، احمد حسین [illegible] ندوی، [illegible] [illegible]

عزیز الحسن مجذوب، الم مظفر نگری، یحییٰ اعظمی، عبد الکریم ثمر، وفا براہی وغیرہ ہند و شعرا کی فہرست میں بھی بعض نام رہ گئے ہیں، آخر میں موجودہ شاعروں کا نعتیہ کلام درج ہے، لیکن اس میں بھی ہندوستان کے اکثر جدید شعرا نظر انداز ہو گئے ہیں، ممکن ہے گذشتہ کئی برسوں سے دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں کے آنے جانے کی بندش اس کا سبب ہو،

بعض مرحوم شعرا کے نام زندوں کی فہرست میں آئے ہیں، آغا شورش کاشمیری اور مولانا مفتی محمد شفیع کا تو حال ہی میں انتقال ہوا ہے، لیکن حمید صدیقی، اور تسکین قریشی کب کے وفات پا چکے ہیں، سنین وفات میں بھی کہیں کہیں غلطی ہے، جیسے اقبال سہیل کا سنہ وفات سنہ ۱۹۴۵ء لکھا ہے، حالانکہ صحیح سنہ ۱۹۵۴ء ہے، غالباً کتابت کی غلطی سے اکبر میرٹھی کی نظم میں معراج کو مذکر (ص ۱۲۵) اور سردار عبد الرب نشتر کی نظم میں اسکو جمع استعمال کیا گیا ہے، عربی شعروں میں اعراب کی غلطیاں بہت ہیں، پتہ نہیں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کے سرنامہ کی عبارت میں تصرف کیوں کر دیا گیا ہے،

علامہ شبلی کی اصل عبارت یہ ہے۔

ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے"
مگر اس کو اس طرح نقل کیا گیا ہے،

"ایک فقیر بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں عقیدت کے گجرے لے کر حاضر ہوا ہے"
ان فروگذاشتوں سے ارمغان نعت کی قدر و قیمت میں فرق نہیں آتا، مرتب کی محنت اور عقیدت سے نعتوں کا یہ مجموعہ مرتب ہوا، اخبار و رسائل میں انکی عقیدت کا [illegible] پہنچا دینی خدمت سے قطع نظر ایک مفید ادبی خدمت بھی ہوئی ہے، اس لیے ارباب ذوق کو مرتب کا شکر گزار ہونا چاہیے، مضامین کی طرح کتاب کی ظاہری شکل بھی دیدہ زیب اور دلکش ہے۔

مطبوعات جدیدہ

محاسن موضح القرآن :- از۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت بہتر، صفحات ۰۰-۲۶۵، قیمت:- عہ؎ پتہ:- ادارۂ رحمت عالم، شیخ چاند اسٹریٹ لال کنواں دہلی۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن اور ان کے مختصر تفسیری حواشی محتاج تعارف نہیں ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں انھوں نے موضح القرآن کے نام سے یہ کام مکمل کر لیا تھا، اسکے بعد بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں لیں، اور جب چھاپے خانے قائم ہوئے تو لاکھوں کی تعداد میں ان کے نسخے شایع ہوئے، اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، تقریباً دو صدیاں گزر چکی ہیں، مگر شاہ صاحب کے کارنامہ کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آیا، اس طویل عرصہ میں اردو کا اسلوب بیان بہت بدل گیا ہے، الفاظ و محاورات میں بھی کافی تغیر ہو چکا ہے، لیکن بایں ہمہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ اور تفسیر کی مقبولیت بدستور ہے، اردو میں ترجموں کی کوئی کمی نہیں ہے، بڑے بڑے صاحب نظر عالموں اور چوٹی کے زبان دانوں نے ترجمے کئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمہ کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچتا، شاہ صاحب نے مطالب قرآنی کا صرف مفہوم ادا کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ قرآنی الفاظ کی وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری کو بھی ترجمہ میں باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، مثلاً کل یعلی شاکلتہ کا ترجمہ کیا ہے، ہر ایک کرتا ہے اپنے ڈول پر۔ دیکھئے شکل اور شاکلہ میں جو رعایت لفظی ہے

دہی ڈیل اور ڈول میں ہے، ردیا کا ترجمہ خواب کے بجائے دکھاوا کیا ہے، دکھاوا میں خواب کا مفہوم بھی ہے، اور مشاہدہ کا بھی، اسی طرح بعزۃ فرعون کا ترجمہ فرعون کے اقبال سے کتنا برمحل ہے،

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، محاسن موضح القرآن میں آپ کو بکثرت مثالیں ملیں گی شاہ صاحب کے ترجمہ کی یہی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر امتداد زمانہ کے باوجود آج بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تصحیح کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ اور تفسیری حواشی میں بہت تغیر ہوگیا ہے، اس صورت حال سے سبھی کو ملال تھا، مگر کسی کو اتنے بڑے اور اہم کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی تھی، یہ سعادت اللہ نے مولانا اخلاق حسین قاسمی کی قسمت میں لکھی تھی، وہ اپنی بے مائگی، اور تہی دستی کے باوجود اس عظیم الشان کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، عرصہ سے اس کام میں لگے ہیں، تلاش و تحقیق کے بہت سے مراحل طے کر چکے ہیں، اور ایک صحیح نسخہ ایڈٹ کر کے ترجمہ اور تفسیری فوائد (موضح القرآن) شایع کرنے کی فکر میں ہیں، پیش نظر کتاب کو اس کا مقدمہ سمجھئے، اس نام سے ایک مختصر کتابچہ پہلے شایع ہو چکا ہے، اس پر تبصرہ بھی ان سطور میں ہو چکا ہے، اب مزید اضافہ کے ساتھ اسے شایع کیا ہے، یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اردو تراجم کی عمومی تاریخ کے ساتھ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور موضح القرآن کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا مفصل ذکر کیا ہے، اور کس کس طرح اس میں تحریف ہوئی اسے وضاحت سے بیان کیا ہے، دوسرے باب میں شاہ صاحب کے ترجمے اور تفسیر کے محاسن بیان کیے گئے ہیں اور جا بجا دوسرے مترجمین سے مقابلہ کر کے شاہ صاحب کے کمالات کی تشریح کی ہے، تیسرے باب میں محرکات ذکر کیا ہے، اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں، امید ہے کہ

اس کتاب کے مطالعہ سے شاہ صاحب کے ترجمہ و تفسیر کے محاسن نظر کے سامنے آجائیں گے اور اس محنت کا اندازہ بھی ہو جائے گا، جو مولانا اخلاق حسین صاحب کی ان تصحیح و اشاعت کے لیے کر رہے ہیں،

سرسید کی صحافت۔ مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۹۰ مجلد قیمت عام اڈیشن ۱۵؍ ڈی لکس اڈیشن ۲۰؍ پتہ انجمن ترقی اردو ہند، دلی،

سرسید احمد خاں مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ صحافت بھی ہے لیکن ان کے اور کارناموں کی طرح ابھی تک اس پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، سرسید ہال کے لایق وارڈن ڈاکٹر اصغر عباس نے یہ کتاب لکھ کر کمی پوری کر دی، یہ دراصل انکا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے، یہ آٹھ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے، پہلے باب میں سرسید احمد خاں مرحوم کے حالات و سوانح درج ہیں، اس میں ان کے عہد و ماحول کی تصویر اور ان کے ملی، قومی، اصلاحی، تعلیمی اور ادبی خدمات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد، اس کے اشاعتی پروگرام، اور اس سے وابستہ اشخاص کا ذکر ہے، چند ابواب میں سرسید کے اخبار انسٹی ٹیوٹ کی نمایت، اس کے سائز، ہیئت، قیمت، تاریخ و روز اشاعت کارکنوں، خبروں کی نوعیت مضامین و اداریوں کی ترتیب اور انکی خصوصیات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، ان ابواب سے اخبار کی اہمیت اور اس کے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ خود سرسید احمد خاں کی عظمت اور ان کے بلند عزائم و مقاصد کا بھی اظہار ہوتا ہے آخر کے تین ابواب میں گزٹ کے لکھنے اہم مضمون نگاروں کے مختصر سوانحی خاکے اور اس میں شایع شدہ سرسید کے مضامین کی روشنی میں ان کے اسلوب تحریر کی

نمایاں خصوصیات اور اردو صحافت پر ان کے اثرات دکھائے گئے ہیں ضمیموں میں سائنٹفک سوسائٹی کے اصول وضابطے اور ان کتابوں کے نام مع مصنفین وتاریخ اشاعت دے گئے ہیں، جن پر گزٹ میں تبصرے شایع ہوئے ہیں آخری ضمیمہ میں ناگری سے متعلق سرسید کا ایک مختصر مگر اہم مضمون درج ہے، یہ آج بھی ان لوگوں کے لئے قابل غور ہے، جو اردو رسم الخط بدلنے اور اسکو ناگری میں تبدیل کرنے کی تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں، کتاب محنت اور سلیقہ سے لکھی گئی ہے، اور اس سے سرسید کی صحافت کے مختلف پہلو اور خصوصیات سامنے آگئی ہیں، مصنف کی تحریر میں شائستگی اور بیشتر خیالات میں اعتدال ہے، جہاں انھوں نے پیشرو مصنفین سے اختلاف کیا ہے وہاں بھی انکی رائے مدلل اور متین ہے، ایک جگہ انکی تردید کیگئی ہے کہ مولانا شبلی نے سرسید اور انکے مذہبی خیالات سے اختلاف کی وجہ سے علیگڑھ چھوڑا تھا، مگر مصنف نے ان داخلی وخارجی اسباب کی نشاندہی نہیں کی جو مولانا کے علیگڑھ چھوڑنے کا باعث ہوئے تھے (ص ۱۲۹و۱۳۰) شبلی کے عام ناقدین کی طرح وہ بھی انکو تمامتر علیگڑھ کا ساختہ پرداختہ سمجھتے ہیں جو صحیح نہیں انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، (ص ۱۳) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تحریک کا غور سے مطالعہ نہیں کر سکے ہیں وجوہات (ص ۳۰) اور اکابرین (ص ۱۲۳) جمع الجمع ہیں جو صحیح نہیں روابط اثرات (ص ۱۹) اور گزٹ (ص ۲۰) کو مونث لکھنا بھی صحیح نہیں ہے بعض جملے بھی غلط ہیں جیسے انھیں خانقاہ مظہری کے مشہور بزرگ شاہ غلام علی سے بیعت تھی (ص ۲۶) کیونکہ یہ جن حلقوں کا ممدوح بنا وہی زندگی کے دھارے کا رخ موڑنا جانتا تھا" (ص ۳۶) ان کے دلوں میں زندگی کرنے کا ایک نیا حوصلہ ... (ص ۱۵۴) ایک جگہ صنعا یمن کا صنعائی یمن (ص ۳۱) لکھا ہے امید کہ اس اچھی اور مفید کتاب کے آئندہ اڈیشن میں اس قسم کی فروگذاشتیں درست کر لی جائیں گی۔ ((ض))

جلد ۱۲۱ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

مرتبہ:- سید صباح الدین عبدالرحمن، قیمت :- ۵ روپیہ

دہلی کے ایک سمینار میں بظاہر ایک متشرع اور دیندار عالم کی زبان سے بڑے دکھ کے ساتھ یہ سننے میں آیا کہ تصوف سے اسلام کو جتنا نقصان پہنچا کسی اور چیز سے نہیں پہنچا، اس سے پہلے دہلی کے ایک بین الاقوامی سمینار میں ایک یونیورسٹی کے ممتاز دانشور دعویدار ہوئے کہ تصوف کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، اس کی تائید ایران کے ایک مندوب نے بھی کی، جب خلافت راشدہ، حدیث، فقہ اور کلام کے منکرین ہو سکتے ہیں تو تصوف کے منکرین پر کیا تعجب ہے،

تصوف پر یہ اعتراضات نئے نہیں بہت پرانے ہیں، ان کے مدلل جوابات بھی دیئے جا چکے ہیں جن کو حقیقت اور صداقت کی جستجو رہی، اُن کی تشفی تو ان جوابات سے ہو گئی، مگر جن کے اعتراضات ذہنی تفریحات یا مناظرانہ مباحثہ یا کسی مطلب برآری کے لئے تھے، اُن کی تشفی نہ ہو سکی، اور نہ آئندہ ہو سکے گی، اگر تصوف سے اسلام کو نقصان پہنچا تو کیا حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، اور ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ باقی باللہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہ جیسے بزرگان دین کو اسلام کو نقصان پہنچانے والوں میں شمار کیا جائے؟ کیا اُن کا تعلق اسلام سے نہ تھا؟ کیا یہ وہ مشاہیر اسلام نہیں ہیں جن کے جلوے مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی تاریخ میں سمائے ہوئے ہیں؟ ان سب کے حالات زندگی سے ظاہر ہے کہ یہ اگر صوفی تھے تو عالم بھی تھے، ایک صوفی کا عالم ہونا ضروری ہے، ایک عالم اور صوفی میں کوئی تضاد نہیں، صرف دونوں کے روحانی مدارج میں فرق ہے، دونوں

کی منزل ایک ہوتی ہے صرف کچھ طریقے الگ الگ ہوتے ہیں،

بگڑے ہوئے صوفیوں سے اسلام کو ضرور نقصان پہنچا، مگر بگڑے ہوئے علماء سے بھی تو اسلام کو نقصان پہنچتا رہا ہے اگر بگڑے ہوئے علماء کی وجہ سے اسلام کو برا کہنا غلط ہے، تو بگڑے ہوئے صوفیوں کی وجہ سے تصوف کو برا کہنا کہاں تک صحیح ہے؟ دنیا دار صوفیوں کی مذمت ہر زمانہ میں کی گئی ہے آج سے تقریباً نو سو سال پہلے شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ نے اپنی تصنیف کشف المحجوب میں ایسے دنیا دار صوفیوں کو جن کے سامنے محض مال و منال یا جاہ و حشمت ہوتی ہے، صاحب اصول اور صاحب اصول کے بجائے صاحب فضول کہا ہے اور انکی مذمت کی ہے، اس برصغیر میں کشف المحجوب تصوف کی مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح تصوف سے اسلامی شریعت الگ نہیں کی جا سکتی پاک طینت صوفیائے کرام کا یہی مسلک رہا ہے، اُن کے نزدیک وہ عبادات، کرامات، احوال اور کیفیات حتی کہ علوم لدنیہ اگر شریعت کے مطابق نہیں تو وہ ضلالت، گمراہی اور بے دینی ہیں، شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جن صوفیہ نے کتاب و سنت کو ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ ان علماء کے لئے جو تصوف کا انکار کرتے ہیں بہت ہی برے الفاظ استعمال کئے ہیں،

اس برصغیر میں موجودہ صدی کے سب سے بڑے مفکر اسلام اقبال خانقاہوں میں مجاور بن کر رہنے والے صوفیوں کو تو بہت برا سمجھتے رہے مگر وہ مہ و انجم کے محاسب اور ایام کے راکب صوفیوں کے معترف تھے اور اس کے بھی قائل تھے، کہ تصوف ہی کی خلوت میں سوز سخن حاصل ہو سکتا ہے، شرع مسلمانی کے ساتھ جذب مسلمانی ہی سے سر فلک افلاک حاصل ہو سکتا ہے، مومن کی امیری اس کی فقیری ہی میں ہے جو مسلمانوں کو تونگری سے نہیں، قلندری سے سب کچھ حاصل ہوا، اُن کی نگاہ جہاں میں اسی وقت ہو سکتی ہے جب پاک ہوا اور یہ فقیری ہی سے پاک ہوتی رہی ہے، مگر یہ سارے دلائل ان کے لئے بیکار ہیں، جو کسی چیز

کو کھلے ذہن سے سمجھنا نہیں چاہتے، انکار، تشکک، تذبذب، عقل پرستی کی بے راہ روی کے کالے بادل
اسلام کے آسمان پر ہر زمانہ میں امنڈ کر آتے رہے ہیں، مگر انہی کے اندر سے اسلام کا آفتاب بھی برابر
جگمگاتا ہوا نکلتا رہا ہے، اسی آفتاب کی ایک روح پرور شعاع تصوف ہے، اسلام سے اس کو روشنی
ملی ہے تو یہ بھی انسانی زندگی کو اپنی روحانی تعلیمات سے روشن کرتا رہے گا،

مولانا ابوالحسن علی ندوی جو اس وقت دار المصنفین کے رکن رواں ہیں، امریکہ کے ایک اسلامی
ادارہ کی دعوت پر وہاں ایک لکچر دینے کیلئے گئے، ان کو اس ملک کے اداروں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، اس کی
کچھ تفصیل معارف کی اس اشاعت کے مکتوب امریکہ سے معلوم ہوگی، انھوں نے اس سفر میں اپنی
ایک آنکھ کا آپریشن بھی کرایا، جو بحمد اللہ بڑا کامیاب رہا، ان کی ایک آنکھ تو بالکل بے کار ہو چلی تھی
دوسری آنکھ بھی برائے نام کام دے رہی تھی، بڑی خوشی ہے کہ آپریشن سے اس میں پھر
روشنی آگئی ہے، وہ اپنی کمزور بینائی کے باوجود تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہ کر اپنے
سینے کے خزینے کو سفینے میں برابر منتقل کرتے رہے، انشاء اللہ اُن کی اس نئی بصارت سے
ان کی تحریریں اور بھی پُر از بصیرت ہوں گی،

......٥......

دار المصنفین میں یہ خبر بڑے دکھ اور رنج سے سنی گئی، کہ جناب عبدالرزاق قریشی اللہ کو پیارے
ہوئے، اُن کی وفات سے نہ صرف اردو زبان و ادب ایک لائق خدمت گذار، بلکہ دار المصنفین
ایک بہت ہی مخلص پرستار سے محروم ہو گیا، اُن کے اعزہ نے اُن کی وفات کی خبر بڑی تاخیر سے
بھیجی، معارف کی آئندہ اشاعت میں ان پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوگا، اس وقت تو
اُن کی مغفرت کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہے،

......٥......

مقالات

تقدیر امم اور علامہ اقبال

از۔ ڈاکٹر محمد ریاض تہران یونیورسٹی

(۲)

اقبال ملت کے لیے مفید اور پابندِ ضابطہ قوت کے حصول کے آرزومند تھے، اسی لیے وہ قوت و شکوہ سے محروم نبوت کو بھی اہمیت نہیں دیتے :-

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

اقبال کا مہدی، یا مردِ منتظر وہی ہے جو خود آگاہ اور خود نگر ہو۔ ان کے نزدیک ملت کی بیداری کی خاطر مہدی، مردِ منتظر یا فوق البشر کے تصورات کی تشہیر بری نہیں ہے، اس ضمن میں وہ نیٹشے (م ۱۹۰۰ء) کے تصورِ فوق البشر اور جرمنوں کی بیداری کی مثال دیتے ہیں:

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف — یہ ذوق سکھاتا ہے ادبِ مرغِ چمن کو

مجذوب فرنگی نے بانداز فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

جو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں — یا چاک کریں مردکِ نادان کے کفن کو

علامۂ مغفور کی یہ جدت اور ندرت ملاحظہ ہو کہ وہ حسین بن منصور حلاج (م ۹۲۲ء) کی شطحیاتی گفتگو "انا الحق" کو فرد کے لیے ناروا مگر ملت کے لیے روا بتاتے ہیں۔ مدعا یہ کہ فرد کا دعویٰ حقانیت گمراہ آمیز ہو سکتا ہے مگر ملتِ اسلامیہ کی سی ملتِ حق کے لیے ایسا ادعا نامناسب نہیں، کیونکہ اسے اپنے راہِ حق پر گامزن ہو جانے کا یقین ہے اور خدا کے سوا اسے کسی کا غلبہ و تفوق منظور نہیں ہے۔ انا الحق کی یہ ملی توضیح، ارمغانِ حجاز میں دیکھی جا سکتی ہے کہ

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست — سزائے او چلیپا ہست یا نیست

اگر فردے بگوید سرزنش بہ — اگر قومے بگوید ناروا نیست

بہ آں ملت انا الحق سازگار است — کہ از خونش نمِ ہر شاخسار است

نہاں اندر جلال او جمالے — کہ او را نُہ سپہر آئینہ دار است

میان امتان والا مقام است — که آن امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش — که خواب و خستگی بر وی حرام است

وجودش شعله از سوز درون است — چو خس او را جهان چند و چون است
کند شرح "انا الحق" همت او — پی "هر کن" که می گوید "یکون" است

بجام نو کهن می از سبو ریز — فروغ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواهی ثمر از شاخ منصور — بدل "لا غالب الا الله" فرو ریز

ماضی سے رابطہ کو اب ماہرین سیاست بھی اہمیت دینے لگے ہیں اور بالکل نیا طرز عمل اختیار کرنے والی اقوام ہی اس رابطے کی منکر ہوں گی۔ مسلمانوں کا رابطہ انبیا و رسل کی تاریخ اور خصوصاً تاریخ اسلام کے ساتھ ہے۔ اقبال نے اس رابطے کو مستحکم رکھنے اور توحید خداوندی کی نشر و اشاعت کے لیے ملت اسلامیہ کو متعدد مقامات پر تاکید کی ہے۔ ذیل کے اشعار مثنوی رموز بیخودی سے نقل کیے جا رہے ہیں:-

چیست تاریخ ای ز خود بیگانهٔ — داستانی قصهٔ افسانهٔ
این ترا از خویشتن آگه کند — آشنای کار و مرد ره کند
روح را سرمایهٔ تاب است این — جسم ملت را چو اعصاب است این
شمع او بخت امم را کوکب است — روشن از وی امشب و هم دیشب است
ضبط کن تاریخ را پاینده شو — از نفس‌های رمیده زنده شو
دوش را پیوند با امروز کن — زندگی را مرغ دست آموز کن
رشتهٔ ایام را آور بدست — ورنه گردی روزکور و شب‌پرست

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو | خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال | رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است | مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ | انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی | مہر را پایندگی، رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تابِ او | موج در دریا تپید از تابِ او -
صد نوا داری چو خون در تن رواں | خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست | حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
تا نخیزد بانگِ حق از عالمے | گر مسلمانی نیاسائی دمے
می ندانی آیۂ ام الکتاب | امتِ عادل ترا آمد خطاب (۲:۱۴۳)
آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو | در جہاں شاہد علی الاقوامِ تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ | از علومِ امیّے پیغام دہ
امیّے پاک از ہوی گفتارِ او | شرحِ رمزِ ما غوی گفتارِ او (سورۂ نجم)
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیلؑ | گرمیِ خونت ز صہبائے خلیلؑ
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن | تیغِ لا موجود الا ھو بزن
جلوہ در تاریکیِ ایام کن | آنچہ بر تو کامل آمد عام کن (۵:۳)
لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار | پرسد ت آں آبروئے روزگار
حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ | پس چرا با دیگراں نسپردۂ

اقبال بیداریِ دل (عقل پر عشق کی برتری) اور ادب برائے زندگی کو بھی

عروج و سربلندی امم کے لوازم میں شمار کرتے ہیں۔

دلِ بیدار فاروقیؓ دلِ بیدار کراریؓ — مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جہانِ ہردمہ زناری اوست — کشادہ ہر گرہ از زاری اوست
پیامے دہ زمن ہندوستاں را — غلام آزاد از بیداری او
دلِ ما آتش و تن موجِ دودش — تپیدم و سبدم ساز وجودش
بذکر نیم شب جمعیت او — چو سیمابے کہ بند د چوب عودش

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات / نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی / خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اشعار بالا کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ زبان نثر ان کی توضیح نہ کی جائے۔

امت مسلمہ کے اسباب زوال | امت مسلمہ کے موجودہ زوال (غلامی، علمی اور معاشرتی تقلید نیز معاشی پسماندگی) کے اسباب اقبال نے کئی مواقع پر گنائے ہیں، جو اسباب انھوں نے بتائے ہیں ان کے مزید شاخ و برگ نکالے جا سکتے ہیں، اور بعض مسلمان ممالک کے مخصوص حالات کے پیش نظر بعض اسباب کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے مگر حکیم الامت کی کسی ایک تشخیص سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اپنی شاہکار تالیف 'جاوید نامہ' میں انھوں نے مظلوم انسانوں اور مسلمانوں کے اسباب زوال بڑی صراحت سے بیان فرمائے ہیں، شاعر ماورائے افلاک، قوت عشق کے ذریعے جمال باری کے حضور حوادث دنیا کو یوں بیان کرتا ہے،

غالباں غرق اند در عیش و طرب / کار مغلوباں شمار روز و شب

از ملوکیت جہان تو خراب / تیرہ شب در آستین آفتاب

دانش افرنگیان غارت گری / دیر ہا خیبر شد از بے حیدری

آنکہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست / فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر / سود خوار و والی و ملا و پیر

اقوام عالم کو استبدادی نظام اور مغربی علم و دانش کی سفاکیت نے تباہ کر رکھا ہے، اگر مسلمانوں کو لامرکزیت (عدم اتحاد اور توحید کے مضمرات سے روگردانی) نے فکر و عمل سے محروم کر رکھا ہے، اور سود خوار، والی، ملا، اور پیر ان کے لیے

وہاں جان بنے ہوئے ہیں، توحید کے اتحاد آموز تقاضے اقبال نے ایک اردو قطعے میں یوں بیان فرمائے ہیں :-

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو　　خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے　　قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ　　وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے　　اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

جاوید نامے میں یہی بحث ایک دوسرے اسلوب سے ملتی ہے، شاعر (زندہ رود) پوچھتا ہے کہ آیا مسلمان اپنے موجودہ زوال اور اضمحلال پر خاموش رہیں، یا انقلاب حال کے لیے نتیجہ خیز جد وجہد کریں ؟ ندائے جمال سے یہ پیغام ملتا ہے کہ احیائے ملی ناممکن نہیں، اگر مسلمان توحید کے عملی تقاضے اپنا لیں تو دوبارہ سربلند ہو سکتے ہیں، توحید کے عملی تقاضے یہ ہیں کہ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک مرکز ملی (کعبہ) کو ماننے والے، اپنے فروعی اختلافی مسائل کو بالائے طاق رکھکر فکر وعمل کی وحدت و یگانگت کو اپنا شعار بنائیں۔

زندہ رود چیست آئین جہان رنگ و بو　　جز کہ آب رفتہ می ناید بجو
زندگانی را سر تکرار نیست　　فطرت او خوگر تکرار نیست
زیر گردوں رجعت او را نارواست　　چوں ز پا افتاد قومے بر نخاست
ملتے چوں مرد، کم خیزد ز قبر　　چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر
ندائے جمال زندگانی نیست تکرار نفس　　اصل او از حی و قیوم است و بس

قرب جان با آنکه گفت انی قریب | از حیات جاودان بردن نصیب
فرد از توحید لاہوتی شود | ملت از توحید جبروتی شود
بے تجلی نیست آدم را ثبات | جلوۂ ما فرد و ملت را حیات
ہر دو از توحید می گیرد کمال | زندگی این را جلال آن را جمال
چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ | با ہزاران چشم بودن یک نگہ
اہل حق را حجت و دعوی یکے است | خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است
یک نگاہی را بچشم کم مبین | از تجلی ہائے توحید است این
ملتے چوں می شود توحید مست | قوت و جبروت می آید بدست
مردۂ از یک نگاہی زندہ شو | بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدت افکار و کردار آفرین | تا شوی اندر جہان صاحب نگین

ملوکیت جسے یہاں "دالی" کے لفظ سے نمایاں کیا گیا، اقبال کی اصطلاح میں صرف شاہی نظام ہی نہیں، بلکہ ہر مستبد اور آمرانہ نظام حکمرانی (استحصالی طریق) ملوکیت کی ایک صورت ہے۔

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے | یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو | ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
شرع ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ | صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام

اقبال استبدادی اور استحصالی نظام سیاست کے بے حد خلاف تھے، اور مظلوموں کی حمایت میں انھوں نے بڑی دردمندی دکھائی ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے | قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

هنوز اندر جهان آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آن گیتی پناہ ہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است
خدا آن ملتے را سروری داد — کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بآں ملت سروکارے ندارد — کہ دہقانش برائے دیگراں کِشت

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے چار بڑے اسباب میں سے ایک یہی ملوکیت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر و کسریٰ کے سے حکمرانوں کی نابودی کا مژدہ سنایا تھا، مگر بدقسمتی دیکھئے کہ خود مسلمانوں نے آج تک قیصر و کسریٰ اپنا رکھے ہیں۔

بندۂ مومن ز قرآں برخورد — در ایاغ او نہ مے دیدم نہ درد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت — دین او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

دوسرے اسباب میں سود خواری (ناجائز منافع خوری) ملائی اور پیری مریدی ہے۔ اسلام نے تجارت کی حوصلہ افزائی اور سود خواری کی بیخ کنی کی مگر اس معاملے میں اسلام کے نام لیواؤں کا طرزِ عمل عجیب رہا ہے، انھوں نے بالعموم تجارت کو ترک کئے رکھا، اور جنھوں نے یہ پیشہ اختیار کیا انھوں نے جائز منافع پر اکتفا نہ کیا بلکہ اکثر زراندوزی اور سود خواری میں مبتلا ہو گئے، ان محدود افراد نے تو پوری اکثریت کو استحصال کا نشانہ بنا ئے رکھا۔ پیر، ملا اور شیخ و صوفی کے خلاف اقبال نے بہت کچھ کہا ہے اور یہ محض سخن گسترانہ باتیں نہیں ہیں، مگر یہ یاد رہے کہ اقبال کا ہدفِ تنقید وہ نخطاط کے

ملا و صوفی ہیں ، ورنہ اکابر علما اور انسان آفریں صوفیہ کا انھوں نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔
ترکی کے ایک معاصر روشن خیال سیاست داں شاہزادہ محمد سعید حلیم پاشا (۱۸۶۳-۱۹۲۱ء)
کے افکار بھی اسی قسم کے تھے ، چنانچہ ان کے جس مبسوط مقالے کا انگریزی ترجمہ
حیدرآباد دکن کے سہ ماہی مجلہ "اسلامک کلچر" کی سب سے پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۲۷ء)
میں شامل تھا ، اسی کے پیش نظر اقبال نے جاوید نامہ میں ، ان کا ذکر کیا ، اور ان ہی کی
زبانی دورِ انحطاط کے علمِ سو ، اور ملّائے غلط رو کے بارے میں یہ تبصرہ کیا ہے۔

دین حق از کافری رسوا تر است زانکہ ملا مومن کافر گر است
از شکر نیہائے آں قرآں فروش دیدہ ام روح الامین را در خروش
و آنسوئے گردوں دلش بیگانہ نزد او ام الکتاب افسانہ
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال و اقولش فرد فرد
دین کافر ، فکر و تدبیر جہاد دین ملا فی سبیل اللہ فساد

اس ضمن میں ارمغانِ حجاز کی دو رباعیاں قابل ذکر ہیں ، جن کا عنوان صوفی
و ملا ہے ، ان میں صوفی و ملا کی گمراہ کن تاویلاتِ قرآن کا ذکر ہے ، ان کی پست ہمتی کا
یہ حال ہے کہ مزار فروشی ان کا ذریعہ رزق ہے ، وہ لوگوں کو دوزخِ عقبیٰ سے ڈراتے ہیں ،
مگر غلامی کی دوزخ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے ، انھیں معابد و مکاتب کے فرنگی مآب
ہونے سے کوئی خوف نہیں آتا ، اور قرآن مجید ایسی سراپا حکمت کتاب کو انھوں نے
جھاڑ پھونک کا طومار بنا رکھا ہے۔

ز من بر صوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند ما را
و لے تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبریل و مصطفیٰ را

دوزخ واعظ کافرگرے گفت — حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
نداند آن غلام احوالِ خود را — کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت
مریدے خودشناسے پختہ کارے — بہ پیرے گفت حرفے نیش دارے
بمرگِ ناتمامے جاں سپردن — گرفتن روزی از خاکِ مزارے

زنگی صید بت از کعبہ و دیر — صدا از خانقاہاں رفت لاغیر
حکایت پیشِ ملّا باز گفتم — دعا فرمود یارب عاقبت خیر
بہ ہند صوفی و ملّا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یاسین او آساں بمیری

ذیل کے اشعار میں صوفی و ملا کی بے عملی، دنیا آمیز دین داری، سربزیری، دعا و کرامات فروشی اور مسائل ملی سے غفلت و بے توجہی اس قدر نمایاں ہے کہ کسی توضیح کی ضرورت نہیں،

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِّ مال و ترسِ مرگ

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

ز رومی گیر اسرارِ فقیری — کہ آں فقر است محسودِ امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے — رسیدی بر مقامِ سر بزیری

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات — ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق — آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست — خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات

بعض اشعار میں اقبال نے صوفی و ملا کے ساتھ جمود آموز شعراء کی بھی خبر لی ہے

چہ گویمت کہ چہ بودی چہ کردۂ چہ شدی — کہ خوں کند جگرم را ایازیٔ محمود
تو آں نۂ کہ مصلیٰ ز کہکشاں می کرد — شرابِ صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود
(زبورِ عجم)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

بہرحال ملاؤں اور صوفیوں کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ　　　مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　　دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے　　　مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی　　　حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور　　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار　　　شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل　　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

این نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہان است　　　ملک است تنِ خاکی و دیں روحِ روان است
تن زندہ و جان زندہ ز ربطِ تن و جان است　　　با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کی طرف اشارہ کر دیا جائے، یہ تقدیر امم کا آئینہ خانہ ہے، اس میں اقبال نظامہائے زندگی اور نظریات حکمرانی پر روشنی ڈالتے ہیں، ایک نظام انکار خدا پر مبنی ہے جو جلد یا بدیر نابود ہو جائے گا، کیونکہ الحاد ایک غیر معقول اور غیر منطقی روش ہے۔

در مقامِ لا نیاساید حیات　　　سوئے الا می خرامد کائنات

لاو الّا برگ و سازِ امتاں | نفیِ بے اثبات، مرگِ امتاں

دوسرا نظام جو حکمت فرعونی پر مبنی ہے، اور حکمراں پرستی کی تلقین کرتا ہے، یہ صرف دین و سیاست کی جدائی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دین کو سیاست کے تابع رکھتا ہے۔ پہلے نظام کی طرح یہ نظام بھی دنیا میں بہت رائج رہا ہے۔

ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ | کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
منعماں او بخیل و عیش دوست | غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست
قوتِ فرماں روا معبودِ او | در زیانِ دین و ایماں سودِ او
از نیاکاں دفترے اندر بغل | الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
دینِ او عہدِ وفا بستن بغیر | یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر
دخترانِ او بزلفِ خود اسیر | شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
از جدا مرد و زخود بیروں نجست | روزگارش نقشِ یک فرزند نیست

تیسرا نظام یعنی نظامِ حیات اقبال کا پسندیدہ نظامِ حیات ہے، انھوں نے اس مثنوی میں اسے حکمتِ کلیمی کا عنوان دیا ہے، یہ مردِ مومن کا نظامِ زندگی ہے، جس میں دین و سیاست ایک ہیں، اقبال کی تصانیف کا معتدبہ حصہ اسی نظام کی توضیح و تشریح کے لیے وقف ہے، اسی نظام نے ہر دور میں انسانیت کو نیک نام کیا، تقدیرِ امم کی پائداری اسی کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ:-

ابتدائے عشق و مستی قاہری است | انتہائے عشق و مستی دلبری است
مردِ مومن از کمالاتِ وجود | او وجود و غیرِ او ہر شی نمود

اسی طرح مثنوی، مسافر کا وہ حصہ بھی توجہ طلب ہے جس میں اقبال نے افغانستان کے سابق بادشاہ کو تقدیرِ امم کے قرآنی فلسفے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔

مولانا شاہ محمد بدرالدینؒ

از جناب مولوی عاصم صاحب قادری ندوی

شریعت و طریقت کی جامعیت اور گوناگون محاسن و کمالات کی بنا پر مولانا شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو تیرھویں صدی ہجری کے علماء و مشائخ کی صف میں بڑا امتیازی مقام حاصل ہے، زیر نظر مضمون ان کے پوتے شاہ عون احمد صاحب کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا ہے، (معارف)

مولد و مسکن | پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں، ۲ر جمادی الاخری ۱۲۶۶ھ کو یکشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی، یہیں مستقل طور پر قیام فرمایا، اور اسی کی خاک میں آسودۂ خواب ہوئے۔

تاریخ پھلواری شریف | یہ قصبہ تقریباً ہزار سال سے آباد ہے، کہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں راجہ اشوک کا باغ تھا، اسی مناسبت سے راجہ کی پھلواری کے نام سے مشہور تھا، امتداد زمانہ سے باغ کی وہ شکل باقی نہیں رہی، مگر پھلواری کا نام زبانوں پر چڑھ گیا، تو مدت تک یہ سنیاسیوں اور جوگیوں کا مسکن رہا، ایک مدت کے بعد ہندو اور جین مذہب کے خفرہ آباد ہوئے، اسلامی آبادی کی باقاعدہ ابتدا عہد فیروز شاہی میں حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوت قدس سرہ کی تشریف آوری کے بعد ہوئی، آپ جیلان سے بہار تشریف لائے،

اور حضرت شیخ الاسلام مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ کے عظیم المرتبت خلیفہ ہوئے، پیر و مرشد نے [illegible] میں پھلواری تشریف لاکر انھیں مسند ارشاد و ہدایت پر بٹھایا، ان کی تشریف آوری سے علم و عرفان کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں ان کی اولاد و احفاد میں بہت سے علما و فضلا اور فضلا پیدا ہوئے اور پورا صوبہ ان کے علم و عرفان سے منور ہو گیا، لیکن اس سرزمین کو علم و فضل کے لعل و گہر حضرت امیر عطاء اللہ جعفری المتوفی [illegible] کے دم قدم سے نصیب ہوئے، یہ اپنے والد شاہ محمد سعد اللہ کے ہمراہ دسویں صدی کے اوائل میں پھلواری آئے، شاہ سعد اللہ کے والد شاہ فتح اللہ مخدوم نور الدین ملک یار پراں متوفی [illegible] کی صاحبزادی کی اولاد میں تھے، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں مخدوم نور الدین کا تذکرہ کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ امیر عطاء اللہ وزرائے شاہی میں تھے، ابو الفضل کے اکبر نامہ میں بہ ضمن وقائع [illegible] امیر عطاء اللہ کا نام بھی ایک جگہ مذکور ہے، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں شاہان مغلیہ کے البم میں ان کا ایک مرقع موجود ہے، اگرچہ اس کی صحت یا عدم صحت کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لیکن مرقع کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہے،

"امیر عطاء اللہ جعفری وزیر ہمایوں بادشاہ"

امیر عطاء اللہ کی اولاد کے دینی و تبلیغی کاموں سے پھلواری کو بڑا شرف حاصل ہوا اور ان کے علم و عرفان کے پھولوں نے حقیقی معنوں میں اسے پھلواری بنا دیا[1] ان کے اخلاف میں مشائخ عظام، عرفائے طریق، علماء محققین، شعراء و مورخین اور ولاۃ و قضاۃ نیز ارباب خبر و بصر کا ایک ایسا سلسلۃ الذہب نظر آتا ہے، جس کے علمی و عرفانی، تحقیقی، ادبی اور تاریخی کارنامے صدیوں پر محیط ہیں، ان ہی کی اولاد کرام میں حضرت مخدوم شمس الدین

---

[1] حیات محی الملۃ والدین ص ۳ از مولانا شاہ عون احمد قادری

جنید ثانی المتوفی ۱۱۰۰ھ حضرت خواجہ عماد الدین قلندر المتوفی ۱۱۲۴ھ حضرت تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قدس سرہ المتوفی ۱۱۹۱ھ جیسے اہم اکابر اولیاء اور ملا فصیح الدین جعفری المتوفی ۱۱۰۹ھ ملا مبین المتوفی ۱۱۵۳ھ ملا وجیہ الحق محدث المتوفی ۱۱۵۰ھ تلمیذ ملا عتیق محدث بہاری، ملا وحید الحق ابدال المتوفی ۱۲۰۰ھ سید العلماء مولینا احمدی المتوفی ۱۲۵۱ھ مولانا آل احمد محدث مہاجر مدنی المتوفی ۱۱۹۵ھ اور حضرت مصباح العاشقین مولانا شاہ علی حبیب نصر المتوفی ۱۲۲۵ھ جیسے شیوخ حدیث، فقہا، اور مجددین طریقت اور حضرت شاہ ابوالحسن فرد المتوفی ۱۲۲۶ھ اور حضرت شاہ ابوتراب آشنام ۱۱۶۰ھ جیسے اصحاب دیوان شعراء ہیں،

یہ تمام حضرات اپنے علم وفضل، درس وتدریس، اور تصنیف وتالیف کی بنا پر بڑی عظیم شہرت رکھتے تھے، علماء ومشائخ کے مستند تذکروں اور تاریخی مآخذ میں ان اکابر کا تذکرہ ہے اور متعدد موضوعات پر انکی تصانیف آج بھی کتب خانہ مجیبی کی زینت ہیں،

خاندان اور سلسلۂ نسب

حضرت شاہ بدرالدین رحمہ اللہ اس خانوادۂ علم وعرفان کے گل سرسبد ہیں، جس میں چھ سو برس سے بلا فصل ارباب فضل وکمال کے ظہور کا سلسلہ جاری ہے، آبائی سلسلۂ نسب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ سے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی سیدہ زینب منسوب تھیں، ان سے حضرت علی زینبی پیدا ہوے، اس بنا پر انکی اولاد جعفری کے ساتھ زینبی بھی کہلاتی ہے، مادری سلسلۂ نسب حضرت شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔

تعلیم وتربیت

آپ نے علم وفضل کے ایسے مرکز میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں صدیوں

درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا، آپ کے بعض اکابر کا سلسلۂ علمی ایک طرف حضرت ملا نظام الدینؒ سے ملتا ہے، تو دوسری طرف شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے، اور تیسری جانب حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی تک بھی جاملتا ہے، آپ کے خانوادے کے اکثر علما معقولات میں مولانا فضل حق اور مولنا عبدالحق خیرآبادی سے بھی نسبت تلمذ رکھتے تھے، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تمام علمی سرچشموں کی یکجائی نے پھلواری کے مرکز علمی کو ایک یگانۂ روزگار جامعہ بنا دیا تھا۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین نہایت جید الاستعداد اور بالغ النظر عالم تھے، وہ متعدد اہم رسائل و کتب کے مصنف[1] کی حیثیت سے علمی حلقوں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے ممتاز فرد کی حیثیت سو عرفانی مجلسوں اور صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے ادبی محفلوں میں معروف و مشہور تھے،

ان کے پیر و مرشد شاہ علی حبیب نصرؔ عظیم محدث اور بلند پایہ مجتہد تھے اس لیے علم و فن کی تحصیل کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور درسیات کی تکمیل انھیں دونوں بزرگوں سے کرلی،

شیخ الاسلام حضرت نصرؔ کے فیضان درس سے حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات کا نہایت بلند ذوق پیدا ہوا، ان کے علاوہ دوسرے متعدد شیوخ عرب و عجم سے بھی اس کی سند حاصل کی بخاری شریف کی سب سے پہلی سند قرأت و سماعت

---

[1] عقائد نسفی کی شرح لب العقائد، تہذیب کی مختصر شرح، رسالہ رفع البابہ عند التشہد وغیرہ آپ کے مصنفات میں سے ہیں، کتب خانہ مجیبی میں آپ کا مکمل دیوان بھی ہے۔

حضرت نصیر قدس سرہ سے حاصل کی، پھر سنہ ۔۔۔ میں حصن حصین اور دیگر کتب حدیث کی سند حضرت مولانا آل احمد مہاجر مدنی قدس سرہ سے حاصل کی، سنہ ۔۔۔ میں سفر حج کے موقع پر حرمین شریفین کے جن بزرگوں سے سند حاصل کی ان میں حضرت شیخ عبداللہ صالح سنادی، سید محمد امین بن سید احمد بن رضوان، شیخ عبدالرحمٰن ابو حضیر مدنی شیخ الدلائل مولانا عبدالحق مہاجر مکی، سید محمد بن علی حریری اور سید محمد سعید بن سید محمد مغربی بحد اہمیت رکھتے ہیں،

مراجعت وطن کے بعد بذریعہ مراسلت شیخ عبدالجلیل ابن عبدالسلام برادہ شیخ محمد فالح ظاہری، شیخ عبدالحئی کتانی، شیخ سلیمان حبیب اللہ اور دیگر شیوخ حرمین و مصر و شام و بیروت سے اجازت و سند حاصل کی،

تجوید و قرأت | آپ کے بزرگوں کو تجوید کا ہمیشہ سے خصوصی ذوق رہا ہے اور اس فن کی تحصیل بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے رہے ہیں، آپ کے خلف اکبر حضرت پیر و مرشد مولانا سید شاہ محی الدین پھلواروی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس خاندان میں تجوید کا علم برابر رہا، چونکہ بزرگان اہل دل صاحب حال تھے، ان کی قرأت کا خاص اثر سننے والوں پر پڑتا تھا حضرت ملا وجیہ الحق محدث نے کلام اللہ کا ایک ایسا نسخہ تحریر فرمایا ہے، جو کل قرأتوں میں ہے، حاشیہ پر کل قرأتوں کی تفصیل ہے، جس کے سمجھنے والے اب شاذ و نادر ہیں "

* حضرت ملا وجیہ الحق محدث (تلمیذ ارشد ملا علی محدث بہاری سنہ ۱۱۳۔۔) کے دست خاص کا لکھا ہوا کلام اللہ کا یہ نسخہ کتب خانہ مجیبیہ میں اب بھی موجود ہے،

اس کی کتابت الفاظ واعراب کی صحت کے ساتھ ۵ ماہ ۲۰ دن میں تمام ہوئی سنہ کتابت ۱۲۸۷ھ ہے، بین السطور اور حواشی پر قرأت کے اختلافات اور تجوید کے فوائد موجود ہیں [۱]

مولانا شاہ بدر الدین نے بھی اس فن کی تحصیل شیخ الاسلام حضرت نصر مولانا آل احمد محدث مہاجر مدنی، اور اپنے والد ماجد مولانا شاہ شرف الدین سے کی،

خطاطی وطغرا نویسی | اگرچہ خطاطی کی باقاعدہ تحصیل نہیں کی لیکن طبعی طور پر آپ خوش نویس تھے، اور نسخ و نستعلیق دونوں خط بہت پاکیزہ تھے، طغرا نویسی کا فن منشی ولی الحق بن شیخ حمید الدین عیسیٰ پوری سے حاصل کیا تھا، آپ کے دست خاص کے بنائے ہوئے خوشنما طغرے آج بھی موجود ہیں،

مسند تدریس | اپنی خداداد ذہانت وطباعی کی وجہ سے بہت کمسنی ہی میں درسیات سے فارغ ہو گئے تھے، یوں تو جملہ علوم وفنون میں دستگاہ کامل حاصل تھی مگر حدیث وتفسیر اور علوم عرفانیہ سے خصوصی شغف تھا، اس لئے اپنے اکابر کے تتبع میں جب آپ نے خانقاہ مجیبیہ کے دار العلوم کی مسند تدریس کو زینت بخشی تو خصوصیت کے ساتھ تفسیر وحدیث اور تصوف کی کتابیں سپرد کی گئیں، غوامض علمی کی محققانہ توضیح اور تعلیم وتدریس کی دقیقہ سنجیوں کی بنا پر تھوڑے ہی دنوں میں ارباب ذوق کا ہجوم ہو گیا، آپ کے تلامذہ میں آپ کے صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدین کے علاوہ حکیم حبیب الحسنین دیسنوی برادر بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید معین الدین رضوی، حافظ انور علی مونگیری، مولانا عبد الرحمٰن بہپوری، مولانا حافظ وجیہ الدین

---

[۱] حیات محی الملۃ والدین ص ۷۵، از مولانا شاہ عون احمد قادری

ہزاری باغ اور مولانا محمد بادشاہ نواکھالی قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تدریسی مصروفیت سجادہ نشینی کے بعد بھی برقرار رہی، قرآن اور علوم احسان کی تدریس کا اہتمام جس وسیع پیمانے پر آپ نے کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس سلسلہ میں مشائخ کے مکتوبات و ملفوظات کی تعلیم کی جانب خاص توجہ بھی تھی، معارف و حقائق کے بیان میں کتاب و سنت کے نصوص ہمیشہ پیش نظر رہتے تھے،

اپنی خانقاہ میں خلوت نشین ہو کر درس قرآن کا سلسلہ سالہاسال تک بڑی پابندی کے ساتھ جاری رکھا، اتوار کے دن شائقین کا بڑا ہجوم ہوتا تھا، ان مجالس درس کے شرکاء میں آرہ، جہان آباد اور گیا کے جدید تعلیم یافتہ حضرت پٹنہ کے وکلاء بیرسٹر اور وزراء افسران جسٹس نور الہدیٰ، سر فخر الدین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس درس سے ایک طرف علماء و مشائخ میں فکر و نظر کی بلندی پیدا ہوئی تو دوسری طرف طلباء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر علم و عرفان کا ذوق پیدا ہوا،

بیعت طریقت | عرفان و تصوف کا ذوق موروثی تھا، علوم ظاہری سے فراغت کے بعد خاندانی روایت کے مطابق تکمیل باطن کی طرف متوجہ ہوئے، دو شخصیتیں آپ کے سامنے تھیں، ایک شیخ الاسلام مولانا شاہ علی حبیب نصرؔ کی، دوسری اپنے والد ماجد شاہ شرف الدین کی،

حضرت نصرؔ، مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کے جانشین اور والد ماجد خانقاہ مجیبیہ کے مجاز و ممتاز فرد تھے، حضرت نصرؔ اپنے مریدوں کو تعلیم و تلقین اور اذکار و اشغال کے لیے اکثر ان کے پاس بھیجا کرتے تھے، آپ کی ذات اقدس خانقاہ مجیبیہ کے دیگر مشائخ کی طرح جامع السلاسل تھی، مگر حضرت تاج العارفین کے عہد سے لیکر

آج تک یہاں کے مشائخ کے سلسلۂ بیعت میں قمیصیہ قادریہ وارثیہ طریقہ رائج ہے، جو حضرت محمد وارث رسول نما بنارسی کے واسطہ سے یہاں پہنچا ہے، حضرت نصر آپ کے شیخ الحدیث بھی تھے، اور حضرت تاج العارفین کے جانشین بھی اس لیے آپ کا دلی رجحان ان ہی کی طرف ہوا، اور بائیسویں سال عین عالم شباب میں ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ کو ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے،

تکمیل سلوک | جوہر معرفت طبعی طور پر آپ کے اندر موجود تھا، اس لیے مختصر عرصہ میں جملہ سلاسل کے اذکار و اشغال اور اوراد و وظائف کی تکمیل کر لی اور سخت ترین ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ تمام مقامات طے کر لئے۔

اجازت و خلافت | اپنی کم آمیزی، کم گوئی، تورع، اتباع سنت، تفکر اور مجاہدہ کی وجہ سے حلقۂ مشائخ میں شروع ہی سے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور بزرگوں کو بجا طور پر یہ توقع تھی کہ آپ کا مستقبل بہت ہی تابناک ہے، دریائے علم کی شناوری کے ساتھ بحر عرفان کی غواصی بھی کر چکے تو ۲۳ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو بغیر کسی طلب و سفارش کے شیخ الاسلام نصر قدس سرہٗ نے جملہ سلاسل مجیبیہ جنیدیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ اور تمام مرویات حدیث کی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا، اور اپنے مریدوں کو تعلیم و تلقین اور تصحیح اذکار کے لیے آپ کے پاس بھیجنے لگے، نیز خانقاہ مجیبیہ میں آنے جانے والوں کی خدمت بھی آپ ہی کے سپرد فرما دی اس سے پہلے ۱۲۸۹ھ میں آپ کے عم محترم حضرت شاہ فضل اللہ جنید ثانی مخدوم شمس الدین نے سلاسل جنیدیہ و مجیبیہ کی اجازت و خلافت مرحمت فرما کر خانقاہ جنیدیہ میں انھیں اپنا جانشین بنا چکے تھے،

مخدوم شمس الدین جنید ثانی کو ملا جمال اولیا کڑا دی الہ آبادی سے خرقہ خلافت اور سلاسل روحانی کی اجازت حاصل تھی، ان کے ذریعہ سلسلہ عالیہ قادریہ کو بہت فروغ ہوا، شاہ امان علی ترقیؔ نے انکی فیض رسانی کا اس طرح ذکر کیا ہے،

به یاد حق به خلوت خانه بنشست ۔۔۔ به مردی آمد و مردانه بنشست

جہانے کامیاب از فیض او شد ۔۔۔ که ذره آفتاب از فیض او شد

یک عالم دید فقر و عز و شانش ۔۔۔ مرید از صدق شد در خاندانش

ہزاراں از مریدان و ہوا خواه ۔۔۔ شدند از فیض ذات او حق آگاه

ہر آن طالب که شد در خانقاہش ۔۔۔ حضوری داشت در قرب الٰہش

سند اجازت وخلافت عطا کرتے وقت حضرت نصر قدس سرہٗ نے اپنے دست مبارک سے تبرکات پہنائے اتفاق سے اس وقت خوانچہ میں تسبیح تھی نہ کمر بند، اس لئے اپنی تسبیح جو آپ کے ہاتھوں میں اس وقت موجود تھی دیدی اور اپنا کمر بند اپنی کمر سے کھول کر انکی کمر میں یہ شعر پڑھتے ہوئے باندھ دیا[1]

درخدمت حق گر تو مردانہ کمر بندی ۔۔۔ بخشد بہ تو ہر لحظہ تاج و کمر دیگر

خانقاہ مجیبیہ کی سجادگی

سنہ ۱۳۰۱ھ میں جب آپ کے پیرزادے مولانا شاہ عین الحقؒ خانقاہ مجیبیہ کی سجادگی ترک کرکے قصبہ گھگنہ ضلع چھپرہ میں مقیم ہوگئے تو جانشینی کا وہ سلسلہ جو حضرت مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کی اولاد میں نسلاً بعد نسل چلا آرہا تھا منقطع ہوگیا، ہر چند کہ اسوقت شیخ الاسلام شاہ نصر کے متعدد خلفاء موجود تھے، مگر چونکہ انھوں نے علمی و روحانی کمالات کی بنا پر اپنی زندگی ہی میں مریدین کی تعلیم و تربیت

---

[1] [illegible] مولانا حکیم شعیب صاحب نیرؔ

اور خانقاہ کے نظم و اہتمام کی خدمات آپ کو تفویض کر دی تھیں۔ اس لیے تمام وابستگان خانوادۂ مجیبی نے جانشینی کے لیے آپ کا انتخاب کیا، اس طرح سنہ ۱۳۰۹ھ میں آپ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین قرار پائے اور آپ کی ذات خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ جنیدیہ کا نقطۂ اتصال ثابت ہوئی۔

تاریخ خانقاہ مجیبیہ | یہ خانقاہ مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کی نسبت سے خانقاہ مجیبیہ کہلاتی ہے۔ انکا اسم گرامی محمد مجیب اللہ اور لقب تاج العارفین، آفتاب طریقت ہے، تاریخ ولادت ربیع الثانی ۱۰۹۳ھ کو اور وطن پھلواری شریف ہے، امیر محمد حسین بن امیر عطاء اللہ کی اولاد امجاد میں تھے، متوسطات تک تعلیم اپنے پھوپھی زاد بھائی خواجہ عماد الدین قلندر سے حاصل کی، اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی فرمائی، حضرت خواجہ کی کثرت مشاغل کی وجہ سے جب اسباق میں تسلسل باقی نہیں رہا تو ان کی اجازت سے بنارس تشریف لے گیے، اور حضرت سید محمد وارث رسول نما بنارسی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں زانوئے ادب تہ کیا، اور بقیہ درسیات کی تکمیل فرمائی۔

حضرت رسول نما جس طرح علوم ظاہری میں بے نظیر تھے، اسی طرح اقلیم عرفان میں درجۂ قطب الاقطاب پر فائز تھے، مخدوم تاج العارفین نے علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تکمیل بھی ان ہی سے کی، مصنف بحر زخار کا بیان ہے

حضرت مولوی محمد وارث ساکن بنارسی　　حضرت مولوی محمد وارث ساکن بنارس کا

اصلش غازی پور است واز اقامت مرقد　　اصل وطن غازی پور ہے لیکن بنارس میں

بنارسی مشہور شد ترسل بیعت بہ سلسلۂ　　اقامت اور مزار مبارک کی وجہ سے

شاہ قیس دارودیہ رسول نما ملقب بودہ از سادات سوانہ است ،

آپ بنارسی مشہور ہیں، سادات سوانہ میں ہیں، آپکا لقب رسول نما ہے، رشتہ بیعت سلسلہ قادری قیصیہ سے رکھتے ہیں

حضرت رسول نما نے یاران کاملین کا اجتماع کر کے اپنی طرف سے بھی خرقہ پہنایا، اور تمام سلاسل کی تحریری اجازت اپنے دستخط اور اپنی مہر سے مزین فرما کر عطا کی،

حضرت خواجہ کی وفات کے بعد سنہ ۱۱۶۳ھ میں جب پھلواری شریف واپس آکر اپنے مسکونہ مکان کے ایک کمرے میں یاد الٰہی اور اذکار و اشغال کے لیے معتکف ہوئے تو یہ بیت الشرف مرجع خلائق ہوا، وفات کے بعد یہ خلوت خانہ اور گرد و پیش کی ساری عمارتیں، خانقاہ مجیبیہ کے نام سے موسوم ہوئیں،

حضرت تاج العارفین کو ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا رسول نما، آفتاب طریقت اور شیخ الزمان کہا کرتے تھے، بارہویں صدی کے تمام تذکرے ان کے محامد و مناقب سے معمور ہیں ،

مصنف بحر زخار رقم طراز ہیں ،

شاہ مجیب اللہ ساکن پھلواری است از پٹنہ چہار کروہ سمت مغرب بیعت بہ سلسلۂ قادریہ داشت میر جان علی فرزند سید عبد الواحد بلگرامی بہ گزارد کرمن بخدمت آنحضرت رسیدہ ام از شایت ضیق

شاہ مجیب اللہ پھلواری کے رہنے والے ہیں جو پٹنہ سے چار کروہ دور پچھم کی جانب واقع ہے آپ کی بیعت سلسلۂ قادریہ میں ہے، میر جان علی فرزند سید عبد الواحد بلگرامی بیان کرتے ہیں کہ میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تو نہایت عبادت

وجودش تو دہ نور بود از غایت صفائی قلب آئینہ جہان نما در بغل داشت اظہار محامدش زائد از امکان تحریر و بیان کمالاتش بیرون از تقریر۔	سے آپ تودۂ نور معلوم ہوتے تھے، حد درجہ صفائی قلب کی وجہ سے اپنے پہلو میں آئینۂ جہان نما رکھتے تھے آپ کے محاسن امکان تحریر سے فزوں تر اور آپ کے کمالات حد بیان سے باہر ہیں،

حضرت شاہ بدرالدین اسی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، جو پونے تین سو برس سے سرچشمۂ ارشاد و ہدایت ہے،

حضرت تاج العارفین کو اپنے آبائی سلاسل کے علاوہ دیگر بے شمار روحانی سلاسل میں بھی اجازت حاصل تھی، آپ کا آبائی سلسلہ، سلسلۂ قادریہ قلندریہ تھا، مگر حضرت رسول نما بنارسی قدس سرہ کی خواہش کے مطابق آپ اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسند ارشاد پر متمکن ہوئے، اس لیے آپ کی تبعیت میں جملہ سجادہ نشینان خانقاہ مجیبی آپ کے جانشین ہوتے ہیں، اور آپ ہی کی نیابت میں فرائض ارشاد طریقت انجام دیتے ہیں، حضرت شاہ بدرالدین رحمہ اللہ بھی اسی حیثیت سے ۸ر ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ میں سجادۂ مجیبی پر رونق افروز ہوئے،

خانقاہ مجیبیہ کے مشائخ بہ نیت اعتکاف عزلت نشین ہو جاتے ہیں، پھر سفر مباح کی اجازت نہیں رہتی، ارشاد و ہدایت کے تمام امور اسی خلوت سے انجام دیتے ہیں، لیکن یہ گوشہ نشینی شرعاً فرض و واجب نہیں ہے، جب خروج شرعاً فرض یا واجب ہوگا تو اس وقت گوشہ نشینی سے نکلنا ضروری ہوگا[1]

---

[1] حیات محی الملۃ والدین ص ۱۱۳، مولانا شاہ معین احمد صاحب قادری

آپ کے دور میں خانقاہ مجیبیہ مرجع خلائق ہوگئی اور سلسلۂ مجیبیہ ہندوستان کے اطراف و جوانب کے علاوہ افغانستان، حجاز، عراق، شام اور افریقہ تک پہونچ گیا، آپ کی شخصیت بڑی پرکشش تھی، آپ کی خدمت میں عام ارادت مندوں کے علاوہ علماء و مشائخ بھی استفاضہ کے لیے حاضر ہوتے تھے، اربعین (چلہ) میں بیٹھنے والوں کی خاصی تعداد موجود رہتی اذکار و اشغال کے ساتھ قرآن مجید اور مکتوبات صدی کا درس بھی دیتے تھے، باہر کے لوگ خطوط کے ذریعہ استفادہ کرتے تھے، یہ مکتوبات علم و عرفان اور تحقیق و اجتہاد سے لبریز ہیں، نیز ان کے اندر اس زمانہ کے سیاسی و ملی حالات اور دنیائے اسلام کے واقعات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، حکیم شعیب نیر رضوی نے ان مکتوبات کا ایک حصہ مرتب کرکے کئی جلدوں میں لمعات بدریہ کے نام سے شائع کر دیا۔

عارف محقق ان مکتوبات میں علمی خواہ عرفانی مباحث ہوں سب میں ان کا مجتہدانہ رنگ نظر آتا ہے، . . . . . تصوف کے حقائق اور احسان و سلوک کے رموز پر آپ کی نگاہ محرمانہ تھی، آپ نے اس کے علمی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے بارہ سو سالہ علمی لٹریچر کا بھی وسیع مطالعہ کیا تھا، اور اس کی تمام روایات کا سراغ قرآن و سنت کے سرچشموں میں پا لیا تھا، جہاں کہیں ادہام کا غبار نظر آیا، آپ نے آب تحقیق سے اُسے صاف کر دیا۔ کسی سائل نے استفسار کیا کہ

کیا انا احمد بلا میم صحیح حدیث ہے؟ اگر حدیث نہیں تو کیا یہ ان باتوں میں ہے، جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں؟"

اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"یہ صحیح حدیث نہیں، موضوع (جعلی) ہے، صوفی تو اہل علم ہوا کرتے ہیں

ان کا قول ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث رسول، بانی دونوں کے خاص انوار ہیں، جن سے وہ پہچان لی جاتی ہیں، کلام اللہ کا نور، احادیث نبوی سے ممتاز نظر آتا ہے اور احادیث کا نور، دوسروں کے اقوال سے الگ محسوس ہوتا ہے، احادیث موضوع اپنی ظلمت سے پہچانی جاتی ہیں، محدثین محققین جنکی عمر خدمت احادیث شریفہ میں زیادہ گذری ہے، ان کو بھی ایسا ملکہ پیدا ہوتا ہے کہ موضوعات کو سنتے ہی پہچان لیتے ہیں، حاصل کلام یہ کہ صوفیہ کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے، جاہل متصوفین جو جا بیجا توحید کے مشرب کی باتیں کیا کرتے ہیں، (حالانکہ وحدۃ الوجود کا علمی مسئلہ بھی ان کی سمجھ سے باہر ہے) وہی اس جملہ انا احمد بلا میم کو حدیث کہتے ہیں"

پھر سینہ بہ سینہ چلی آنے والی باتوں کے متعلق آپ کی محققانہ وجراٗت مندانہ وضاحت ملاحظہ ہو۔

"صوفیوں میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی باتیں کوئی خلاف شریعت نہیں ہیں، یہ دو قسم کی باتیں ہیں، اول وہ مرویات جو ان کو اپنے شیوخ کی روایت سے مسلسل پہنچی ہیں، دوم ان کے الہامات وانکشافات، اول قسم یعنی صوفیوں کی مرویات جو انکو اپنے شیوخ کے سلسلے سے پہونچی ہیں، ان میں سے کوئی روایت خلاف شریعت نہیں ہے یعنی شریعت کے احکام جو فرض وسنت اور حلال وحرام کے متعلق ہیں، ان کے خلاف ان کی روایت کوئی بھی ایسی نہیں کہ کسی چیز کی فرضیت، یا سنت ہونے کا انکار کرے، یا غیر فرض کو فرض کہدے یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام بتادے، دوسری

قسم صوفیوں کے انکشافات و الہامات ہیں، اس کی بھی حالت یہ ہے کہ
وہ مسائل متفقہ فقہی و عقائد صحیحۂ اہل سنت کے خلاف نہیں، کیونکہ کشف
اولیاء اللہ کا معیار یہ رکھا گیا ہے کہ اگر وہ کتاب و سنت کے موافق
نہوں تو غلط اور باطل ہیں، یہ انکشافات اکثر احکام شریعت کے معانی
و اسرار کے بیان میں ہوا کرتے ہیں، جو سب عین شریعت ہیں نہ خلاف
شریعت، البتہ بعض باتیں نفس شریعت کے خلاف تو نہیں لیکن علمائے
شریعت کے قول کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً علما نے ایک حدیث کو ضعیف
بتایا اور اہل کشف کے نزدیک ان کے کشف سے وہ حدیث صحیح
و قوی ہے یا اس کا عکس تو یہ کوئی نقصان کی بات نہیں، علما میں خود
بہت سی حادیث کے ضعف و صحت میں باہم اختلاف ہے۔"

عرفانی علوم کی متعدد اصناف ہیں، اہم ترین صنف وہ ہے جس میں تصوف
کے اساسی اصول و نظریات بیان کئے گئے ہیں، ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ
یہ نظریات غیر قرآنی ہیں، اور تصوف کے علمی و فکری سرمائے کے متعلق بھی بعض
لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ قرآن سے زیادہ فلسفۂ اشراق کی ترجمانی کرتا ہے،
یہ طبقہ اپنے ثبوت میں صوفیہ کی کتابوں کے وہ اقتباسات پیش کرتا ہے جو بادی النظر
میں قرآنی تعلیمات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، حضرت شاہ بدر الدین رحمۃ اللہ
علیہ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے تصوف کی امہات کتب میں اس تدلیس،
اضافے اور مسخ حقائق کی مدلل نشاندہی کی ہے، جو ہر عہد میں ہوتی رہی ہے
تدلیس و تلبیس کی یہ نشاندہی آپ کے عمیق مطالعہ، وسعت نظر اور اجتہادی بصیرت

پستہ ونچی ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی بیشتر تصانیف خصوصاً فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا شمار تصوف کی اعلیٰ ترین کتابوں میں ہوتا ہے، ان کے متداول نسخوں کے سرسری اور سطحی مطالعے نے بے شمار مغالطے پیدا کئے ہیں، عقائد صوفیہ پر حرف گیری کرنے والے ان ہی نسخوں کی عبارتوں سے استدلال کرتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق کرکے ان غلطیوں کو واضح کیا، اور فرمایا،

یہ سارے مضامین غلط ہیں، اور شیخ اکبر کا دامن اس سے پاک ہے، اس قسم کے مفوات بد مذہبوں نے ان کی تصانیف میں بڑھادی ہیں، جیسا کہ امام عبدالوہاب شعرانی کتاب الیواقیت والجواہر میں لکھتے ہیں:"

وجمیع ما عارض کلامہ ظاہر	ان کا وہ سارا کلام جو ظاہر شریعت
الشریعۃ وما علیہ الجمہور	اور جمہور کے خیال کے معارض
فہو مدسوس علیہ کما	ہو تو وہ پوشیدہ بڑھایا ہوا ہے
اخبرنی بذالک سیدی	جیسا کہ میرے سردار شیخ ابوطاہر
ابوطاہر المغربی نزیل مکۃ	مغربی نے اس کی خبر دی وہ مکہ
المشرفۃ ثم اخرج لی	مشرفہ میں وارد تھے بعد اس کے
نسخۃ الفتوحات التی	انھوں نے میرے دکھانے کے لئے
قابلہا علی نسخۃ الشیخ	فتوحات کا نسخہ نکالا جس کا انھوں
التی بخطہ فی مدینۃ	نے اس نسخہ سے مقابلہ کیا تھا جو

قونیہ فلما ان فیھا ما لیس	بخط شیخ کا لکھا ہوا شہر قونیہ میں
وقفت فیہ وحذفتہ	ہے، میں نے اس چیز کو اس میں د
حین اختصرت الفتوحات	دیکھا، جس پر توقف میں نے کیا تھا
	جب میں نے فتوحات کا اختصار
	کیا تو اس کو حذف کر دیا،

اس کے بعد مذہبون کے فریب کو بیان کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مرض موت میں ان کے تکیہ کے نیچے برے عقائد پوشیدہ لکھکر رکھدیئے تھے، اگر ان کے اصحاب ان کے عقیدۂ صحیحہ سے واقف نہ رہے ہوتے تو بڑا فتنہ ہو جاتا۔

صاحب قاموس مجدالدین فیروز آبادی کے نام سے امام ابوحنیفہ کے رد میں اور ان کی تکفیر میں ایک کتاب پوشیدہ رکھ کر ابو خیاطمنی کو دی، انھوں نے شیخ مجدالدین کے پاس اس کو بھیجدیا، اور ملامت کی، شیخ مجدالدین نے لکھا کہ اس کتاب کو جلادو میرے دشمنون نے مجھ پر افترا کیا ہے، میں امام ابوحنیفہ کے عظیم معتقدین میں سے ہون ان کے مناقب میں ایک کتاب میں نے لکھی ہے،

امام غزالی کی احیاء العلوم میں بہت سے مسائل کی تحریف کر دی، ایک نسخہ اس قسم کا قاضی عیاض کے ہاتھ پڑا جس کو دیکھ کر انھوں نے اس کتاب کو جلادیا پھر اپنی کتاب البحر المورود کی نسبت لکھا ہے کہ اس میں کچھ برے عقائد لکھکر تین برس تک مکہ معظمہ اور مصر میں مغربی لوگ شائع کرتے رہے، حالانکہ میں اس سے بری ہون خلاصہ مطلب یہ کہ شیخ اکبر کی طرف جتنے ایسے مسائل منسوب کئے جاتے ہیں جو کتاب وسنت اور جمہور اہلسنت کے خلاف ہیں، وہ شیخ اکبر پر افترا اور بہتان

ہیں، خواہ وہ فصوص میں ہوں یا فتوحات میں یا اور کسی تصنیف میں ۔"

سائلین کے جواب میں ان امور کے متعلق حضرت کے محققانہ بیانات سے ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، ان مسائل پر اس وسعت سے کلام فرمایا ہے کہ ایک کتاب تیار ہو گئی ہے، جو فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے مطالعہ کے لیے ایک محققانہ مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان جوابات کے جامع اور وسیع علمی مواد کے پس منظر میں عرفانی علوم کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، آپ کبھی سائل کے سوال کو اس کے الفاظ کی ظاہری سطح پر نہ رکھتے بلکہ تجزیہ کرکے اس کے تمام مضمرات و مقدرات کی بھی تشریح فرما دیتے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جاتا تحقیق کا یہی بلند معیار متصوفانہ شعور کی تربیت میں بھی نمایاں تھا کسی عارفانہ نکتہ کو ذہن نشین کراتے ہوئے اکابر کے اقوال کی توضیح اور رفع تعارض و تطبیق کے بعد اپنی منفرد تحقیق بیان فرماتے اور اس تحقیق کا مدار قرآن یا سنت نبوی پر ہوتا، محقق شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے حضرت کی تحقیقات میں بھی اکثر ایسے مقامات آتے ہیں کہ آپ اقوال اکابر کے ناقدانہ مطالعہ کو داعیۂ تحقیق تصور فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ آپ مسلکاً حنفی تھے، مگر فقہی احکام و جزئیات میں تقلید محض کے بجائے اجتہاد سے کام لیتے تھے، علمائے اصول نے تحقیق مناط کے لیے مصالح و علل اور اسرار شریعت کے جس حکیمانہ ادراک کو ضروری قرار دیا ہے وہ آپ کو حاصل تھا، آپ کے اجتہادی فتاویٰ میں ائمہ فقہ و اصول کی دقت نظر اور نکتہ رسی نمایاں ہے،

آپ کے شیخ بیعت حضرت نصر قدس سرہٗ بھی اسی بلند منصب پر فائز تھے، اور کبار علما انکی اس جلالت شان کے معترف تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے اس امتیاز کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں مجتہد فی المسائل لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اولیاء کرام اپنے تزکیۂ باطن، فہم رسا اور تفقہ کی بنا پر براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس نور کرتے ہیں، اور حدود اللہ سے سر مو تجاوز نہیں کرتے۔ کامل اتباع سنت اور دینی استقامت کی بنا پر ان کو ایسی بصیرت حاصل ہو جاتی ہے، کہ وہ شریعت میں بجا طور پر اجتہاد اور تفریع احکام کر سکیں، وہ فاسے طریق صرف ان ہی امور میں تقلید کرتے ہیں، جنکی صراحت شریعت نے کر دی ہو، یا جن پر اجماع ہو چکا ہو۔ علامہ عبد الوہاب شعرانی کہتے ہیں۔

واعلم رحمک اللہ تعالیٰ	جان لو خدا تم پر رحم کرے صوفی درحقیقت
ان حقیقۃ الصوفی فقیہ	فقیہ ہوتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہو اسکے
عمل بعلمہ لا غیر علی	سوا کچھ نہیں پس اللہ تعالیٰ اس کو اپنے
دقائق الشریعۃ واسرارھا	علم کا وارث گردانتا
حتی صار احدھم مجتہد	ہے، اور دقائق شریعت اور
فی الطریق و الاسرار	اس کے اسرار کی اطلاع دیتا
کما ھو شأن المجتہدین	ہے، یہاں تک کہ ان میں کا
فی فروع الشریعۃ لذالک	کوئی ایک طریقت اور اسرار
شرعوا فی الطریق	کا مجتہد ہو جاتا ہے، جیسا کہ فروع
واجبات ومحرمات	شریعت میں مجتہدوں کی شان

ومندوبات ومكروهات
وخلاف الاولى كما هو
شان المجتهدين ابدا
على ما صرحت به الشريعة
واجمع عليه الامة فما من
احد منهم حق لهم قدم
الولاية الا هو مجتهد
في الطريق ليس عنده
تقليد الا بما صرحت به
الشريعة واجمع عليه
الامة[1]

ہوتی ہے، اور اسکی وجہ سے وہ
راہ طریقت میں واجبات
محرمات، مندوبات اور مکروہات
نیز خلاف اولیٰ طے کرتا ہے
اور یہ شریعت کی صراحت سے
زیادہ ہوتے ہیں، جس طرح
اسی کے مانند دوسرے مجتہدین
کیا کرتے ہیں، ان میں سے کوئی
ایسا نہیں جس کا قدم ولایت میں
قائم وثابت ہو، اور وہ مجتہد نہو
اس کے لیے تقلید سوائے ان
امور کے جن کی شریعت نے
صراحت کر دی ہے، یا جس پر
اجماع ثابت ہے، جائز نہیں۔

(باقی)

---

[1] الیواقیت والجواہر ص ۱۱ مطبوعہ مصر

بزم صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا دوسرا ضخیم ترین اڈیشن جس میں شاہ عبدالحق
نوشہ رودولویؒ کے حالات وملفوظات وتعلیمات کا مستقل اضافہ ہے،

قیمت:- ۱۶ روپیہ ۵۰ پیسہ

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات

از

عشرت افروز ایم۔ اے، کراچی،

(۳)

الہلال کی ادارت بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کا زمانہ ہندستان کے لئے بہت ہی ہنگامہ خیز تھا، اس زمانہ میں تمام ہندوستان طرابلس کی جنگ کے ہنگامہ سے پرشور ہو رہا تھا، اسی کے بعد بلقان کی لڑائی شروع ہو گئی جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسیات کا نقطۂ نظر بدل گیا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سید صاحب موصوف بھی علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست کے میدان میں اتر آئے، مولانا شبلی مرحوم اسلامی سیاسیات میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے اور وہ سب سے پہلے مسلمان عالم تھے جنھوں نے اسی جذبہ میں ۱۸۹۲ء میں ٹرکی کا سفر کیا تھا یہی اثر ان کے شاگردوں پر تھا جب ۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالا تو اس کی آواز گویا مولانا شبلیؒ کے دل کی آواز تھی، اس لئے سید صاحب موصوف ندوہ سے درس و تدریس اور الندوہ کی سب ایڈیٹری چھوڑ کر الہلال کے اسٹاف میں جون ۱۹۱۳ء میں داخل ہو گئے، الہلال میں ادارہ کی طرف سے جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان میں لکھنے والوں کے اسمائے گرامی درج نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سید صاحب موصوف کے کتنے مضامین شائع ہوئے، مگر ان کے جن مضامین کا پتہ چلا ہے،

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مضامین کو لکھتے وقت وہ ابوالکلام کے انداز تحریر سے متاثر تھے۔ الفاظ کی شوکت، بیان کی جزالت، اور تحریر کا خطیبانہ انداز وہی ہے جس کی وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔

سنہ ۱۹۱۳ میں کانپور کی مسجد کے کچھ حصے شہید ہوئے تو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ایک آگ لگ گئی۔ سید صاحب موصوف نے بھی متاثر ہو کر الہلال میں ایک بہت موثر مقالہ "شہید اکبر" کے عنوان سے لکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اس مقالہ کو سیاہی سے لکھنے کے بجائے خون جگر سے تحریر کیا ہے۔ الفاظ کے بجائے کاغذ کے صفحہ پر اپنے لخت ہائے جگر بکھیر دیئے ہیں، ہر ہر سطر میں اندوہ و غم، رنج و الم کرب و بے چینی کا ایک طوفان بپا نظر آتا ہے، ملک میں اس مضمون کی اشاعت سے تہلکہ مچ گیا، یہ اس قدر پرجوش تھا کہ حکومت نے اس کو ضبط کر لیا، الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، مگر اس کا طرز بیان اس قدر مختلف تھا کہ خود مولانا شبلی اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ یہ سید صاحب کے رشحات قلم کا رہین منت ہے۔ (دیکھو مکاتیب شبلی ص ۹۷)

شہید اکبر کے عنوان سے ایک مضمون

اس مقالہ کی ابتدا فارسی کے کچھ اشعار پھر کلام پاک کی آیتوں سے ہوتی ہے، اس کے بعد سید صاحب رقمطراز ہیں :-

"زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہئے لیکن کس کا ؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے ؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے ؟ مسلمانوں کے، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے، مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے۔ خون چاہتی ہے، کس کا ؟ مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا، اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں؟ وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے، لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے؛ وہ تیری محبت و وفاداری کا امتحان لیتی ہے:

ع :۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمالیہ! تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تیز و تند ہوا کو روک دیتا ہے۔ تو پُر غیظ و غضب بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے خون و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا ہے؟"

مشہد اکبر کی تصویر کھینچتے ہیں:۔

"وہ نہایت عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم نم، و با دل پُر غم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بیکسی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی، اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیر کعبہ ابراہیم اور اسماعیل کی زبان پر جاری تھی یعنی پروردگارا ہماری طرف سے ہماری ان چند اینٹوں کو قبول کر، تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے،

یہ پاک و مقدس منظر ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائیلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج اپنی بندوقوں سے دھڑا دھڑ گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے، پردہ جب چاک ہوتا ہے میدان میں خاک و خون

بستر پر پڑی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں۔ جن میں بعض جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ رہی ہیں"

آگے چل کر ساری قوم کی طرف سے مقتولین کا ماتم کرتے ہیں :۔

"ہندوستان لرزتا ہے کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے، کون ہے جو اس کی فریادرسی کو آمادہ ہو،

مقتولین کانپور، تم پر نماز نہیں پڑھی گئی، کہ تم مغفور تھے، ہم گنہگار تمھاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہیں ملا، گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمھارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے، غزوۂ بئر معونہ میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں، ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفاء راز کے لئے اگر پولیس نے تمھاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمھاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوانِ الٰہی ان کا منتظر تھا،

مجروحین کانپور، تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمھارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے تمھاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمھارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے، تمھیں یاد ہوگا، کہ فرات کے کنارے بھی، اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا، جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا،

"ولن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا"

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ پھولو! تمہیں کس نے مرجھا دیا، حریف بیشرم کے الفاظ طعن نے تمہارے بے گناہ و ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا، تم اٹھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو، اے طائران قدس اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبار کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لئے تنبیہ و عبرت نہ تھی، قدرت نے خون کی سرخ تحریروں میں ہمیں نامۂ عبرت و دستور تنبیہ بھیجا، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہ اور عبرت حاصل کی۔"

پورا مقالہ اسی رنگ میں قلمبند کیا گیا ہے جو سید صاحب کے قلمی جوش و خروش اور حزن و ملال کی اعلیٰ مثال ہے، مگر یہ ان کا اصلی رنگ نہیں، ان کے اشہب قلم کی یہ جولانیاں آئندہ کسی دوسری تحریر میں دیکھنے میں نہیں آئیں، وہ الہلال کی ادارت میں شامل تھے اس لئے الہلال کے اور مضامین کے رنگ میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھا گئے۔

الہلال میں سید صاحب کے اور بھی مضامین شائع ہوئے، وہ خود کراچی کے رسالہ مستقبل (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرماتے ہیں،

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے، اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کو شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ مضامین، حریت فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص نمل، اسرائیل اور شہدائے اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں۔"

اخبار مدینہ (بجنور) کے ایک مجلہ ری مضمون نگار نے اس کے بیسیوں کا ضمیمہ کر کے

یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ شہید اکبر کا مضمون سید صاحب کا ہو نہیں سکتا، سید صاحب کے شاگردوں کے حلقہ میں یہ مضمون پڑھا جاتا تھا، اور ایک خاص قسم کی ہنسی کے ساتھ اس کو علیحدہ کر دیا جاتا تھا، کہ قلم کا اگر سینہ واقعی ہوتا تو اس کو قلم کی سینہ زوری ہی کہا جا سکتا تھا، کچھ اور حلقہ میں یہ بحث چل رہی تھی کہ شہید اکبر کس کا مضمون ہے، شہید اکبر کوئی ایسا مضمون نہیں جو اگر سید صاحب سے چھین لیا جائے، تو ان کے رتبہ میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی، یا اگر یہ مولانا ابوالکلام سے منسوب کر دیا جائے، تو ان کا رتبہ اس سے زیادہ اونچا ہو جائیگا، جیسا کہ ان کا واقعی ہے،

الہلال کے اور دوسرے مضامین میں سید صاحب کی تحریر کا یہ رنگ تھا،

> دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک عربی بادشاہ کا ظہور ہوا جس نے اپنے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کی بنیادیں ہلا دیں، تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر خیرا ہی کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں، اور استقلال و ملت و حریت خیال مدائے شرف و احترام نفس، مساوات حقوق اور ابطال شاہنشی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا میں پھیل گئی، شاہان عالم مرتبۂ قدوسیت سے اتر کر عام سطح انسانی پر آگئے، اور عام انسان سطح غلامی وحیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے، اور بقول مشہور مورخ گبن:
>
> تو اسے عمل وزندہ دلی جو صومعوں اور خانقاہوں میں پڑی سو رہی تھیں، عسکر حجاز کی آواز دہل سے چونک پڑی، اور اسلام کی اس نئی سوسائٹی کا ہر ممبر حسب استعداد و فطرت و حوصلہ اپنے اپنے مرتبے پر پہنچ گیا،

(۱) الحریۃ فی الاسلام ۲ ر جولائی ۱۹۱۳ء ص ۱۰ و ۹)

اوپر کے اقتباس میں جہاں سید صاحب کے حب رسول کا اظہار ہوتا ہے، وہاں ان کے قلم کا زور بیان بھی عیاں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں قدرت کی طرف سے اس لئے ودیعت ہوئی تھیں، کہ وہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف بن کر دینی اور دنیاوی سعادت حاصل کریں،

دکن کالج پونا میں لکچراری | حضرت سید صاحب الہلال کے اسٹاف میں زیادہ دنوں نہیں رہے وہاں سے وہ دکن کالج پونہ میں عربی وفارسی کے لکچرار مقرر ہوکر چلے گئے، اسی زمانہ میں نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے سیرۃ عائشہؓ لکھنے کی فرمایش کی، یہ کام مولانا شبلی نے سید صاحب موصوف کے سپرد کیا، اس سلسلہ میں لائق شاگرد کو لائق استاد کی یہ نصیحت تھی کہ

"حضرت عائشہؓ کے اجتہادات فقہی اور کلامی کو زور کے ساتھ لکھنا چاہئے یعنی طرز استدلال اور بیان اور عبارت سب پر زور ہو" (مکاتیب شبلی ص ۱۰۰)

اسی نصیحت کو ذہن میں رکھ کر آیندہ چل کر سیرۃ عائشہؓ لکھی گئی، اور جب سید صاحب نے اپنی مشغولیتوں کی بنا پر سیرت عائشہؓ لکھنے کے کام کو اپنے دوست مولانا عبدالسلام ندوی کے حوالہ کرنے کو لکھا تو مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ

"اُن کی (یعنی مولوی عبدالسلام کی) زبان ادب آشنا نہیں"

جن الفاظ میں یہ سید صاحب موصوف کی تحریر اور انشاء کی تعریف تھی، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کی تحریر زبان ادب، تہذیب، سنجیدگی، متانت اور وقار کی حامل ہوتی، اور یہی اُن کی انشاء پردازی کا سب سے بڑا وصف ہے، سید صاحب موصوف کے اسی وصف کی بنا پر مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں اپنے محبوب شاگرد کو لکھتے ہیں،

"افسوس عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، ابھی تم اور دنیا کے تمام کام ہوتے

فارغ ہونا تو تعیین لکھنا" (۱۸ / فروری ۱۹۱۳ء)

مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی سوانح نگار مولوی نذیر احمد مرحوم، مولانا شبلی کی سوانح لکھنا چاہتے تھے، سید صاحب سے مولانا شبلی کے حالات پوچھے تھے، سید صاحب نے ان کی سفارش مولانا شبلی سے کی تھی، مذکورۂ بالا مکتوب اسی کے جواب میں لکھا گیا ہے، سید صاحب موصوف نے اپنے استاد کی اس وصیت کو اب پورا کر دیا ہے، جیسا کہ آئندہ صفحات میں ذکر آئے گا،

مئی یا جون ۱۹۱۴ء کے مشرق گورکھپور میں ایک بزرگ نے مولانا شبلی پر اعتراضات کا سلسلہ لکھنا شروع کیا تھا، اس کے جواب میں سید صاحب موصوف نے ایک مضمون لکھا، اس سلسلہ میں مولانا شبلی سید صاحب موصوف کو لکھتے ہیں،

"مشرق کا مضمون تو بہت ہی زور اور پُر از لطافت ہے"

(۱۵ / جولائی ۱۹۱۴ء مکاتیب شبلی ص ۱۱۳)

سید صاحب موصوف کی علمی و ادبی صلاحیت کی یہ سند استاد نے اپنی وفات سے چند مہینے پہلے دی، اور آگے چل کر زمانہ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ سید صاحب کے ہر مضمون اور اُن کی ہر تصنیف کی تحریر پر زور اور پُر از لطافت دونوں رہی،

دارالمصنفین اعظم گڈھ کا تخیل

مولانا شبلی اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے ایک علمی ادارہ قائم کرنے کے لئے بہت بیتاب اور مضطرب تھے، انھوں نے ۱۹۱۰ء کے دارالعلوم ندوہ کے سالانہ اجلاس میں اپنی رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی تھی، کہ ایک ایسا کتب خانہ جمع کیا جائے جس میں علوم مذہبیہ کے متعلق نادر اور بیش بہا تصنیفات موجود ہوں جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو جس میں ہر فن کے متعلق ندوہ تمام کتابیں

موجود ہوں، جو اس فن کے دورِ ترقی کے مدارج ہیں جن میں قدما رکے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو تاکہ ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہلِ قلم اس سے فائدہ اٹھاسکیں، اس قسم کا کتب خانہ قائم کرنے اور اس کے ساتھ ایک علمی جماعت پیدا کرنے کی لگن مولانا شبلی کے دل میں اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ وہ اردو کا دامن اسلامی علوم و فنون سے بالکل خالی پا رہے تھے، علوم دینیہ میں مثلاً تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، تصوف اور کلام پر اردو میں کوئی عمدہ، مستند اور جامع تصنیف نہیں تھی، مسلمانوں کے لٹریچر، مسلمانوں کے تہذیب و تمدن، مسلمانوں کی تاریخ، مسلمانوں کے فلسفہ، مسلمانوں کے طبیعیات، اور مسلمانوں کے جغرافیہ وغیرہ پر اردو زبان میں تحقیق و ریسرچ کرنے کا کوئی سامان میسر نہ تھا، یورپ کے مستشرقین اسلامی علوم و فنون پر پرانی کتابیں شائع کرکے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے پردہ میں اسلام، داعیِ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر خوش اسلوبی سے حملہ کرکے سخت نقصان بھی پہنچا رہے تھے، مولانا شبلی اس زہر کا تریاق پیش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان تمام مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک علمی ادارہ دارالمصنفین کے نام سے قائم کرنے کی فکر میں تھے، مگر ملک کی عام ناقدردانی، اور مالی ذرائع کی کمی کی وجہ سے اپنے حوصلہ کو عملی جامہ پہنانے میں پس و پیش کر رہے تھے، لیکن پھر بھی ہمت کرکے اپنی اس تجویز کو ۱۹۱۳ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ ملک کے سامنے پیش کیا، ارباب علم کے حلقہ میں تو اس تجویز کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، مگر اصحابِ ثروت کی توجہ بہت زیادہ مبذول نہیں ہوئی، لیکن مولانا شبلی اس ادارہ کی تاسیس کے لئے بے چین تھے، چنانچہ اس کے لئے اپنے وطن اعظم گڈھ میں اپنا ایک وسیع باغ اور دو بنگلے وقف کئے، تاکہ یہی ویرانہ ہندوستان کی علمی کوششوں کا جولانگاہ بنے

اپنے خاص کتب خانہ کی کتابیں بھی اس ادارہ کو منتقل کردیں، اور اس کا ایک خاکہ تیار کرکے اس کے لئے موزوں کام کرنے والوں کا انتخاب کر رہے تھے، کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے،

استاد کی آخری وصیت | اپنے انتقال پر ملال سے پہلے مولانا شبلی سیرت نبوی لکھنے میں مشغول تھے، پہلی جلد لکھ چکے تھے، دوسری کی ابتداء کی تھی کہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے، اور جب اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے، تو سیرۃ نبوی کے تمام مسودے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کروا دیئے، اور عزیزوں کو وصیت کی کہ "یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیئے جائیں" پھر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان کو پونہ سے تار دے کر بلایا کہ ان کو سیرت نبوی کا پورا پلین سمجھا دیں، سید صاحب موصوف جب استاد کے پاس پہونچے تو وہ خود حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

"آہ! جب ۱۵ر نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا، اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا، کہ "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا، "اب کیا، اب کیا" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا، تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا، "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ضرور ضرور! اللہ جب اور بھی حالت خراب ہوگئی، تو زبان مبارک سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت، کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کرکے کہا، "سب کام چھوڑ کے"

نوحۂ استاد | شفیق استاد کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تو محبوب شاگرد پر بے حد اثر ہوا، چنانچہ اپنے اندوہگیں تاثرات کا اظہار حسبِ ذیل نوحہ میں کیا ہے،

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پچھلے کارواں — آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبالِ گزشتہ مقطعِ عہدِ سلطنت — شمعِ بزمِ صحبتِ آخر، نشانِ رفتگاں

غنچۂ فصلِ بہیں موجِ نسیمِ صبح دم — نغمۂ آخر سحر، مرغِ گلستانِ خزاں

علم و فن کا عشق تھا جسکی طبیعت کا خمیر — صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی — جس کی ہر فریاد تھی صوتِ درائے کارواں

جس کی ہر رائے رزیں آزارِ ملت کا علاج — جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں

جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں — جس کی رگ رگ میں تھیں سوزِ دروں کی بجلیاں

جس کے ہر مصرع میں سوزِ آتشِ غمِ دروں — جس کے ہر فقرہ میں مخفی مرہمِ دردِ نہاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رود فرات — جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریا کا سماں

پیکرِ آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ دَر — مرکبِ پروازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لئے وہ آہ ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دلفگار — جس کی دولت لٹ گئی کب اسکو دل پر اختیار

جانتا ہوں ہر بشر کو رہروِ راہِ سفر — جانتا ہوں زندگی کو اک حبابِ بے اعتبار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا — پھر دلِ اندوہگیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اس کا فقرۂ نا مختتم — "آہ سیرت! آہ سیرت! چھوڑ کر سب کاروبار"

اس طرف لب توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل — اس طرف جان مبتلائے نزع در رنجِ اقتضا

پھر نہ کیوں کس طرح پرشور ہو قلبِ مضطرب
کس طرح رک جائے خونِ نابِ چشمِ اشکبار

اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں
پوچھ لوں "اے احمدِ مختار کے سیرت نگار

تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں
کچھ طریقِ نعت سکھلا، کچھ بتا انداز کار

جب سوادِ خط ترا آئے گا آنکھوں کو نظر
کس طرح پائے گا قلبِ مضطرب صبر و قرار

اہلِ میت اک توقف! پوچھ لوں آقا سے میں
"میرے آقا میں فدا، اے در جاں مری تجھ پر نثار

تو نے فرمایا کہ تا "تاریخِ عرب" تحریر ہو
ہو چکی تعمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار
(ارض القرآن)

پھر تسکینِ دلِ بے صبر کچھ فرمائیے
میرے آقا پھر ذرا سحرِ بیاں دکھلائیے"

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں
کون پھونکے اب مری بے جان سے فقروں میں جان

مرکزِ امید جو تھا آج وہ جاتا رہا
جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں

اب پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے
پستِ مضمون کون پہنچائے گا اب تا آسماں

کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن
کون سمجھائے گا رمزِ حسنِ اسلوبِ بیاں

کون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوئے قلم
کون دیکھے گا مری جولانیٔ طبعِ رواں

کون نامہ میں کرے گا اب عزیزی سے خطاب
کس کا "تم" کہنا بڑھائے گا مری توقیر و شاں

کس کے نامہ کا بتاؤں اب میں عنوانِ خطاب
"سیدی مولائی استاذی غزالی الزماں"

اس کی مجلس تھی تماشا گاہِ اربابِ نظر
آہ اے دستِ اجل تو نے مٹایا وہ سماں

میں نے جب پوچھا بتائے اس نے ہر فن کے رموز
اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں جا کے کس کا آستاں

جب اسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی
اس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب و تواں

اس دلِ پرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر زور تھا تو اس سے تھا

تیرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر
کمسنی سے یہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر

کچھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں
رو کے پوچھے ہیں کہ کیوں ابّا نے چھوڑا ہے یہ گھر

کیا ابھی جانیں یہ خوں نابہ فشانی چشم کی
کس طرح سمجھائیں اُن کو صدمۂ داغِ جگر

نوجواں جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو
ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزمِ سفر

کس ہوس سے تو نے اُن کی تربیت فرمائی تھی
آہ کس امید سے تو نے لگائے تھے شجر

باغباں کیا رک نہیں سکتے ہو اگلی فصل تک
لوگ کہتے ہیں کہ اب کی لائیں گے یہ برگ و بر

طاقتِ پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور
اب نکل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال و پر

جب کبھی باہر ہوا جانا تو اُن سے مل گئے
وعدۂ دیدار کیوں اٹھا ہے اب کی حشر پر

ان کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی
ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لئے عزمِ سفر

اور اگر کارِ ضروری ہے تو ٹل سکتا نہیں
غرض اتنی ہے کہ ہو اُن کی یتیمی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہو دور

تو نے جب چھیڑا ہے کوئی سخت یا آسان کام
نا پسند آیا ہے اُس کو چھوڑ دینا ناتمام

مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درسگاہ
جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام

شائقِ فن کے لئے سامانِ تکمیلِ علوم
اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام

تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے
مختصر یہ تعطیلِ جمعہ انتظامِ وقفِ عام

ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور
تیرے ہاتھوں سے ابھی باقی تھا جن کو انصرام

کام اتنے ہیں بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر
[illegible] نظام

[illegible]
یا ہوا اس وقت اور عالم میں کہیں ایسا نہ ہو

کیوں ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غمخوار کا
کون ہو اب چارہ ساز اس ناتواں بیمار کا

شغل دائم جس کا تھا غمخواری دین مبین
اب وداع دائمی ہوتا ہے اس غمخوار کا

وقف ماتم جو رہا جب تک کہ اس میں جان رہی
کون اب ماتم کرے اس جان ماتم کار کا

سوگوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر
کون ہو اب سوگوار اس سوگوار زار کا

خون روئے جس نے قومی بیکسی پر تیس سال
نوحہ گر ہو کون اب اس دیدۂ خونبار کا

تھا صف میدان ملت کا وہی شمشیر زن
عرصۂ ہیجا میں ہو کون اب حریف اغیار کا

دل نہ تھا پہلو میں اُس کے پارۂ سیماب تھا
یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار کا

چارہ گر آزار قومی کا جو تھا رخصت ہوا
مدعی کوئی ہے صلا! اب چارۂ آزار کا

نے نواز داستان غم نہ تھی اُسکی زباں
اک ترانہ تھا دہن میں کنِ موسیقار کا

عالم اسلام میں تھا اک ہی روشن داغ
آہ! اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

اردو زبان میں سید صاحب نے پہلی دفعہ شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی، دل کی آواز تھی اس لئے آواز میں غم و الم، رنج و اندوہ کی پوری تاثیر ہے، اور استاذ مرحوم سے جتنے فیوض و برکات حاصل کئے تھے، اُن کی بھی مکمل تصویر ہے، عزیز لکھنوی نے اس نوحہ پر داد دی، مگر ایک شعر کے لفظ "برس" (بہ سکون الراء) پر اعتراض کیا، کہ برس (بہ فتح الراء) کے ساتھ اگر مصرع پڑھا جائے، تو یہ موزوں نہیں ہوتا، اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ صحیح لفظ برس (بہ فتح الراء) ہے، برس (بہ سکون الراء) صحیح نہیں،

سید صاحب نے اس مشورہ کو قبول کرکے اس لفظ کو اپنے شعر سے نکال دیا، نواب عماد الملک مولانا سید حسین بلگرامی نے بھی اس نوحہ کی تعریف کی، مگر انھوں نے سید صاحب موصوف

کو یہی مشورہ دیا، کہ علمی بازار میں کوئی علمی چیز اسی وقت پیش کی جائے، جب یقین ہو کہ اس بازار میں اس سے بہتر چیز پیش نہیں کی جا سکتی، اس رائے پر سید صاحب موصوف نے عمل کیا، اور مشق سخن کو جاری نہیں رکھا، یوں کبھی کبھی طبیعت موزوں ہو جاتی تو کچھ اشعار موزوں کر لیتے،

قیام دار المصنفین | استاد کی وفات کے بعد سید صاحب نے غیر معمولی ایثار سے کام لیا، پونہ کالج کی لکچراری سے مستعفی ہو کر استاد مرحوم کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشاں ہوئے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد چھ سات مہینے کے بعد جون ۱۹۱۵ء میں دار المصنفین (جو انگریزی میں شبلی اکاڈمی کے نام سے بھی مشہور ہے) قائم ہوا، اور اس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے،

(۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا (۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ (۳) اُن کی اور دیگر علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا،

حضور نظام نے اس کی مالی سرپرستی قبول فرمالی،

اس کی مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی کو تفویض ہوئی، اور خود مولانا سید سلیمان ندوی اس کے ناظم مقرر ہوئے،

تیسرا دور

رسالہ معارف کا اجرار | دار المصنفین قائم ہوا، تو سید صاحب کو سب سے پہلے استاد مرحوم کی آخری وصیت یعنی سیرت کی تکمیل کی فکر ہوئی، مگر ادارہ کو بھی ملک میں نمایاں ممتاز اور مقبول بنانا تھا، اس لئے اس کی آواز کو قوم تک پہنچانے کے لئے اس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ معارف بھی جاری کیا، جو ۱۹۱۵ء سے اب تک یکساں آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے، یہ رسالہ اپنی غیر معمولی متانت، سنجیدگی، بلند پایہ تحقیقی مضامین اور اعلیٰ طرز نگارش کی وجہ سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں سب سے زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، سید صاحب موصوف کی

شخصیت معارف کے پرچوں میں نمایاں طور سے عیاں ہوئی، وہ اگر کسی کتاب کے مصنف نہ بھی ہوتے، تو صرف معارف کے پرچے ہی اُن کو اردو لٹریچر میں زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھے، اس رسالہ میں سید صاحب کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں، کبھی تو وہ ایک صحافت نگار کے لباس میں نظر آتے ہیں، کبھی ایک ممتاز ادیب کے پیکر میں دکھائی دیتے ہیں، کبھی اُردو زبان کے بہت بڑے علمبردار کی شان میں جلوہ افروز ہوتے ہیں، کبھی ایک بے مثل مورخ کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں، اور کبھی ناقد شعر و سخن، کبھی متکلم، کبھی مفسر، کبھی محدث، کبھی صوفی اور کبھی کبھی ماہر سیاسیات بن کر اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے ہیں، اور یہ ان کا سب سے بڑا وصف کہ مختلف موضوع پر قلم کی یکساں قدرت کے ساتھ گل افشانی کر سکتے ہیں، یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا، کہ اس وقت تک ادب و انشا میں اپنے استاد مرحوم کے ہم پلہ ہو گئے تھے، مگر جہاں تک علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور تحقیق و تدقیق تفحص و تجسس کے معیار کا تعلق ہے، وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے، اور اُن کے استاد مرحوم کی روح خوش ہوگی کہ ان کے محبوب شاگرد کی وجہ سے اُن کے مشن کی تکمیل ہوئی،

معارف میں مضامین سنہ ۱۶ء سے آخر وقت تک معارف میں سید صاحب موصوف نے حسب ذیل مضامین لکھے،

روزہ: ج ۱ نمبر ۱ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء مطابق رمضان سنہ ۱۳۳۴ھ،

اکبر کا ظریفانہ کلام،

قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات، اگست سنہ ۱۶ء ج ۱ نمبر ۲

حجۃ الملۃ والدین حضرت علامہ شبلی نعمانی تغمدہ اللہ برحمتہ، اگست سنہ ۱۶ء جلد ۱ نمبر ۲

مسئلہ انتقال جائداد بنام اشخاص غیر مولود اگست سنہ ۱۶ء ج ۱ نمبر ۲

خواب تمنا دار المصنفین کا تمہیدی اعلان ستمبر سنہ ۱۶ء جلد ۱ نمبر ۳

کشفِ حقیقت (مسئلہ زوجۂ غیر متفق علیہا)
(اکتوبر ۱۶ء) جلد ۱ نمبر ۴
دار المصنفین کی ایک اسلامی خدمت یعنی
سیر الصحابہ کی تدوین و تالیف، جلد ۱ نمبر ۶ دسمبر ۱۶ء
اہل سنت والجماعت جولائی ۱۹۱۷ء
اگست ۱۷ء، ستمبر ۱۷ء
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ایک شاعر
کی حیثیت سے، (اگست ۱۷ء)
زبان اُردو کی ترقی کا مسئلہ ستمبر ۱۷ء،
حسین بن منصور حلاج کی تاریخی شخصیت
(اکتوبر ۱۷ء)
مسلمانانِ ہند کی تنظیم مذہبی (بتقریب
اجتماع فرنگی محل) (نومبر ۱۷ء)
تکملہ مقالہ اہل السنت و وصایائے حضرت
شاہ ولی اللہ دہلوی (نومبر ۱۷ء دسمبر ۱۷ء)
جنگ کا فلسفہ علمائے یورپ کے دو فرقے (ترجمہ)
دسمبر ۱۷ء،
ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں (تقریر جو
آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ
کلکتہ میں ۲۹ر دسمبر ۱۷ء کی شب کو کی
گئی،) جنوری ۱۸ء
سلطان ٹیپو کی چند باتیں (کچھ چشم دید
مشاہدات، اور کچھ تاریخی حقائق)
(فروری ۱۸ء)
ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی، (مئی
جون، جولائی، اگست ۱۸ء)
ہندو فارسی شعراء، ستمبر ۱۸ء
ہندو ادبائے فارسی، اکتوبر ۱۸ء
ہندو علمائے علوم عقلیہ نومبر ۱۸ء
ہندو اور طب و تصوف و موسیقی و مصوری
(دسمبر ۱۸ء)
نظر بندانِ اسلام (بہ تقریب رہائی
سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی)
جنوری و فروری ۱۹ء
ہمارے موجودہ نظر بندانِ اسلام (علمی
مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے) مارچ ۱۹ء
مجسمہ اور تصویر کے متعلق اسلام کا
شرعی حکم، ستمبر و اکتوبر ۱۹ء

اردو کے نئے رسالے، دسمبر ۲۵ء
محمد بن عمر الواقدی جنوری ۲۶ء
احادیث وسیر کی تحریری تدوین فروری ۲۶ء
جمعیۃ العلماء کا خطبۂ صدارت مارچ ۲۶ء
احکام القرآن اپریل ۲۶ء
حجاز کے کتب خانے، اکتوبر، نومبر،
دسمبر ۲۶ء
پھر واقدی، جنوری ۲۷ء
مسلمان حکماء اور یونانی فلاسفہ
(فروری ۲۷ء)
مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ
اپریل ومئی وجون جولائی اگست ۲۷ء
نکاح بلاولی اکتوبر ۲۷ء
مسئلہ حقوق نسواں جنوری ۲۸ء
مجلس العلمائے مدراس کا خطبۂ صدارت
(اپریل ومئی ۲۸ء)
حقوق نسواں رکھنو جون ۱۹۲۸ء
حضرت عائشہؓ کی عمر ان کے نکاح
کے وقت کیا تھی، جولائی ۲۸ء

ہندوستان میں علم حدیث، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۸ء
حضرت عائشہؓ کی عمر (مولانا محمد علی صاحب
لاہوری کے شبہات کا جواب) جنوری ۲۹ء
ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے
بعض واقعات، فروری ۲۹ء
ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب
ہندو کتابیں، جون ۲۹ء،
سنت: اگست ۲۹ء
مذہب کا قانونی حصہ ستمبر ۲۹ء
ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ کے
چند گمشدہ اوراق، اکتوبر ۲۹ء
مسلمانان ہند کا شرعی نظام دسمبر ۲۹ء
المحلی لابن حزم مارچ ۳۰ء
پھر بحث سنت جولائی ۳۰ء
منصب نبوت اگست ۳۰ء
مولانا حمید الدین رحمہ اللہ جنوری فروری ۳۱ء
وحی اور ملکۂ نبوت جولائی ۳۱ء
گلدۂ آشنا، اگست ۳۱ء
ایمان: ستمبر، اکتوبر ۳۱ء

ایام صیام پر نظر ثانی، جنوری ۳۲ء

تحفظ حقوق زوجین، مارچ ۳۲ء

رباعی، اپریل ۳۲ء

ہندوؤں کا ایک عجیب فرقہ، جولائی ۳۲ء

حکیم سنائی کے سنین عمر مارچ ۳۳ء

اردو کیونکر پیدا ہوئی جولائی ۳۳ء

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز، اگست ۳۳ء

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم، ستمبر و اکتوبر ۳۳ء

سفر افغانستان دسمبر ۳۳ء جنوری،

فروری و مارچ ۳۴ء

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم پر تبصرہ، مارچ اپریل ۳۴ء

غزنی کا سفر مئی ۳۴ء

مقر، غلزئی اور قندھار جولائی ۳۴ء

قندھار اگست ۳۴ء، قلعہ جدید و چمن ستمبر ۳۴ء

کوئٹہ اور ملتان اکتوبر ۳۴ء

ملتان سے لکھنؤ، نومبر ۳۴ء

نالندہ کی سیر فروری ۳۵ء

عربوں کی بحری تصنیفات مارچ ۳۵ء

توکل اپریل ۳۵ء

صبر کا قرآنی مفہوم، مئی

جون ۳۵ء

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار،

فروری، مارچ، اپریل ۳۶ء

اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک،

اگست ۳۶ء،

سفر گجرات کی چند یادگاریں،

ستمبر ۳۶ء

کتب خانہ حمیدیہ، دسمبر ۳۶ء

خطبۂ صدارت، ہندوستانی اکاڈیمی

اردو کانفرنس لکھنؤ، فروری ۳۷ء

ذبح عظیم مارچ ۳۷ء

قربانی کا اقتصادی پہلو، مارچ ۳۷ء

خلیل اللہ کی بشریت، اپریل مئی ۳۷ء

خطبۂ صدارت شعبۂ علوم و فنون اسلامی

جون و جولائی ۳۷ء

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان،

ستمبر ۳۷ء

ہماری زبان بیسویں صدی میں، نومبر ۳۷ء

جامعہ دارالسلام عمرآباد کا

خطبۂ اسناد جنوری ۳۸ء

مقدمۂ تفسیر جواہر فروری ۳۸ء

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم،

(اکتوبر ۳۸ء)

مقالات شبلی جلد ہشتم کا دیباچہ

(دسمبر ۳۸ء)

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،

(فروری ۳۹ء)

عرب اور امریکہ (مارچ و

اپریل ۳۹ء)

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق،

(مئی ۳۹ء)

تمہید جون ۳۹ء

نامۂ خسروی اور طرز تعبیر اختلاف نما

(اگست ۳۹ء)

خطبۂ صدارت شعبۂ اردو مسلم

ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ،

(فروری ۴۰ء)

کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی

تعلیمات سے ماخوذ ہے،

(اکتوبر ۴۰ء)

وحی از روئے قرآن اور مدعی کا

تضاد بیان، (نومبر ۴۰ء)

وحی کے اقسام (دسمبر ۴۰ء)

ابوالبرکات بغدادی اور اس کی

کتاب المعتبر (جنوری، فروری ۴۱ء)

مولانا سجاد کی یاد (مارچ ۴۱ء)

دونوں جہاں کی بادشاہی،

(ستمبر ۴۱ء)

موت العالم موت العالم،

(اگست ۴۳ء)

حیات شبلی، نومبر ۴۳ء)

دیباچہ حیات شبلی (نومبر ۴۳ء

حکیم الامت کے آثار علمیہ (فروری ۴۴ء)

قنوج مارچ ۴۴ء

خطبۂ صدارت مجوزہ اردو کانفرنس

بنگال۔ (مئی ۴۴ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، دسمبر ۱۹۴۴ء جنوری ۱۹۴۵ء

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ، (۱۲۰۶ھ بسنہ ۱۹۲۵ء) اجلاس آل انڈیا ہسٹری کانگریس، منعقدہ مدراس (دسمبر ۱۹۴۴ء اپریل ۱۹۴۵ء)

خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی منعقدہ ۱۷ صفر ۱۳۶۴ھ (مئی ۱۹۴۵ء)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں، (اگست ۱۹۴۵ء)

جامعہ حسینیہ رانڈیر میں تقریر (ستمبر ۱۹۴۴ء)

امت مسلمہ کی بعثت (سیرت جلد ہفتم کا ایک باب) اپریل ۱۹۴۶ء

مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے، (اگست ۱۹۴۶ء)

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے (نومبر ۱۹۴۶ء)

خطبۂ ارشاد طبیہ اسکول پٹنہ (دسمبر ۱۹۴۶ء)

اندراج نکاح وطلاق اور تقرر قضاۃ، مئی ۱۹۴۷ء

سیاسیات اسلام کے نظریے، (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

مذکورۂ بالا مقالات میں سے اہل سنت والجماعت رسالہ کی صورت میں شائع ہوا اور اس کے ترجمے تامل اور تیلگو زبان میں ہوئے، "خلافت اور ہندوستان" اور "خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام" بھی رسالوں کی شکل میں شائع کئے گئے، اور ۱۹۲۰-۲۱ء کی تحریک خلافت کے پرشور اور ہنگامہ پرور زمانہ میں ان کے کئی ایڈیشن نکلے، سفر افغانستان میں اس سیر وسیاحت کا ذکر ہے جب سید صاحب اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان تشریف لے گئے تھے، معارف میں یہ سفرنامہ شائع ہوا، تو لوگوں نے اس کو بہت شوق سے پڑھا، اب یہ کتاب کی شکل میں "سیر افغانستان" کے نام سے نفیس اکیڈمی حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوگیا ہے" (باقی)

مکتوب امریکہ

از

مولانا محمد رابع ندوی

مئی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی امریکہ کے مسلمان طلبہ (M.S.A.) کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے تھے، ان کے ساتھ ان کے بھانجے مولوی محمد رابع ندوی بھی تھے، انھوں نے وہاں سے ایک مفصل خط لکھا تھا جس میں امریکی مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کے بارہ میں مفید معلومات ہیں، قارئین معارف کی دلچسپی کے لئے خط کا ایک حصہ شائع کیا جارہا ہے، شروع اگست میں دونوں صاحبان بخیر واپس آگئے ہیں، قارئین کرام کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس سفر میں علی میاں کی آنکھ کا آپریشن بھی ہوگیا جو خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔

"معارف"

میں اور خال معظم امریکہ ۲۷ رمئی کو پہونچ گئے تھے، اسی روز سے انڈیانا Indiana کے شہر بلومنگٹن (Bloomington) میں .M. S. A یعنی شمالی امریکہ کے مسلم طلبہ کی جمعیت کا سالانہ اجتماع تھا، اسی لئے نیویارک سے وہاں روانہ ہوگئے، یہ اجتماع چار روز رہا، اس میں مختلف موضوعات پر تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے، خال معظم کی بھی کئی تقریریں ہوئیں، ان میں سے ایک تقریر پہلے سے باقاعدہ پروگرام میں تھی، اس کا موضوع تھا "اسلامی کام کرنے والوں کے مابین تعلقات" مسلم طلبہ کی یہ جمعیت ایک شورائی انجمن ہے اسکی

شاخیں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا میں پھیلی ہوئی ہیں، دونوں ملکوں میں تقریباً اس کی ڈیڑھ سو شاخیں ہیں، اس کا مرکزی دفتر ریاست انڈیانا کے شہر انڈیانا پولس اور "پلین فیلڈ" میں ہے، اس کے صدر و سکریٹری نیز دیگر عہدہ داروں کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے، اسی جمعیت کے تحت مسلمانوں کی ذہنی تربیت نیز دعوتی و تعلیمی مقاصد کے لئے مختلف شعبے قائم ہیں ہر ایک کی کمیٹی اور عہدہ دار ہوتے ہیں، ان کا سربراہ جمعیت کا سکریٹری ہوتا ہے، اس جمعیت کو کئی سال قبل ان طلبہ نے قائم کیا تھا، جو شرق اوسط سے یہاں پڑھنے آئے تھے، وہ اب تو یہاں سے جا چکے ہیں یا کسی دوسرے کام میں لگ چکے ہیں، لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام چل رہا ہے، ان میں قابل ذکر احمد توتنجی اور احمد صقر ہیں، اول الذکر شامی ہیں اور ریاض (سعودی عرب) میں کام کرتے ہیں اور آخر الذکر شکاگو یونیورسٹی میں استاد ہیں اور نیو یارک کے دفتر رابطہ عالم اسلامی کے سربراہ ہیں۔

اب ایم، ایس، اے نے اپنے دستور میں یہ تبدیلی کر لی ہے کہ اس کے ممبر صرف طلبہ ہی نہیں بلکہ شمالی امریکہ میں مقیم دعوتی و اسلامی ذہن رکھنے والا کوئی مسلمان بھی ہو سکتا ہے، اس لئے اب یہ نام کے لحاظ سے تو صرف طلبہ کی انجمن ہے لیکن کام کے لحاظ سے اس کا زیادہ وسیع دائرہ رکھتی ہے، یہ اپنی شاخوں کی نگرانی بھی کرتی ہے اور ان کو فکری و دعوتی کمک بھی پہونچاتی ہے، اس کی اکثر شاخیں تو وہ ہیں جو در اصل مقامی انجمنیں تھیں، اور انھوں نے اپنی تقویت کے لئے انجمن سے وابستگی اختیار کر لی ہے، اس کی شاخوں کو چیپٹر (Chapter) سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کے موجودہ صدر ایک ہندوستانی نژاد پاکستانی اور جنرل سکریٹری ایک اردنی عرب ہیں، اول الذکر کا نام یعقوب مرزا ہے [illegible] میں پی، ایچ، ڈی کے طالب علم ہیں، اور آخر الذکر کا نام محمد شدان ہے [illegible] یہاں سے

پی ایچ ڈی کر چکے ہیں، ایم ایس اے کے سکریٹریٹ میں اہم کارکنوں میں انیس احمد صاحب جمال برزنجی بھی بڑے کار پرداز افراد ہیں۔

ایم ایس اے کی اس انجمن کے علاوہ شمالی امریکہ میں بہت سی دیگر انجمنیں بھی ہیں اور یہ اکثر صرف مقامی ہیں، ان کی تعداد بھی ریاستہائے متحدہ اور کناڈا دونوں میں ملاکر سو کے لگ بھگ ہوگی، ان میں سے بعض ریاستوں اور علاقوں تک محدود ہیں اور بعض تو صرف محلوں تک محدود ہیں، بعض شہروں تک، بعض کا کام خاصا حجم رکھتا ہے اور بعض کا بہت معمولی ہے، مقامی انجمنیں عام طور پر مقامی مدد اور چندہ سے چلتی ہیں، رہیں مرکزی انجمنیں خاص طور پر ایم ایس اے، تو ان کو باہر سے خصوصی مدد لینی پڑتی ہے، اسکے بجٹ کا صرف ایک تہائی یا اس سے بھی کم حصہ ارکان کی فیس رکنیت اور مقامی امداد سے پورا ہوتا ہے۔

امریکہ میں مسلمانوں کی اب خاصی تعداد ہو چکی ہے، اندازہ ۲۰ - ۲۵ لاکھ سے کم نہ ہوگا، جن میں سے شہر نیویارک میں ایک لاکھ، ڈیٹرائٹ میں بھی ایک لاکھ اور شکاگو میں نصف لاکھ کی تعداد بتائی جاتی ہے، کیلیفورنیا کی ریاست میں بھی خاصی تعداد ہے، عام طور پر عرب، ہندوستانی، پاکستانی اور افریقی ہیں، اگر امریکہ کے کالے مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد تقریباً ڈیوڑھی ہو جائے گی، ان کالے مسلمانوں کا معاملہ ابھی تک پورا واضح نہیں ہے، یہ اس وقت دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک تو صحیح الخیال مسلمانوں کا ہے جو دراصل مالکم اکس شہید کے طریقہ پر کاربند ہیں، جنھوں نے جماعت کے مؤسس ورہنما ایلیجا محمد سے علیحدگی اختیار کر کے صحیح عقائد اختیار کر لئے تھے اور پھر ان کو برداشت نہ کیا جا سکا اور شہید کر دیا گیا، اب ان کے طریقے پر چلنے والے اچھی تعداد میں

ہو گئے ہیں اور وہ پوری طرح مسلمانوں میں شامل ہیں، ان کے لئے کسی علیحدہ جماعتی اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

رہا اصل گروہ تو اپنے موسس ایلیجا محمد کے زمانہ میں تو بہت فاسد العقیدہ تھا، ایلیجا کو نبی مانتا تھا اور جس شخص سے ایلیجاہ نے اس دین کو اخذ کیا تھا اس کو خدا کا درجہ دیتا تھا، ایلیجاہ نے اپنے کو مسلمان کہا تھا، لیکن اس کے عقائد خود ساختہ تھے اور ایک نئے عقیدہ اور نئے مذہب کے حامل تھے، ان کے بیٹے والس جو وارث الدین محمد کہلاتے ہیں، اگرچہ بڑے بیٹے نہیں ہیں لیکن اب اس جماعت کے رہنما وہی ہیں، انھوں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اپنی جماعت میں اصلاحات بھی کی ہیں اور اپنے کو مسلمانوں سے مزید قریب کر لیا ہے لیکن ابھی اپنے والد کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ اسلام کے سلسلہ میں ابھی ان کے خیالات مکمل طور پر صاف اور شبہہ سے بالاتر نہیں ہیں، اس لئے صحیح العقیدہ کالے مسلمان ان کو بے راہ سمجھتے ہیں اور دیگر مسلمانوں کے ان سے اعتماد کے ساتھ ملنے کو پسند نہیں کرتے، لیکن والس یا وارث الدین محمد اصل مسلمانوں سے خاصے قریب آگئے ہیں، کچھ عجب نہیں کہ خالص صحیح عقائد کے پوری طرح حامل ہونے کا اعلان کر دیں اور پھر وہ پردہ بھی ہٹ جائے جس نے ان کو صحیح مسلمانوں سے علیحدہ کر رکھا ہے، اس سلسلہ میں امریکہ میں مقیم دعوتی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کی کوششیں بھی جاری ہیں؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والس کی نظر میں اپنے ماننے والوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، انھوں نے اپنی جماعت کا نام "دی ورلڈ کمیونٹی آف اسلام ان دی وسٹ" رکھا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ امریکہ کے مسلمانوں کے واحد رہنما سمجھے جائیں، چنانچہ ان کا فرقہ اولاً کالے

مسلمانوں کے نام سے موسوم تھا، پھر ان لوگوں نے اپنے کو بلالی مسلمان کہنا شروع کیا اور "ورلڈ کمیونٹی آف اسلام ان دی وسٹ" کا نام دیتے ہیں، ان کا ایک آرگن "بلالین نیوز" کے نام سے بھی نکلتا ہے، ان بلالی مسلمانوں کا مرکز شکاگو میں ہے، اور ان کی خاصی تعداد اسی شہر میں رہتی ہے، کالے امریکی علی العموم امریکہ کے اکثر شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، کئی جگہ ان کے محلے کے محلے ہیں، ان کے خالص محلوں میں بھی جانا ہوا، ان کو نظم وصفائی کے لحاظ سے سفید امریکیوں کے مقابلہ میں کمتر پایا، البتہ یہ سننے میں آیا کہ حکومت کا محکمۂ نظم وصفائی ان کے علاقوں کو خاص طور پر نظرانداز کرتا ہے، کارپوریشن کو جو شکایات پہونچائی جاتی ہیں وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، لیکن اس میں مکمل تصور صرف منتظمین کا ہی نہیں ہے، کالے امریکیوں کی بھی کوتاہی ہے، ورنہ توجہ دینے والے یہاں ہمسری کے ساتھ رہتے ہیں اور کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا، البتہ پس ماندہ کالے امریکی زیادہ نظر آتے ہیں اور چھوٹے کاموں میں بھی وہ زیادہ نظر آتے ہیں۔

کالے لوگوں میں عیسائی مذہب والوں کا بھی طبقہ ہے، کالے لوگوں میں شوریدہ لوگوں کا بھی گروہ ہے جن سے امریکن سوسائٹی پریشان ہے، وہ اور ایسے سفید امریکی غیر شہری رجحانات کے حامل ہیں، بڑے سنگین اور ذلیل جرائم کرنے سے باز نہیں رہتے جن میں لوٹنا اور بآسانی قتل کر دینا معمولی بات ہے، نیویارک شہر کی بعض گلیوں اور سڑکوں پر رات کو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ وہاں قتل اور لوٹ معمولی بات ہے۔ کالے باشندوں کے تذکرہ کے ساتھ یہ بات جاننے کی ہے کہ یہ لوگ بھی امریکہ کے اصل قدیم باشندے نہیں ہیں، یہاں کے اصل باشندے سرخ ہندی "رڈ انڈین"

ہیں جن کو یہ نام ہندوستانی ہونے کے باعث نہیں دیا گیا بلکہ شخصی تصور اندازہ کی بنا پر دے دیا گیا تھا جو اب تک چل رہا ہے، یہ لوگ بڑے مظلوم ہیں، ان کو یورپ سے آئے ہوئے لوگوں نے بڑی حکمت کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم کرنے کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، ان کو محدود علاقوں میں شہروں سے علٰحدہ محدود کر دیا ہے، ان کو وظائف وغیرہ دیتے ہیں اور ان کو شراب و عیاشی کا عادی بنا دیا ہے، وہ آہستہ آہستہ اس طرح ختم ہوتے جا رہے ہیں، اب بہت کم تعداد میں رہ گئے ہیں، ان میں بعض لوگ پڑھ لکھ کر سنجیدہ شہری زندگی بھی اختیار کرتے ہیں لیکن وہ خال خال ہیں، نظر نہیں آتے، اس طرح پر اب امریکہ میں تقریباً سب باہر سے آئے ہوئے ہیں، کوئی ذرا قدیم، کوئی جدید، اور یہ اب ایک مخلوط قوم ہے، یہاں کے کالے افریقہ سے آئے ہوئے ہیں۔

ایم، ایس، اے کی طرف سے خال معظم مولانا علی میاں صاحب کے لئے شمالی امریکہ کے مختلف شہروں میں دورہ کا پروگرام بھی رکھا گیا جس میں جگہ جگہ کے مسلمانوں سے ملنے اور ان سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔

چنانچہ شکاگو، ڈیٹرائٹ، بوسٹن اور کیمبرج اور واشنگٹن، امریکہ کے مشرقی منطقہ میں اور "لاس انجلس" اور "سان فرانسسکو" مغربی منطقہ میں اور کناڈا میں مونٹریال اور ٹورنٹو جانا ہوا، ان کے علاوہ امریکہ کے اور بھی دیگر مقامات پر جانا ہوا جو اول الذکر سے کم اہمیت کے تھے، تقریباً تمام جگہوں پر سامعین ہندوستانی، پاکستانی، عرب اور امریکی مسلمان ہوتے تھے، خطاب کے بعد علی العموم سوالات کا سلسلہ چلتا تھا جن میں یہاں کے مقیمین زیادہ تر یہاں کی زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل اور مشکلات کا ذکر کرتے اور ان میں رہنمائی چاہتے، ان مسائل میں سب سے اہم مسئلہ یہاں فروخت ہونے والے

گوشت کا ہوتا، اس مسئلہ کے اہم ہونے کی ایک مزید وجہ یہ بھی ہے کہ بعض عرب علماء نے اس میں بہت سہولت کی اجازت دے دی ہے، اگرچہ اب یہاں پر بھی تقریباً ہر شہر میں مسلم ذبیحہ گوشت ملنے لگا ہے لیکن نسبتاً گراں ہوتا ہے۔ مولانا نے ذبیحہ کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ہندو پاک کے سب علماء یہی رائے رکھتے ہیں کہ اس کا ذبیحہ ہونا اور خدا کے نام پر ہونا ضروری ہے، پھر خواہ مسلمان کے ہاتھ سے ہو خواہ کتابی کے ہاتھ سے۔ اور چونکہ یہودیوں کے یہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اس لئے ان کا گوشت "کوشر" صحیح ہے۔

امریکی نظام زندگی ایسا کسا ہوا اور مضبوط ہے کہ یہاں آکر قیام کرنے والے اس سے اپنے کو علیحدہ رکھنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں، اس میں خاص طور پر تعلیم ٹیلی ویژن، شہری اور گھریلو معیشت اہم پہلو ہیں، چنانچہ نوخیز نسل بالکل امریکی رنگ میں خود بخود رنگتی جا رہی ہے اور اس کا وہ ذہن نہیں بنتا جو ان کے والدین کا ہے جو کہ مشرقی ممالک میں تربیت حاصل کر کے یہاں پہونچے ہیں، جس کسی نوخیز نے یہاں اپنی کم عمری کے دو چار سال گذار لئے، انگریزی اس کی مادری زبان بن گئی۔ اور دیگر کوئی زبان ہوئی تو وہ ثانوی رہی، ٹیلی ویژن جو ہر ہر گھر میں ہے کم از کم نوخیز نسل کی تشکیل میں پورا کردار ادا کرتا ہے اور جو کسر رہ جاتی ہے وہ اسکولی زندگی، نیز محلہ کے ساتھیوں کا ماحول پوری کر دیتا ہے، اس کو دیکھ کر خطرہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ضروری انتظام نہ کیا گیا تو مسلمان نسل کے اخلاف کا غیر مسلم ہو جانا کچھ مستبعد نہیں

ایسے کئی واقعات یہاں سننے میں بھی آئے ہیں، چنانچہ مسلمانوں میں اہل درد طبقہ اس پہلو سے بہت متفکر ہے اور اس کے تدارک کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے، ایم ایس اے کا

بھی خاص حصہ ہے، جس کے کام کا میدان پورا شمالی امریکہ ہے، اس کے علاوہ اور کئی انجمنیں ہیں، مثلاً ایک انجمن ایم، سی، سی مسلم کمیونٹی سنٹر ہے، جس نے اپنے دائرۂ کار کو صرف شکاگو تک محدود کر رکھا ہے، اس کی نظر میں صرف شکاگو کو سنبھال لینا بذات خود بڑا کام ہے، جو پورے شمالی امریکہ کا دوسرے نمبر کا شہر ہے اور وہاں مسلمان ۵۰ ہزار کی تعداد میں ہیں، ان کے علاوہ کالے مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد وہاں رہتی ہے، چنانچہ ان کا ہفتہ واری اور روزانہ کا اسکول ہے، سیمینار، تقاریر نیز دعوتی و تربیتی مقصد رکھنے والے متعدد پروگرام ہیں، ان کا کام بھی اچھا اور قابل قدر ہے، یہ اپنی جغرافی وسعت میں تو کم ہے لیکن علمی وسعت رکھتا ہے، لیکن ابھی اس کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے اور اس کو مالی دشواریوں کا بھی سامنا ہے، مسلمانوں کی ایک طبی انجمن بھی ہے، یہ گویا مسلم میڈیکل یونین آف امریکہ کی سی حیثیت رکھتی ہے، یہ بھی اسلامی بنیاد پر قائم کی گئی ہے اور اسکا ایم، ایس، اے سے بھی رابطہ ہے، اسی طرح ایک دوسری انجمن علمی و ثقافتی ہے، وہ بھی اسلامی اساس پر قائم کی گئی ہے اور اس کے کام کرنے والے بھی زیادہ تر ایم، ایس، اے کے ارکان ہیں، اس کے علاوہ ایک انجمن ہندوستانی مسلمانوں کی ہے، یہ انجمن بھی اپنے سالانہ جلسے کرتی ہے، اس میں اہم مسائل پر سیمینار اور مذاکرے ہوتے ہیں، باہر کے مفکرین کو بھی شرکت کی دعوت دیتی ہے، ہندوستانی مسلم طلبہ کی علمی و ثقافتی ن کی طرف بھی توجہ دیتی ہے، چنانچہ اسی جولائی کے شروع میں اس کا سال رواں کا سالانہ جلسہ شکاگو میں ہوا ہے، اس کا نام "سی، سی، آئی، ایم، کنسلیٹیٹو کمیٹی آف انڈین مسلمس ہے، اس نے اپنا نام مسلم مجلس مشاورت سے اخذ کیا ہے اور وہ اس کے پیغام سے متاثر ہے، یہاں کی یہ سب انجمنیں جمہوری طریقۂ کار رکھتی ہیں، اس کے ارکان کو باقاعدہ فیس

زکوٰۃ ادا کرنا ہوتا ہے، فیس رکنیت سے حاصل ہونے والے سرمایہ نیز علیحدہ سے امداد اور چندوں سے ان کے مصارف پورے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی انجمن کسی مسلم یا غیر مسلم ملک سے وابستہ نہیں ہے، افراد کے چندوں سے ان کا مالی نظام قائم ہے اور ان کا انتظامی ڈھانچہ شورائی اور انتخابی ہے، سال بسال نیا انتخاب ہوتا ہے اور جو ذمہ دار منتخب ہوتے ہیں وہ کام کو سنبھالتے ہیں، اسی وجہ سے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی انجمنوں میں سے اکثر کے صدر دفتر جگہ بدلتے رہتے ہیں اور چونکہ ان انجمنوں کے زیادہ تر ارکان طلبہ ہوتے ہیں اس لئے ان کا میدان بھی علی العموم یونیورسٹی سے متعلق مسلمان اور طلبہ نیز تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور چونکہ ان میں مختلف ممالک کے باشندے شریک ہیں اس لئے ان کے باہمی تبادلۂ خیالات کی زبان انگریزی ہے۔

ان مذکورۂ بالا علمی و ثقافتی اسلامی انجمنوں کے علاوہ یہاں ایک بڑا کام تبلیغی جماعت کا ہے، جو اپنے مخصوص ڈھنگ سے اصلاح و تربیت کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اثر سے یہاں خاصی اصلاح ہوئی ہے، ان کے سالانہ اجتماعات بھی ہوتے ہیں اور جماعتیں بھی نکلتی ہیں، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی اب نیویارک کے دفتر کو پورے امریکہ میں اسلامی کام کا ذمہ دار بنا دیا ہے، چنانچہ اس کا کام بھی چل رہا ہے، اسمیں یہاں کے مسلمانوں کا مالی و علمی تعاون بھی شامل ہے، دفتر کے اسلامی شعبہ کے ذمہ دار ہمارے ایک ندوی مزمل حسین صدیقی مقرر ہوئے ہیں، وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی بھی کر رہے ہیں، رابطہ نے ابھی دو ماہ قبل یہاں شمالی امریکہ میں تمام اسلامی انجمنوں کی ایک کانفرنس بھی کی تھی۔

امریکہ میں یونیورسٹیوں کی بڑی کثرت ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے شہر میں کئی کئی

یونیورسٹیاں ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں تو دس پندرہ یونیورسٹیوں سے کم نہیں ہوتیں اور بعض بعض شہر تو یونیورسٹیوں کے شہر کہے جاتے ہیں کیونکہ ان کی آبادی کا بڑا حصہ یونیورسٹی نظام کا جزء ہوتا ہے، مثلاً بوسٹن، کیمبرج، جو کہ جڑے ہوئے شہر ہیں، یہاں تقریباً ۲۰ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور ہارورڈ یونیورسٹی ہے، اس کا شعبۂ مشرقیات سب سے ممتاز ہے، امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کی مختلف خصوصیات و امتیازات ہیں، وہ یونیورسٹیاں جو اپنے کسی نہ کسی شعبہ میں عالمی شہرت کی مالک ہیں ان میں شکاگو یونیورسٹی، کیلیفورنیا کی برکلے یونیورسٹی، کیمبرج کی ہارورڈ یونیورسٹی، فلاڈیلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی ایسی ہی ..... ہیں جن میں مشرقی مسلمانوں کی آمد خاصی ہے، یوں تو اور بھی کئی یونیورسٹیوں میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہاں طلبہ پہونچتے ہیں اور تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں،

امریکہ میں علمی تحقیقات کے سلسلہ میں ہر شعبۂ علم کی علیحدہ علیحدہ اکیڈمیاں ہیں جو اپنے اپنے شعبۂ علم میں تحقیقاتی کام کو ترقی دیتی ہیں اور اس کے متعلقین کی مدد کرتی ہیں اور ان کو معلومات فراہم کرتی ہیں، ان ہی میں ایک اکیڈمی مذہبیات کی ہے، پورے امریکہ میں اس کے پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) رکن ہیں، اس کے متعدد شعبے ہیں، ابھی دو ایک سال قبل تک اسلام عیسائی شعبہ کا جزء تھا، اب تجرباتی طور پر اسلام کیلئے مستقل شعبہ شروع کیا گیا ہے، چار ارکان میں سے دو مسلمان، ایک عیسائی، ایک یہودی ہے، مذہبیات کی اکیڈمی اپنا ایک پرچہ بھی نکالتی ہے جس کا نام "دی جرنل آف امریکن اکیڈمی آف ریلیجن" ہے، اکیڈمی ہر سال چار روزہ اجلاس کرتی ہے جسمیں تقریباً آٹھ سو مضامین پڑھے جاتے ہیں، تمام مضامین کو ۲۵ جگہوں پر تقسیم کردیا

جاتا ہے جس کا جو موضوع ہو اس میں شریک ہو سکتا ہے۔

ہائی اسکول تک یہاں تعلیم مفت ہے، لیکن صرف حکومتی اداروں میں جن کی تعداد کم ہے، پرائیوٹ اداروں میں جن کی تعداد یہاں بہت ہے تعلیم پر فیس لی جاتی ہے۔ یونیورسٹیاں سب پرائیوٹ ادارے ہیں، ان کی تعلیم کی فیس بہت زیادہ ہے، بعض بعض میڈیکل کالجوں کی فیس سالانہ دس بارہ ہزار ڈالر سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

امریکہ میں ہائی اسکول تک بارہ سال لگتے ہیں، جب کہ ہندوستان میں دس سال لگتے ہیں، یہاں یونیورسٹی کی تعلیم چار سالہ کورس پر مشتمل ہے اور اس کی تقسیم ہمارے یہاں کی طرح ایف۔اے۔بی۔اے کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ نہیں ہے، اس کے بعد ایم۔اے ہے، یہاں پی۔ایچ۔ڈی میں علی العموم پانچ سال صرف ہو جاتے ہیں اور سخت محنت اور متنوع زبانوں اور مضامین سے ضمنی طور پر واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

یہاں یہ خوبی کی بات ہے کہ بڑی فرموں کی طرف سے ممتاز طلبہ کو وظیفے دئے جاتے ہیں اور چونکہ یہاں فرموں کی کثرت ہے اس لئے وظیفوں کی بھی کثرت ہے، اسکول کالج کے ذمہ داروں کی رہنمائی سے ان کامیاب طلبہ کا انتخاب ہوتا ہے جو وظیفہ کے مستحق قرار پاتے ہیں، ان سے طلبہ کو بڑی مدد مل جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ محنتی اور ممتاز طالب علم کے لئے یہاں تعلیمی مصارف کا مسئلہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے کیونکہ وہ علی العموم وظیفہ یابی کے انتخاب میں آجاتا ہے، اس کے لئے ہر مرحلہ کے آخری امتحان سے کامیاب ہونے والے طلبہ کے لئے جلسۂ تقسیم اسناد ہوتا ہے، جس میں مختلف اداروں اور فرموں کے نمائندے بھی شریک ہوتے ہیں اور عموماً وہاں وظیفوں کا اعلان ہوتا ہے، جس سے طالب علم کی ہمت افزائی بھی ہوتی ہے اور علم دوستی کا اظہار بھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اس طریقہ سے

فرموں کو بھی فائدہ ہوتا ہے، وہ اپنے اس سرمایہ کی حکومتی ذمہ داریوں سے بچ جاتی ہیں، جو ٹیکس کی صورت میں ان پر عائد ہوتی ہیں، یہاں ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے، ہر کمانے والے کو بعض اوقات آمدنی کا ½ حصہ ٹیکس میں دے دینا پڑتا ہے، یہاں انشورنس کا بے حد رواج ہے، زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو انشورنس سے وابستہ کر دیا گیا ہے، اور لوگ بھی اس دائرہ میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً علاج اور دوا میں، کیونکہ یہاں علاج بے انتہا گراں ہے، اسپتال میں ڈاکٹر کو محض مرض بتانے اور علاج معلوم کرنے کی ابتدائی فیس ۵۰ ڈالر ہے، پھر ہر علاج میں مختلف جانچوں سے گذرنا ہوتا ہے، ہر جانچ کی فیس علیحدہ ہوتی ہے، اسپتال میں ایک بڈ حاصل کرنے پر کم از کم ۱۰۰ ڈالر فیس روزانہ دینی ہوتی ہے، یہاں دیگر عوامی ضرورت کے اداروں کی طرح اسپتال بھی سب پرائیوٹ ہیں، یہاں اداروں کے پرائیوٹ ہونے کا ایسا عام سلسلہ ہے کہ ریلوے، ہوائی سروسیں، ٹیلی فون، تار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سب پرائیوٹ ہیں اور ان میں مقابلہ ہے، اس کی وجہ سے سب کا کام اچھا اور چست ہے، پوری زندگی پر تجارت کی روح غالب ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کام بغیر پیسہ صرف کئے نہیں ہو سکتا، حکومت کا کام عموماً کنٹرول کرنا، ٹیکس وصول کرنا اور دیگر متعدد مرکزی ذمہ داریاں پوری کرنا ہے، تجارت وصنعت پر یہودیوں کی گرفت ہے اور چونکہ ملک کی ترقی کا انحصار اسی پر ہے اس لئے پورے ملک پر ان کی گرفت ہے، ان کے رجحان کو کسی میں مسترد کرنے کی جرأت نہیں، ان کی مرضی کے خلاف امریکہ سے کسی اقدام کی توقع رکھنا فضول ہے، خواہ اسرائیل کا مسئلہ ہو یا کوئی اور مسئلہ۔

ملک ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جو ٹکنالوجی اور انسان کی سائنٹفک

کوششوں کی معراج ہے، بجلی سے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ممکن ہے اور مشین سے انسانی کام لینے کی جو صورتیں ممکن ہیں وہ سب اختیار کی گئی ہیں اور چونکہ یہاں دولت کی کوئی کمی نہیں ہے اس لئے دنیا میں سب سے زیادہ اسی ملک کو ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے میں بلند معیار حاصل ہے، یہ اب ان باتوں میں یورپ سے بھی اتنا آگے ہے جتنا یورپ مشرقی ممالک سے، ساری تجارت، کاروبار زندگی کے دوسرے مشاغل میں کمپیوٹر ایک علم ذریعہ بن گیا ہے، اس کے ذریعہ انسان دماغی محنت کے تفصیلی اور پیچیدہ کاموں میں پوری مدد لیتا ہے اور اس سے اس کے وقت اور تعداد میں بڑی کفایت ہو جاتی ہے، انسانی محنت کی جگہ پر مشینی محنت کو استعمال کرنے کا یہ حال ہے کہ خرید و فروخت کے بھی بہت سے کام مشین سے انجام پاتے ہیں، بڑے بنکوں اور فرموں نے تجارتی کارڈ جاری کئے ہیں، ان کو دکھانے یا مشین میں ڈالنے سے آدمی چیزیں خرید لیتا ہے اور فی الفور ادائیگی سے بچ جاتا ہے، ہم نے ان کارڈوں سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرتے دیکھا ہے، ٹیلی فون کی عمومیت ایسی ہے جیسی عمومیت ہمارے ہندوستان میں بجلی کے کنکشنوں کی نہ ہوگی، یہاں کوئی گھر ٹیلیفون سے خالی نہیں، خواہ دیہات کا ہو یا شہر کا، اور کوئی شہر یا دیہات ڈائلنگ نظام سے خارج نہیں اور ٹیلیفون کی پابندئی عمل ایسی کہ کسی سے کہیں رابطہ قائم کرنے میں ادنیٰ دیر نہیں لگتی، پھر ٹیلیفون کے ذریعہ بکنگ رزرویشن اور بہت سے پیچیدہ کام بھی بآسانی انجام پاتے ہیں، ٹیلیفون درخواست دیتے ہی لگتا ہے اور معمولی فیس سے کام چلتا ہے، یہاں فاصلوں کی دوری اور وقت کو بچانے اور جلد کام انجام دئے جانے کے شوق و ضرورت نے ٹیلیفون کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور ٹیلیفون اس ضرورت کو پورا کرتا ہے، ٹیلیفون کا محکمہ

یہاں سرکاری نہیں ہے بلکہ پرائیوٹ ہے۔

معیار زندگی کا اندازہ یہ ہے کہ ڈالر جو ہندوستانی روپیہ سے تقریباً آٹھ گنی قیمت رکھتا ہے ایک عام آدمی کو یہاں اس سے زیادہ ملتا ہے جتنا کہ اس کو ہندوستانی روپے ملتے اور اس میں وہ یہاں کے معیار کے مطابق زندگی گذارنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا ہر صاحب خاندان جس طرح مکان رکھتا ہے، موٹر بھی رکھتا ہے، کیونکہ فاصلوں کی طوالت کی وجہ سے یہی ذریعہ مواصلات ہے۔

یہاں بکثرت اشیاء قسطوں پر مل جاتی ہیں، لوگ مکان تک بآسانی قسطوں پر خرید لیتے ہیں۔ لیکن ان سب میں سود چلتا ہے اور نتیجۃً اصل قیمت کا دوگنا دینا پڑتا ہے، لیکن چھوٹی قسطوں کی سہولت نیز حسب خواہش و ضرورت چیز مل جانے سے لوگ بآسانی قبول کرتے ہیں۔

طب، قانون اور مالیات کے میدانوں پر اسی فیصد اور نشریاتی میدان پر تقریباً سو فیصد قبضہ یہودیوں کا ہے، یہی وجہ ہے کہ سودی اور تجارتی مزاج نے زندگی کے ہر پہلو کو رنگ دیا ہے۔ انشورنس زندگی کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے، انشورنس یہاں کے باشندوں کو اچانک پیش آنے والے مصارف میں خصوصی امداد ملنے کی جاذبیت بھی رکھتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً علاج کے مصارف یہاں ناقابل برداشت ہیں، انشورنس سے ان میں مدد ملتی ہے۔

یہاں ضروریات و کمالیات زندگی کے مصارف بے انتہا ہیں اور ان میں خوب اسراف ہوتا ہے۔ اگر صرف ماکولات میں امریکہ اسراف ترک کردے تو ساری دنیا کی غربت ختم ہوسکتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی ۶۰ فیصد اشیاء صرف امریکہ میں صرف کی جاتی ہیں،

۸۰ فیصد باقی دنیا میں، حالانکہ امریکہ کی آبادی ساری دنیا کا بارہواں یا تیرہواں حصہ ہوگی، یہاں کے اخراجات کا معیار یہ ہے کہ تنہا نیویارک کارپوریشن کا بجٹ تقریباً سارے ہندوستان کے بجٹ کے قریب ہے یعنی ۱۴ ارب ڈالر جو ایک کھرب روپیوں سے زیادہ کے مساوی ہے، حالانکہ کارپوریشن کے مصارف کارپوریشن کے ہیں، اصل گورنمنٹ کے اس سے علیحدہ۔

امریکہ میں جو ترقیات نمایاں نظر آتی ہیں ان میں کمپیوٹر کا وسیع استعمال، شاہراہوں کی کثرت اور حسن انتظام، شاہراہوں نے چھوٹے بڑے شہروں کو ایک طرفہ راستوں کے نظام میں منسلک کر دیا ہے جس میں کراسنگ نہیں ہے، موٹر والوں کو تیز موٹر چلانے میں آسانی رہتی ہے، یہ کراسنگ کی ضرورت پڑنے پر اوپر نیچے گذر جاتی ہیں، کراس نہیں کرتیں، ان پر پندرہ پندرہ، بیس بیس میل پر چائے خانے اور لیٹرین بنے ہوئے ہیں، یہ آبادیوں کے باہر سے گذرتی ہیں اور چھوٹی شاہراہوں کے ذریعہ آبادی سے جڑتی ہیں، ان میں بڑی شاہراہیں جو ہائی وے کہلاتی ہیں بارہ بارہ سولہ سولہ رو کی ہوتی ہیں، نصف تعداد آنے کی اور نصف تعداد جانے کی، یہ شاہراہیں دیکھ کر محنت اور ترقی کی داد دینی پڑتی ہے۔

ان ساری مذکورہ بالا باتوں کے ساتھ ساتھ سارا ملک زندگی کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے، زندگی کی جو شکل بنتی جاتی ہے آدمی اس کا تابع بنتا جاتا ہے اور اپنے کو اسکی غلامی سے نکال نہیں سکتا، رائج زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اس کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور اپنے وقت کا بڑا اور طاقتور حصہ اسی کی نذر کر دینا پڑتا ہے، انسانی یا مذہبی کاموں کے لئے اس کے پاس وقت نہیں بچتا، روزانہ پورے آٹھ گھنٹے

کام، تقریباً دو گھنٹہ کام کے سلسلہ میں آمد و رفت، پھر اپنی ضروریات کی خود انجام دہی میں انسان کا بہت زیادہ وقت لگ جاتا ہے، ہفتہ میں دو روز چھٹی ہوتی ہے جو ہفتہ بھر کی محنت کے بعد آرام کی طلب میں گذر جاتی ہے، اسی لئے اس وقت کو خوب لطف و آزادی کے ساتھ گذارنے کا جذبہ پایا جاتا ہے، امریکہ نے شخصی آزادی اور جمہوری طریقۂ زندگی کا نظام اختیار کیا ہے، اس میں مذہبی اور اخلاقی پہلو بھی داخل ہیں، آدمی مذہب و اخلاقیات میں جو طریقہ اختیار کرے، کوئی اس کو روکنے یا اعتراض کرنے والا نہیں، اس لئے لوگ صرف اپنی خواہش اور مرضی پر چلتے ہیں اور مشرق کی بری باتیں یہاں بری نہیں کہی جاتیں۔

چند باتیں جو یہاں کے مشاہدات سے سمجھ میں آئیں تعمیل حکم میں لکھدیں۔

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

تذکرۃ المحدثین

حصۂ دوم

اس کا پہلا حصہ جو ائمۂ صحاح کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح اور اُن کی شاندار حدیثی خدمات پر مشتمل تھا، یہ دوسرا حصہ چوتھی صدی کے آخر سے آٹھویں صدی تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات اور حدیثی خدمات، اور کارناموں پر مشتمل ہے،

مولفہ ضیاء الدین اصلاحی، قیمت :- ۱۶ روپیہ

غالب

(مدح و قدح کی روشنی میں)

حصۂ اول قیمت :- ۱۵ روپئے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

استدراک

از عبدالسلام قدوائی ندوی

گزشتہ ماہ کے معارف میں وفیات کے تحت مولانا محمد سلیم مرحوم کے مختصر حالات شائع ہوئے ہیں، اس میں ص ۱۴۳ کی آخری سطر میں، "انکے بھتیجے" کے بعد "کے لڑکے" کا اندراج رہ گیا ہے، اسے درج کر لیا جائے، مولانا محمد سعید مولانا رحمۃ اللہ کے بھتیجے نہیں تھے، بلکہ انکے بھتیجے محمد صدیق صاحب کے لڑکے تھے۔

اسیطرح ص ۱۴۲ کے دوسرے پیراگراف میں جہاں پادری فنڈر سے مناظرہ کا ذکر ہے اس جگہ کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مولانا اسکے بعد ہی مکہ معظمہ چلے گئے تھے، یہ صحیح ہے کہ ردِ مسیحیت کی وجہ سے مولانا انگریزوں کی نظر میں کھٹکنے لگے تھے، پادری فنڈر کی شکست کے بعد انکی ناراضی بہت بڑھ گئی تھی، مگر اسکے باوجود مولانا نے ہندوستان نہیں چھوڑا، اور بدستور اپنے کام میں لگے رہے، آگرہ کا یہ مناظرہ ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا، اسکے تین برس بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی، مولانا رحمۃ اللہ نے بھی اس میں حصہ لیا، جب انقلاب کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہندوستان پر پھر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا، تو مولانا بھی باغی قرار پائے، اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا، کچھ دن احباب و معتقدین نے پوشیدہ رکھا، لیکن جب یہ تدبیر ناکام ہوتی نظر آئی اور یہ محسوس ہوا کہ مولانا کے ساتھ سیکڑوں اور بندگانِ خدا بھی انگریزوں کے غضب کا شکار ہو جائینگے تو مخلص دوستوں نے ہجرت کا مشورہ دیا۔

مولانا جب مکہ معظمہ پہونچے تھے تو سلطان عبدالمجید کا زمانہ تھا، انکے بعد سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ ہوئے، قسطنطنیہ کا پہلا سفر ۱۲۸۰ھ میں سلطان عبدالعزیز کے عہد میں [illegible] ۱۲۹۱ھ میں اور تیسرا سفر ۱۳۰۱ھ میں سلطان عبدالحمید ثانی کے دورِ حکومت میں ہوا۔

مطبوعات جدیدہ

الامام البخاری (عربی) مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، تقطیع خورد، کاغذ کتابت

و طباعت عمدہ صفحات ۱۹۶، پتہ دار القلم، دمشق۔ بیروت،

صحیح بخاری حدیث کی سب سے معتبر کتاب ہے، اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے امت نے اس کے اور اس کے مصنف کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اور ان دونوں کے متعلق ہر زمانہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کو اس دور کے نامور محدث مولانا محمد زکریا صاحب سے استفادہ کا موقع ملا ہے، اور وہ کئی سال تک دار العلوم ندوہ اور گجرات کے مدارس میں حدیث کا درس بھی دے چکے ہیں، اور چند ممتاز ائمہ حدیث کے تراجم اور فن رجال پر اردو میں بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اب بلاد عربیہ میں مقیم ہیں اسلئے عربی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا ہے پہلے امام ابو داؤد پر اور اب امام بخاری پر یہ رسالہ چھپا ہے: اس کے پہلے حصہ میں امام صاحب کے حالات، سوانح، فضائل اور مناقب اور دوسرے میں صحیح بخاری کی اہمیت، خصوصیت اور عظمت کا ذکر ہے دوسرے حصہ سے مصنف کی محنت اور اچھی نظر کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں صحاح ستہ میں صحیح بخاری کا درجہ متعین کیا گیا ہے اور صحیح مسلم سے مناسب انداز میں موازنہ بھی کیا گیا ہے نیز اس کی شروح، ابواب و تراجم کی خصوصیات ان کی باہمی ترتیب و مناسبت وغیرہ پر بعض [illegible] گنگوہی ... یہ رسالہ زیادہ طویل نہیں ہے، بہت مختصر ہے، اس میں اکثر ضروری اور اہم مباحث آگئے ہیں، اس ... حدیث کے طلبہ کو مطالعہ کرنا چاہیے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر مقدمہ بھی

آئینۂ ابو الکلام آزاد مرتبہ جناب عتیق صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـــہ، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم پر آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے، شروع کے چار مضامین بالترتیب ڈاکٹر سید عبد اللہ، مولانا عبد الماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور خواجہ غلام السیدین کے قلم سے ہیں، ان سب میں مولانا کی شخصیت، علم، فضل، ذہانت، شرافت، عظمت، سیاسی بصیرت، تعلیمی خیالات، ملک و ملت کی قیادت میں ان کے زاویۂ نظر اور دوسری نمایاں خصوصیات کا ذکر ہے، جناب عبد اللطیف اعظمی کے مضمون میں مولانا کے متعلق ان کے اکثر ممتاز معاصرین کے تاثرات نقل کئے گئے ہیں، جناب ریاض الرحمن خان شروانی نے اپنے جد محترم اور مولانا کے صدیق مکرم مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم سے انکے تعلقات کی نوعیت دکھائی ہے، اور لائق مرتب نے غبار خاطر کی مدد سے قلعہ احمد نگر کی اسیری کی روداد تحریر کی ہے، حمیدہ سلطان صاحبہ نے مولانا کی رفیقۂ حیات کے ان سے تعلق و اخلاص کا ذکر کیا ہے، دوسرا حصہ دور اول و دوم کے الہلال کی ایک ایک تحریر، مولانا کے بارہ خطوط اور لکھنؤ مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت پر مشتمل ہے، شروع میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر اور سجاد انصاری کا خراج عقیدت ہے، گو اس مجموعہ کے تقریباً سب مضامین اور تحریریں مطبوعہ ہیں، تاہم انکی حیثیت قند مکرر کی ہے، البتہ مولانا کے خطوط سردار محمد اکبر خان (پاکستان) کے نام تھے، اور گو یہ بھی وہاں چھپ چکے ہیں، لیکن ہندوستان والوں کی دسترس سے باہر تھے، اس لئے امید ہے کہ یہاں شوق سے پڑھے جائیں گے، ان سے پہلی بار معلوم ہوا کہ مولانا ترجمان القرآن کی تیسری جلد بھی مکمل کر سکے تھے اور یہ بھی کہ

حوالے کر چکے تھے، مگر پھر کیا اضافہ چھپتے وقت ہوا اس کا کچھ ذکر نہیں، مولانا پر کئی کتابیں اور مضامین
کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ابھی ان کی ایک اچھی سوانحعمری کی ضرورت باقی
ہے، مرتب کو مولانا سے بڑی عقیدت ہے، ان کو بھی اس کمی کا احساس ضرور ہوگا کاش
اس کی جانب وہ متوجہ ہوتے،

امجد علی شاہ - مرتبہ جناب سید محمد نقوی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت
وطباعت بہتر صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت - عـہ ۱۵ ، پتہ - از
مصنف اکبر پور، فیض آباد،

اس کتاب میں تاجدار اودھ امجد علی شاہ کی زندگی اور ان کے عہد حکومت کے
واقعات آٹھ ابواب میں بیان ہوئے ہیں پہلے باب میں سلطنت اودھ کی مختصر تاریخ
اس کے بعد کے تین ابواب میں امجد علی شاہ کی ولادت تعلیم وتربیت، ولی عہدی،
وزارت عظمیٰ، تخت نشینی نظم مملکت، تعمیری کوششوں اور علمی و دینی کارناموں کی
تفصیل پیش کی گئی ہے، پانچویں باب میں انگریزوں سے ان کے تعلقات کا ذکر ہے،
ایک ایک باب شاہ کے سب سے معتمد وزیر امداد حسین امین الدولہ اور سلطان
العلما مولانا سید محمد کے حالات کے لیے خاص ہیں، آخری باب میں امجد علی شاہ پر
اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اگر مصنف نے بعض نزاعی اور مختلف فیہ امور کا
بھی ذکر کر دیا ہے، انھوں نے امجد علی شاہ کی دینداری کو خاص طور پر بیان کیا ہے،
مگر ان کی دینداری ان کی اپنی روایات کے مطابق تھی، یہ کتاب پر از معلومات ہے
اور اس سے تاریخ اودھ پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مصنف کو تاریخی تحقیق
سے خاص دلچسپی ہے، اس کتاب کو لکھنے میں جو کاوش ومحنت کی گئی ہے وہ داد کی مستحق ہے،

جلد ۱۲۱ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین

نئی کتاب

غالب مدح وقدح کی روشنی میں (حصہ اول)

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن، قیمت:- ۱۵ روپے

شذرات

اس ماہ کے آخر میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر دہلی میں ایک بین الاقوامی سمینار ہونے والا ہے، امید کہ اس اجتماع میں اُن کے گوناگوں خیالات و افکار کو زیر بحث لاکر اُن کو ایک شاعرِ مشرق، دانائے راز اور مفکر اعظم کی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

تقسیم ہند کے پہلے اس ملک میں ڈاکٹر اقبال بہت ہی مقبول رہے، ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے روحِ اقبال اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اقبال کامل کے ذریعہ سے اُن کو جس طرح یہاں کے لوگوں کو سمجھایا، اس سے بہتر طریقہ پر خود پاکستان کے لوگ شاید اُن کو نہ سمجھا سکے ہوں، ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ دنوں تک اُن کی مقبولیت یہاں اس لئے کم ہو گئی کہ وہ تقسیم ہند کے محرکوں میں سمجھے گئے، مگر رفتہ رفتہ یہ آزردگی جاتی رہی، یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اُن کی شاعرانہ عظمت پہلے ہی کی طرح جمنے لگی، اس ناخوشگواری کو دور کرنے والوں میں ایک بہت ہی نمایاں نام جناب جگن ناتھ آزاد کا ہے جو اقبال جیسے عظیم شاعر کو کسی خاص خطہ کی ملکیت سمجھنے کے لئے تیار نہیں، ان کے خیال میں وہ ہندوستان کے ویسے ہی ہیں جیسے پاکستان کے ہیں، انھوں نے بڑی فراخدلی اور بالغ نظری سے اپنی تحریروں میں اس بات کو بار بار دہرایا کہ اقبال کا اسلامی شاعر ہونا کوئی اُن کا نقص نہیں، دنیا کے ممتاز ترین شعرا میں دانتے، ملٹن، ویاس، والمیکی اور تلسی داس وغیرہ نے ابدی شہرت اس لئے حاصل کی کہ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع اپنے اپنے مذہب ہی کو بنایا، جناب جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی زندگی اور شاعری کی ایک ادبی نمائش بھی تیار کی، اس کو مختلف شہروں میں کچھ ایسی خوش سلیقگی سے دکھایا کہ اقبال کو ہندوستان

واپس آنے میں بڑی مدد ملی،

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اقبال کی وفات پر لکھا تھا کہ اُن کے ذہن کا
ہر ترانہ بانگ درا، اُن کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اُن کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق،
اُن کا ہر شعر پرواز بال جبریل تھا، اُن کی فانی عمر گو ختم ہو گئی، لیکن اُن کی زندگی کا یہ کارنامہ
جاوید بن کر رہے گا، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے،

اقبال پر اب تک جتنا لکھا جا چکا ہے، اتنا ہی اور لکھا جائے گا، تو بھی کمی کا احساس ہوگا،
اقبال کے کچھ نقاد یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ وہ بعض فرنگی فلسفیوں سے متاثر ہوئے، مگر خود اقبال
کے اس بیان کو تجزیہ کی ضرورت ہے، کہ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے، تاہم
مسلک میرا وہی ہے، جو قرآن کا ہے، (اقبال نامہ ص ۱۳۰) اُن کو سمجھنے میں اس کو بھی ملحوظ
رکھنا ہے، وہ نٹشے کے دماغ کو کافر، ہیگل کو چراغ لے کر آفتاب کو ڈھونڈنے والا، گوئٹے کو رمز عشق
سے ناآشنا، برگساں کو بستۂ اوہام، طالسٹائے کو خود پرست فلسفی، کارل مارکس کو
راز دانِ جزو کل ہونے کے باوجود نامحرم خویش اور ڈیکارٹ کو تہی جام تصور کرتے رہے، فرنگی فلسفہ کو
مجموعی حیثیت سے حجتِ نااستوار کہتے ہیں، اور اس پر یہ کہہ کر استہزاء کیا ہے، کہ اس میں جلوہ ہے،
لیکن جلوۂ بے کلیم ہے، شعلہ ہے لیکن شعلۂ بے خلیل ہے، خرد ہے، لیکن یہ متاعِ عشق کی غارت گر ہے،
پھر اُن کی زندگی اور شاعری کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرار الٰہی کے محرم بن کر
وہ کلام مجید پڑھتے تو اس کے اوراق اُن کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے، اور اُن کو محسوس
ہوتا کہ اس کی حکمت قدیم لا یزال پڑھ نہیں رہے ہیں، بلکہ یہ اُن پر نازل ہو رہی ہے، عاشقِ رسول
کی حیثیت سے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ع از حدود مصطفیٰ بیروں مشو، وہ اس کے بھی قائل رہے کہ

ع آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عشق و محبت کی استواری اور رازداری سے سرشار رہے، حضرت علیؓ کے ایمان میں بھی اُن کو عشق کا سرمایہ ملا، حضرت بلالؓ کی نوائے جگر گداز میں اُن کو نورِ نبوت نظر آیا، رسم سلمانؓ و اویس قرنیؓ بھی اُن کے سامنے رہی، اُن کو ردائے فاطمہ زہراؓ کی عفت کا بھی خیال رہا، پھر بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ شروع سے آخر تک رمز آشنائے روم رہے، ان ہی سے رازِ زندگی، اور سرِ مرگ ان پر فاش ہوا، ان ہی سے سرور پا کر مقامِ کبریائی کا سرور حاصل کیا، ان ہی کے فیض سے اُن کے سبو میں جیحون منتقل ہوا، ان ہی کی آتشِ سوز سے اُن کا علاج ہوا، اسی کے ساتھ اُن کو اعتراف ہے کہ انھوں نے حضرت فضیلؒ اور حضرت ابوسعیدؒ کی پاک مردانگی پائی، حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب دیکھا، منصورؒ کے عرفان کی تجلیوں میں دینِ فطرت کی تجلی دیکھی، حضرتِ سید احمد رفاعیؒ کے ضمیر سے نور کو کسب کرنے کی فکر کی، خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دلِ بے تاب اور دردِ ناشکیبائی میں کیفیت محسوس کی، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے لحد کی زیارت میں دل کی زندگی پائی، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ اُن کو شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت کا فرق معلوم ہوا، حضرت شیخ مجدد الفؒ ثانی کے مزار کی خاک کو زیرِ فلک مطلعِ انوار سمجھا، اور ان کو صاحبِ اسرار تصور کر کے ان سے چشمِ بینا کے ساتھ چشمِ بیدار کے خواہاں ہوئے،

حکمائے اسلام میں نگاہ غزالیؒ کی طرف ان کی نظر اٹھی، بو علی سینا کے مقامِ فکر تک پہنچنے کی کوشش کی، سنائی کے صدق و اخلاص کے جویاں ہوئے، حیرت فارابی سے متحیر رہے، نظریۂ نور سے متعلق اُن کے خیال کو ابنِ رشد سے تقویت پہنچی، ابو المعالی کے، اور عبد الکریم جیلی کے خیالات اپنے اشعار میں منتقل کئے، جمال الدین افغانی اور سرسید کے افکار کا بھی اثر لیا،

سخن گوئی میں شیخ فرید الدین عطار کی غلامی کی، عراقی کے اشعار سے لذت آشنا ہوئے

حدیث بو علی قلندر پانی پتی میں حسن رعنا کی دلآویزی دیکھی، اللہ تعالیٰ سے امیر خسروؒ کے سینہ کے آتشدان کے سوز کے طلبگار ہوئے، اپنے کو کشتۂ رندانہ جامی قرار دیا، عرفی کی غیرت، اور تخیل اور فیضی کی توانائی اور جوش کو اپنایا، وہ صائب، ملک قمی، ابو طالب کلیم، میر رضی دانش، عبدالقادر بیدل کے اشعار سے متاثر ہو کر تضمینیں بھی لکھتے رہے، غنی کشمیری جیسے فقیر لیکن اقلیم معنی کے امیر کی نوا سنجی اُن کے ذہن پر چھائی رہی، غالب کی روح اور میر کا درد اپنے دل میں پایا،

ان حقیقتوں کے پیش نظر پھر یہ کیسے یقین کیا جائے، کہ اقبال فرنگی فلسفیوں کی گاڑی کے قلی بنے ہوئے، ان کا فلسفۂ خودی بہت مقبول ہے، اس کو فرنگیت سے ملوث کرنا اپنی بے خبری کا ثبوت دینا ہے، یہ اسلامی تصوف کی ترقی یافتہ شکل ہے، اقبال خود ہی لکھتے ہیں کہ اسرار خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور زمان و مکان کے متعلق برگساں بھی ہمارے صوفیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں، (اقبال نامہ ص ۳۴) وہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ زمان و مکان پر خود ہندوستان کے مسلمان حکماء اور صوفیہ نے بہت کچھ سوچا، اور لکھا ہے، ان کو یہ افسوس رہا کہ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفہ کی تعلیم سے ناآشنا ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اسلامی حکماء اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کیا جائے، ان کو یقین تھا کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا، وہ اس پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھ سکے لیکن اسلام کے حکماء اور صوفیائے کرام کے یہاں جو چیزیں غیر مرتب تھیں، ان کو انھوں نے اپنی شاعری میں بہت ہی طاقت ور اور دلآویز طریقہ پر پیش کر کے اپنے خیالات کی گونج و تسنیم بہادی؛

...... ❊ ......

اقبال کو اس حیثیت سے جاننے کے بعد اُن کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی کرنا ضروری ہے کہ

انھوں نے عام انسانیت کو کس طرح سنوارنے کی کوشش کی، خودی، اجتماعی خودی، عقل وعشق، عظمتِ آدم، شرفِ انسانی، انسانِ کامل، حیاتِ اجتماعی، خیر وشر، تسخیرِ فطرت، اور مقصدِ تخلیق وغیرہ سے متعلق اُن کے جو تخیلات اور پیامات ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے تو پوری انسانیت سنور سکتی ہے، اسی کے ساتھ ان کی شاعری میں جو تب وتاب ہے، انسانی جذبات کی جو ترجمانی ہے، زندگی کے قافلے کو طوفان وہیجان کی منزل کی طرف بڑھانے کا جو جوش وخروش ہے، کائنات کے ضمیر کے راز کو فاش کرنے کی جو جستجو ہے، پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کی جو تلقین ہے، حسن کی کرشمہ سازیوں کی جو نقاشی ہے، پھر شاعرانہ رمز وکنایہ کا جو حسنِ ادا ہے، کلام میں غنائی عنصر کی جو فراوانی ہے، بحروں کی جو شگفتگی ہے، ترکیبوں کی جو نزاکت اور تازگی ہے، ان سے ان کی جمالیاتی شاعری کی ابدیت کی لذت برابر ملتی رہے گی،

ہم نے اگر اقبال کو اس صد سالہ جشن کے موقع پر صحیح معنوں میں پا لیا تو ہم اپنے کو بھی اس حیثیت سے پالیں گے کہ ہم کو ان سے اسلام کے لئے نیا علم کلام، تصوف کے لئے نئی روح، فلسفہ کیلئے نیا زاویۂ نگاہ، انسانیت کے لئے نئی حرکت، شاعری کے لئے نئی آن بان اور حسنِ ادا کے لئے نیا جادو ملا،

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے عرصہ سے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو مختلف جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے، اور جس کا دائرۂ کار دین وسیاست، معیشت ومعاشرت، تہذیب وتمدن، اور تعلیم وتربیت کے تمام شعبوں کو محیط ہو، وہ ہر طبقہ کے مفاد کو پیش نظر رکھے، مگر طبقاتی کشمکش سے محفوظ اور جماعتی عصبیت سے پاک ہو، خدا کا شکر ہے کہ اکتوبر کے شروع میں مسلم کنونشن کے نام سے دہلی میں یہ اجتماع ہوا، جلسہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، مولانا سید ابوالحسن علی کا خطبۂ افتتاحیہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا خطبۂ صدارت دونوں بڑے مؤثر، پر مغز اور حوصلہ افزا تھے، امید ہے کہ جس اتحاد اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کنونشن کے موقع پر کیا گیا ہے، اگر وہ برقرار رہا تو ملت کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی،

مقالات

امیر خسروؔ بحیثیت ایک صوفی

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ابوالحسن یمین الدین خسروؔ (۶۵۱ھ ۱۲۵۳ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) کی شخصیت میں بڑی نگارنگی ہے، وہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے، بے مثل ماہر موسیقی بھی، سلاطین دہلی کے محبوب ترین ہم جلیس بھی، وفادار بیٹے بھی، شفیق باپ بھی، اور اپنے مرشد حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے بہت ہی چہیتے اور جان نثار مرید بھی، ان کا جیسا عبقری صدیوں کے بعد ہی کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے، ان کی عبقریت کے گوناگوں پہلوؤں میں سے اس مقالہ میں وہ جام معرفت پی کر جس طرح سرشار اور مخمور رہے، اسی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے۔

سیاسی حیثیت سے تو انھوں نے غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ ۱۲۶۶ء - ۶۸۶ھ ۱۲۸۶ء) سے لیکر محمد بن تغلق کا ابتدائی عہد دیکھا، جب کہ سیاست کی ہر قسم کی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں، ہندوستان پر انھوں نے تاتاریوں کے پے درپے خونریز حملے دیکھے، خود ان کے ہاتھوں اسیر ہوئے، اپنے محبوب ترین علمی و ادبی سرپرست شہزادہ محمد سلطان کو میدان جنگ میں ۱۲۸۵ء میں شہید

ہوتے بھی دیکھا، سلطان معزالدین کیقباد (۱۲۸۶ء - ۱۲۹۰ء) کی سرمستیاں اور رنگ رلیاں بھی ان کی نظروں سے گذریں، سلطان جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء - ۱۲۹۶ء) کے مصرف دار کی حیثیت سے اس کے المناک قتل سے بھی متاثر ہوئے، سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء - ۱۳۱۶ء) کی فتوحات میں بھی شریک رہے، پرواریوں کے ہاتھوں شاہی محل کے اندر سلطان قطب الدین خلجی کا سفاکانہ قتل بھی ۱۳۲۰ء میں ان کی زندگی میں ہوا، غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) نے ان پرواریوں کو جس طرح مغلوب کیا، اس کے مناظر بھی دیکھے اور آخر میں محمد شاہ تغلق کی حکومت کے آغاز میں اپنی جان اپنے جان آفریں کے سپرد ۱۳۲۵ء میں کی۔

ان کی پیدائش ۱۲۵۳ء میں ہوئی، انھوں نے چوہتر برس کی عمر پائی، ان کے پورے دور زندگی میں سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ شیخ الشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روحانی حکومت بھی قائم رہی، ان کے انفاسِ متبرکہ کی وجہ سے بقول مورخ مولانا ضیاء الدین برنی دنیا روشن ہو رہی تھی، ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا، ان کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی، ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا، لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی، احکام شریعت و طریقت کے رواج کی رونق بڑھی، خاص و عام، غریب و دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل توبہ اور پاکی کی تعلیم پانے لگے تھے، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے (مزید تفصیلات کے لئے دیکھو تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶ - ۳۴۱)

اسی ماحول میں امیر خسروؒ کی زندگی گذری، شیخ الشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا سنہ پیدایش ۶۳۴ھ ہے، اس طرح امیر خسروؒ حضرت خواجہ سے تقریباً سترہ سال چھوٹے تھے، سیرالاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ جب خسروؒ پیدا ہوئے تو ان کے والد کے گھر کے پاس ایک مجذوب (دیوانہ صاحب نعمت) رہا کرتے تھے، ان ہی کے پاس ان کے والد خسرو کو ایک کپڑے

میں پلٹ کر رہے گئے، مجذوب نے دیکھتے ہی کہا کہ ایک ایسے شخص کو لاؤ جو خاقانی سے دو قدم آگے ہوگا (سیر الاولیا، ص ۳۰۱) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبد الحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ممکن ہے دو قدم آگے کہنے سے ان مجذوب کا مقصد مثنوی نگاری اور غزل گوئی کے فن میں ہو، کیونکہ قصیدہ گوئی میں بعض بزرگوں کی رائے کے مطابق وہ خاقانی تک پہونچ تو سکے، لیکن آگے نہ بڑھ سکے (ص ۹۳ - ۹۲) مولانا شبلیؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے شاعرانہ ذوق کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت (شعر العجم جلد دوم ص ۱۰۸)

امیر خسروؒ نے اپنے والد سیف الدین کے متعلق غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنی امارت کے باوجود پاک صفت، فرشتہ خصلت، عبادت گذار اور صاحب ولایت تھے، اسی بات کو اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے:

"عجب سیفے کہ باچندیں صفت گوہر پاکش چناں بودہ کہ ہرگز سخن از زبان او بیرون نیامدے، ترک در خواب فرشتہ باشد او در بیداری فرشتہ بود، از بالا آمدہ آں چناں فرشتہ را جز در خواب نتواں دید، صفت ملکی را در طاعت چناں ملکہ کردہ کہ در خورشید سیہ چشم چشم سرخ نکردی ہم از طریق دنیا امیر بود، ہم از جانب معنی صاحب ولایت باآں کہ امی بود۔"

غالباً اسی عبارت کو سامنے رکھ کر سیر العارفین کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر سیف الدین لاچین اور پیر مرد صالح اور خدا پرست تھے، خزینۃ الاصفیا میں بھی ہے کہ:

امیر سیف الدین لاچین پیری بے نظیری خدا پرست بود" (ص ۳۳۹)

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت خواجہ امیر خسروؒ جب ہمراہ برادران و پدر بزرگوار حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر آٹھ برس کی تھی لیکن اس میں

عمر صحیح نہیں لکھی گئی ہے کیونکہ امیر خسروؒ نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت سات سال کے تھے، اس کے بعد وہ اپنے نانا عماد الملک کے یہاں پرورش پانے لگے، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ ان کے نانا نہ تھے بلکہ دوست تھے۔

"آں جد نبود بلکہ دوستے بود، صاحب دولتے چوں چتر سلطان سیاہ دوست عماد الملک بہ نام"

پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی فراخ دلی سے ہندوستان کی مملکت کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا، اگرچہ وہ عرض کے کام پر مامور تھے، پھر لکھتے ہیں:

"زہے رواۃ عارض کہ در کار آرائی مملکت ہند ہمہ تن رائے بود، چنانکہ اگر خواستے رائے بگردانیدے دیار کردے"

لکھتے ہیں کہ ایک سو ستر۱۱۷ سال کی عمر پائی جس میں ستر سال تک عارض ممالک رہے، اور ایسے عارض کہ ایک لاکھ ہندو، ایک لاکھ سوار ان کے یہاں سے کلاہ اور قبا پاتے تھے، مسلمانوں پر بھی ان کے کرم کی بارش عام تھی، پھر ان کی دعوت اور پان کی تقسیم کا ذکر کرتے ہیں، آخر میں لکھتے ہیں کہ

"آں ہمہ نان دہی مونس تربت او باد"

امیر خسروؒ نے اپنے نانا کا ذکر اپنی عبارت آرائی کے ساتھ مختصر طریقہ پر کیا ہے، لیکن ان کے ہم مشرب اور دوست مولانا ضیاء الدین برنی نے ان کے نانا کی تعریف بہت دل کھول کر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ وہ سلطان شمس الدین ایلتمش کے عہد میں عرض لشکر سے عرض ممالک کے عہدے تک پہونچے اور دو قرن تک دیوان عرض کے جملہ معاملات ان ہی کے حکم سے طے پاتے تھے، سلطان بلبن بھی ان کی بڑی عزت کرتا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ خوانین و ملوک کے بعد ان ہی کی نشست رہے، ان کے اختیارات لامحدود تھے، عرض کے وقت جو بھی سوار ان کو مستعد نظر

آتا، وہ اس کی تنخواہ پہلے سے زیادہ کر دیتے، اگر لشکر کے کسی سوار کو کوئی حادثہ پیش آجاتا یا وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تو وہ اس کی مدد کرتے اور کہتے کہ میں لشکر کا سردار ہوں، اگر مصیبت کے وقت لشکری کی فریاد نہ سنوں تو میرا لشکر کا سردار ہونا بے سود ہے، وہ ہر سال دیوان عرض کے ملازمین کو اپنے گھر بلاتے، ان کو خلعت دیتے اور بیس ہزار تنکے ان کو دے کر کہتے کہ وہ آپس میں تقسیم کر لیں، وہ ہر ایک کے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور منت کے طور پر کہتے کہ تم بادشاہ پر جو لشکر کا مالک ہے، مجھ پر جو لشکر کا عارض ہوں اور خود لشکر پر جو رعایا کا محافظ ہے رحم کرو اور رشوت کے طور پر لشکر سے کوئی چیز لینے کی توقع نہ رکھو، اس سے لشکر تباہ ہو جائے گا، وہ ان کو مخاطب کر کے یہ بھی کہتے اگر میں لشکر کے کام میں غفلت برتوں گا، رات دن کی فکر میں نہ لگا رہوں گا اور ان کو اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی طرح عزیز نہ رکھوں گا تو دنیا میں حرام خور سمجھا جاؤں گا اور آخرت میں کرسیٔ قضا کے سامنے شرمسار ہوں گا۔ دیوان عرض میں ان کی طرف سے کھانا کھلایا جاتا، اس وقت پچاس ساٹھ خوان کھانے کے لائے جاتے جن میں میدے کی روٹی، بکری، حلوان، کبوتر، چوزے کے گوشت، شربت اور پان ہوتے، دسترخوان پر دیوان عرض کے لوگ بیٹھتے، جو کھانا بچ جاتا وہ فقیروں کو دے دیا جاتا، ان کے پان عمدگی کے لئے مشہور تھے، پچاس ساٹھ پان والے غلام پان تقسیم کرنے میں مشغول رہتے، وہ خیرات وصدقات کے لئے بھی مشہور تھے، اور بہت سے گاؤں وقف کئے، ان کی وفات کو کئی قرن گذر گئے ہیں لیکن ان کا وقف کیا ہوا گاؤں باقی ہے، اس کی آمدنی مستحقین پر خرچ ہوتی ہے، ان کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے کھانا دیا جاتا ہے اور ختم قرآن بھی پڑھا جاتا ہے (ص ۱۱۴ - ۱۱۵) عماد الملک کی ان خوبیوں سے متاثر ہو کر سیر العارفین کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر خسروؒ نے اپنے نانا عماد الملک کی تعریف غرۃ الکمال میں لکھی ہے یہ بڑے اولیائے کرام میں سے تھے، امیر خسروؒ نے ان کو ولی تو

نہیں لکھا ہے لیکن ولی کی تمام صفات ان کے ساتھ منسوب کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

"من یتیم را آں کریم در کنف پرورش می پرورد تا پرورده شدم ہشت ساله بودم که آں بزرگ صد و سیزده ساله شد و در بہشت که ہزار ساله راه بود به یک نفس رسید، ز ہے قادر مقدمے که در دوم نفی ہزار ساله راه چشم پیش کرده۔"

امیر خسروؒ، ضیاء الدین برنی اور سیر الاولیا کے مصنف میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ انکے والد اور نانا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، مگر سیر العارفین میں ہے کہ امیر خسروؒ اپنے بھائیوں اور والد کے ساتھ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہوئے، والد کے ساتھ خسروؒ کے مرید ہونے کی روایت اس لئے مشکوک ہو جاتی ہے کہ جب ان کے والد کی وفات ہوئی تو وہ سات سال کے تھے، ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ اتنے کمسن بچہ کو مرید نہیں کر سکتے تھے، یا شاید برکت کی خاطر مرید کر لیا ہو، مگر یہ تو یقینی ہے کہ امیر خسروؒ کے بھائی اعز الدین علی بھی حضرت خواجہ کے مرید تھے، (فوائد الفواد ص ۹۰ لاہور اڈیشن) میں ہے:

"اعز الدین علی شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ کہ یکے از مریدان خاص بود۔"

مرأة الاسرار میں واضح بیان یہ ہے کہ صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ امیر خسروؒ جس زمانہ میں آٹھ سال کے تھے تو ان کے والد اپنے تین لڑکوں عزالدین علی شاہ، حسام الدین احمد اور ابو الحسن کے ساتھ دہلی آئے، یہ سلطان المشائخؒ کا ابتدائی زمانہ تھا، امیر سیف الدین لاچین اپنے تینوں لڑکوں کے ساتھ آنحضرت کے مرید ہو گئے، (قلمی نسخہ دار المصنفین جلد دوم ص ۴۴۳) اس لئے سیر العارفین کی یہ روایت تو صحیح ہے کہ امیر خسروؒ کے والد اور بھائی حضرت خواجہ سے مرید ہوئے،

سیر الاولیا کی روایت ہے کہ سلطان المشائخ جب بداؤں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں اترے، جو سرائے نمک بھی کہلاتی تھی، اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو اس جگہ ٹھہرایا اور خود بالگاہ فلاں قفس میں

سکونت پذیر ہوئے جو اس سرائے کے پاس تھی، امیر خسرو بھی اسی محلہ میں رہتے تھے، کچھ دنوں کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، کیونکہ ان کے لڑکے اپنے اقطاع پر چلے گئے، راوت عرض امیر خسرو کے نانا تھے، سلطان المشائخ اس گھر میں چلے آئے، دو سال اس مکان میں رہے، یہ برج حصار دہلی متصل مندہ پل کے نزدیک تھا، اس کی عمارت بہت ہی وسیع تھی (ص ۱۰۸)

حضرت خواجہ عماد الملک کے محل میں دو سال تک رہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ عماد الملک بھی اپنے داماد اور نواسے کے ساتھ حضرت خواجہ کے مرید ہو گئے تھے، ورنہ حضرت خواجہ کا کسی امیر کے محل میں قیام کرنا اپنی درویشی کی شان کے خلاف سمجھتے، عماد الملک کی وفات ۱۲۷۱ء میں ہوئی، جب کہ حضرت خواجہ کی عمر اس وقت ۳۷ کی تھی ۔ امیر خسرو کا بیان ہے کہ عماد الملک کی وفات ایک سو تیرہ سال کی عمر میں ہوئی، اس لحاظ سے دونوں میں عمر کا بڑا تفاوت رہا، گر پیری مریدی میں تفاوت عمر کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا ہے، خسرو کے والد کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر پچاسی سال کی تھی، حضرت خواجہ سے ان کا مرید ہونا یقینی ہے، مرید ہوتے وقت انھوں نے تفاوت عمر کا خیال نہیں کیا ۔

سیر الاولیا ہی کی روایت ہے کہ جب خسرو کے نانا کے لڑکے اپنے اقطاع سے دہلی واپس آئے تو حضرت خواجہ کو مکان خالی کرنے کو کہا اور ان کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنے لئے کوئی اور رہائش گاہ تلاش کر لیتے، حضرت خواجہ کے پاس کوئی سامان نہ تھا، کچھ کتابیں تھیں، ان کو سر پر رکھ کر ایک مسجد میں آکر مقیم ہوئے، اس کے بعد اپنے معتقدین کے اصرار پر کئی مکانات میں منتقل ہوتے رہے، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ جس رات کو حضرت خواجہ نے راوت عرض کا مکان چھوڑا اسی رات کو اس مکان میں آگ لگ گئی اور اس کی تمام رفیع اور بے نظیر عمارتیں نذر آتش

گر کر پست ہو گئیں (سیر الاولیا ص ۱۱۱ ـ ۱۰۹) یہ روایت بہت تکلیف دہ ضرور ہے ، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر خسرو اس وقت دہلی میں نہ تھے پٹیالی میں تھے ، وہ وہاں ہوتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا ، مگر سوال یہ ہے کہ جب حضرت خواجہ یہ مکان چھوڑ رہے تھے تو ان کے اور معتقدین کہاں تھے جو ان کو اپنی کتابیں سر پر اٹھا کر لیجانی پڑیں ، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمانہ کے عام تذکرہ نگاروں کا دستور تھا کہ وہ مشائخ کے سلسلہ میں سلاطین ان کے امراء اور درباریوں کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ دیتے ہیں جس سے فقر و درویشی کے مقابلہ میں بادشاہت اور امارت فروتر دکھائی دیتی ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کی بیوی کے طلاق و نکاح کے سلسلہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ صدر الدین ملتانیؒ سے تعلقات میں کشیدگی یا سلطان غیاث الدین تغلق اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے درمیان تناؤ اور ہنوز دہلی دور است کا واقعہ ، یا سلطان محمد تغلق اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی باہمی آویزش اسی قسم کی مثالیں ہیں جو ناقدانہ تجزیہ میں صحیح ثابت نہیں ہو سکتی ہیں (تفصیلات کیلئے دیکھو بزم صوفیہ ص ۱۳۵ ، ۲۴۸ ، ۲۸۳)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جب امیر خسروؒ کے ماموؤں کے گھر سے نکلے تو سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ دہلی کی سکونت سے ان پر بڑی بددلی طاری رہی ، دہلی کے قیام کی بیزاری کا حال فوائد الفواد میں لکھا ہے اور اسی سے سیر الاولیا کے مصنف نے بعض حصے لفظاً بلفظ نقل کئے ہیں ، فوائد الفواد میں ہے :

" از دروازۂ کمال بیرون در حظیرۂ کہ بر لب خندق است ، ہم نزدیک دروازۂ مذکور نیز بلند است ، و دراں حظیرہ شبیہ ا نشد ، الغرض آں در ویش مرا گفت کہ اگر می خواہی کہ

دیمان خود بہ سلامت بہ بری، ازیں شہر برو، من ہماں زماں عزیمت کردم کہ ازیں شہر بروم، ولے بموانع ماندہ شد، امروز مدت بست و پنج سال است کہ عزیمت من مقرر است ولے رفتہ نمی شود، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ چوں من ایں سخن ازاں درویش شنیدم با خود مقرر کردم کہ دریں شہر باشم چند جائے دل من می شد کہ بروم، لختے دل کردم کہ در قصبۂ پٹیالی بروم، دراں ایام ترک آنجا بودہ است، مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود، عصرہ اللہ باز فرمود کہ یک دل کردم کہ در بسنالہ بروم کہ موضعے منزہ است، الغرض در بسنالہ رفتم سہ روز آنجا بودم، دریں سہ روز ہیچ خانہ نیافتم، نہ کرایہ و نہ گروی، نہ بہائے دریں سہ روز ہر روز جہاں دیگر بودم، چوں از آنجا باز گشتم ایں اندیشہ در خاطر می بود تا وقتے جانب حوض رانی بودم در باغے کہ آں را باغ جسرت گویند، با خدائے عز و جل مناجات کردم (ص ۲۴۱-۲۴۲)

سیر الاولیا میں ہے:

از دروازۂ کمال بیروں بر لب خندق ہم نزدیک دروازۂ کمال زمینے است بلند دوراں حظیرہ شہیدانند، الغرض آں درویش مرا گفت کہ اگر می خواہی کہ ایمان خود بہ سلامت بہ بری، ازیں شہر بیروں شو، ہماں زماں من عزیمت کردم کہ ازیں شہر بروم، ولی بموانع ماندہ شد، مدت بست و پنج سال باشد کہ عزیمت من مقید است و لے رفتہ نمی شود، شیخ الشیوخ می فرمود چوں من ایں سخن ازاں درویش شنیدم با خود مقرر کردم کہ دریں شہر باشم، چند جائے دل من شد کہ بروم، لختے دل کردم کہ در قصبہ پٹیالی بروم، دراں ایام ترک آنجا بود، مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود، باز فرمود کہ یک دل کردم کہ در بسنالہ بروم کہ موضعے نزدیک است، الغرض در بسنالہ رفتم، سہ روز آنجا بودم، .... ہیچ خانہ نیافتم، نہ گروی نہ کرای، دریں سہ روز ہر روز جہان یکے بودم، چوں از آنجا

بازگشتم ایں اندیشہ در خاطر می بود، تا وقتے جانب حوض رانی بودم، در باغے کہ
آں را باغ جسرت گویند مناجات کردم .... (ص ۱۱۱ - ۱۱۰)

فوائد الفواد میں رادت عرض کے محل سے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے نکلنے اور اس
محل کے زمیں دوز ہونے کا ذکر نہیں، امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی نے بھی اس ناخوشگوار
واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے، اور اگر یہ واقعہ پیش بھی آیا تو حضرت خواجہ اور امیر خسرو کے تعلقات پر
کوئی خلل نہیں پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ سے کب مرید ہوئے؟ سیر الاولیا کے مصنف نے
بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

"وہ یعنی امیر خسرو جب بلوغ کو پہونچے تو وہ سلطان المشائخ کی ارادت کے
شرف سے مشرف ہوئے اور طرح طرح کے مخصوص مراحم و شفقت سے مخصوص کئے گئے،
ان پر خاص نظر کا لحاظ رکھا جاتا تھا، ان دنوں سلطان المشائخ امیر خسرو کے نانا رادت عرض
کے گھر میں رہتے تھے جو مندہ پل کے دروازہ کے پاس تھا" (ص ۳۰۱)

اس کے بعد سیر الاولیا کے مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو عارفانہ طور پر حضرت
خواجہ کے محرم راز ہو گئے۔

"باعتقاد صادق در محبت اسرار سلطان المشائخ بود سے، کوشید کہ شایان محرمیت
اسرار آں حضرت گشت" (ص ۳۰۱)

امیر خسرو اپنی اس ارادت پر زندگی بھر فخر کرتے رہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی
ان منقبتوں میں کیا ہے، جو وہ اپنے دواوین اور مثنویوں میں حمد اور نعت کے بعد بالالتزام
لکھتے رہے، مثلاً اپنی مثنوی مطلع الانوار میں اپنے شیخ کی جو منقبت لکھی ہے اس میں پہلے

پیر کی منقبت اس طرح بیان کی ہے:

ہر کہ زدل دامن پیراں گرفت — گنج بقا زیں دہ ویراں گرفت

ناصیۂ پیر نہ تنہا ست نور — بلکہ جہانے ست زنور حضور

ناصیۂ پیر نہ تنہا ضیا ست — بلکہ یکے از صفت کبریا ست

چشمۂ خورشید نہ تنہا ضیا ست — بلکہ زمیں را نظرش کیمیا ست

پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے روحانی منعم (آقا) ہی کی نظر کی بدولت سب کچھ حاصل کیا۔

ایں کہ مرا ہست بخاطر درون — نقد معانی ز نہایت برون

نے ز خود ایں ملک اندر یافتم — از نظر منعم خود یافتم

اسی منقبت میں رقمطراز ہیں کہ ان کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی غلامی یعنی مریدی پر فخر ہے اور وہ سلسلۂ نظامی میں منسلک ہو گئے ہیں جس کے بعد ان کو کسی آموزگار یعنی مرشد کی ضرورت نہیں:

مفتخر از وے بہ غلامی منم — خواجہ نظام ست و نظامی منم

چو نظر مرحمتش گشت یار — نیست مرا حاجت آموزگار

پھر خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ کی تعلیم پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو اور ان کو جو انوار حاصل ہوتے ہیں ان کا کچھ پرتو ان کے یعنی خسرو کے دل پر بھی پڑتا رہے

بار خدایا برضائے خودش — خاص کرم کن بلقائے خودش

تاکہ سعادت بمن آرد پیام — دولت ازاں شاہ رسد با غلام

چو وہی از نو مرادش نشاں پرتو آں بر دلِ خسرو فشاں

اپنی مثنوی شیریں خسرو میں جو منقبت لکھی تو اپنے پیر کو نبی کا بازوئے راست اسرار قضا کا محرم، میراث نبوی کا کامل نصاب، مقام طیر میں حضرت جعفر طیارؓ کی صرید اللہ فوق ایدیہم کا مظہر وغیرہ سب کچھ کہا ہے، اس مثنوی کے مرتب علی احمد خاں اسیر نے اس منقبت کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خسرو کو چونکہ اپنے شیخ کے ساتھ فنا فی الذات کا مرتبہ حاصل ہے اسی وجہ سے وہ ایسے موقع پر ہمیشہ بے اختیار و بے خود پائے جاتے ہیں ..... ایسی تمام صفات کا ذکر آپ کی محویت تامہ اور فنائیت کاملہ کے براہین قاطعہ ہیں، بایں ہمہ جدت اسلوب، ابداع اختراع، استعارات، ابہامات، ایجاد و التزام تشبیہات و صنائع کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، ہر سادہ اور معمولی مضمون کو فصاحت کا پہلو اختیار کئے ہوئے ایسے پسندیدہ طریق بلاغت سے بیان کرتے ہیں کہ رنگ سخن کی بہار ہزار گونہ بڑھ جاتی ہے (ص ۸۸ - ۸۷، علی گڑھ ایڈیشن)

ارادت کے آداب میں یہ بھی ہے کہ مرید اپنے کو مرشد کا ادنیٰ غلام اور چاکر سمجھے، اسی لئے اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں میں اپنے مرشد کے مختلف فضائل و محاسن بیان کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

مسند ز سپہر برترش باد خسرو چو ستارہ چاکرش باد

اپنی مثنوی آئینۂ سکندری میں جب پر زور نعت لکھ لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر در نثار کرتے وقت دو لوئے شاہوار حاصل ہوئے تو یہ خیال آیا کہ ان موتیوں کا تحفہ اپنے پیر کی خدمت میں پیش کروں:

نثارے کزاں در انگیختم بدرگاہ پیغمبرش ریختم

من انشاندم و آسماں برگرفت　　عطارد بپوسید و بر سر گرفت
مرا گاہ انشاندن آں نثار　　بسے دخل شد لولوئے شاہوار
دریغ آیدم کایں چنیں گوہرے　　برم تحفہ در خدمت دیگرے
ادب نایدم بیش ازیں در ضمیر　　کزاں سازم آرائش مدح پیر
پناہ جہاں دین حق را نظام　　رو قدس را پیشوائے تمام

ہشت بہشت میں جو منقبت لکھی اس میں ارادت کے آداب کے مطابق اپنے کو حضرت خواجہ کا غلام بتاتے ہیں اور حشر میں ان ہی کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہوتے ہیں'

ملک وحدت بنام ایشان است　　بندہ خسرو غلام ایشان است
نام من زاں ستودہ کیشاں باد　　حشر من در میان ایشاں باد

مثنوی دول رانی میں حمد کے بعد نعت لکھی اور جب نعت لکھ چکے تو کہتے ہیں کہ اب اپنے پیر کا ذکر کرنا ہے :

پس از دیباچہ نعت رسالت　　ز ذکر پیر بہ باشد مقالت
نظام الدین حق فرخندہ نامے　　کہ دین حق گرفت ازوے نظامے

اس مثنوی میں اس آرزو کا بھی اظہار کیا ہے

زہے بخت ارتہ کفشش بمیرم

اپنی مثنوی نہ سپہر میں دل کھول کر لکھا ہے کہ ان کو اپنے شیخ کی ارادت میں ایک عظیم پناہ مل گئی ہے اور وہ راہ مستقیم پر آگئے ہیں اور خوش ہیں کہ ان کو ان کے ضمیر کی بدولت ایک دستگیر مل گیا ہے'

ارادت گہ او پناہے عظیم　　الف در ارادت رہے مستقیم

خوش آندم کہ من از اعتقاد ضمیر گرفتم بہ حق دست آں دستگیر

اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اس شاہ کا ہاتھ میرے لئے ایک کشتی بن گیا ہے جس کے بعد (تصوف کا) بحر میرے لئے کھل گیا ہے، میں نے ان کے منھ سے جو لعاب پایا تو اس کے میرے منھ یعنی میری شاعری میں آب و تاب پیدا ہو گئی، جو زلال میں نے پایا اسی کی تلاش خضر کو ہے، اور اسی کی بدولت (خضر کی طرح) زندہ ہوں، اگر میں اس میں سے دو قطرے دوات میں ڈال دوں تو وہ بحر ظلمات میں آب حیات بن جائیں اور جب میں ان قطروں سے ایک قطرہ اپنے قلم میں منتقل کرتا ہوں تو اس سے ایک دریا بہہ نکلتا ہے، میرے یہ قطرے (اشعار) سمندر کی طرح ہیں لیکن میں ان سے اپنے پیر کی صفات کا احاطہ نہیں کرسکتا ہوں اسی لئے میں اپنے سر کو شرم سے اٹھا نہیں سکتا ہوں جب کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ میں نے ان سے جو کچھ پایا ان پر نچھاور کردوں۔

بہ نہ بحر از اں جانم راہ شد چو کشتی مرا دست آں شاہ شد

من از وے لعابِ دہن یافتم کہ زیں گونہ آب دہاں یافتم

زلالم کہ خضر آب جوئے ویست بداں زندہ ام چو زجوئے ویست

دو قطرہ کزاں در دوات افگنم بہ ظلمت در آب حیات افگنم

چو آں قطرہ از خامہ رانم بروں ازاں قطرہ دریا فشانم بروں

شد ایں قطرہا گرچہ دریا نظیر نگردد محیط صفت ہائے پیر

دلے زیں خجالت نیارم برو کہ ہم زان اولی نثارم برو

ضمیرش کہ دریائے رحمانیست دو خان فلک زو یکے خانی است

پذیرائی ایں قطرۂ خویش باد بریں قطرہ موجش زہر بیش باد

حضرت خواجہ سے امیر خسرو کی مریدی کی دھوم ان کے دوستوں اور معاصروں میں بھی رہی "تاریخ فیروز شاہی" کے مصنف مولانا ضیاء الدین برنی، امیر خسرو کے پیر بھائی، گہرے دوست اور ہم نشین تھے، وہ لکھتے ہیں کہ

"برسوں امیر خسرو، امیر حسن اور میرے درمیان محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے ہیں، وہ نہ میرے بغیر رہ سکتے تھے اور نہ میں ان کی ہم نشینی کے بغیر زندگی بسر کر سکتا تھا:

مولانا ضیاء الدین برنی نے امیر خسرو کی جو تعریف چند سطور میں کی ہے اسی اجمال کی تفصیل لکھ کر بعد کے ارباب علم اپنا خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں، مولانا ضیاء الدین لکھتے ہیں کہ

"امیر خسرو جیسا نادر عالم اگر محمود یا سنجر کے عہد میں ہوتا تو ظاہر اور غالب ہے کہ یہ بادشاہ اس کو ولایت اور اقطاع انعام میں دے دیتے:

پھر ان کے شاعرانہ کمالات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"عہد علائی میں شعراء بھی ایسے تھے کہ ان کے بعد بلکہ ان سے پہلے بھی زمانہ کی آنکھ نے ان کی مثل کوئی شاعر نہیں دیکھا تھا، خاص طور پر امیر خسرو جو قدیم اور نئے سب شاعروں کے خسرو یعنی بادشاہ ہیں، جو اختراع معنی، تصنیفات کی کثرت اور رموز غریب کے اظہار میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اگر وہ دوسرے اساتذہ نظم اور نثر کے ایک دو فن میں بیمثال ہوتے تو امیر خسرو جملہ فنون میں ممتاز اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں، ایسا صاحب فن کہ جو شاعری کے جملہ فنون میں استاد اور سرآمد مانا گیا ہو، نہ گذشتہ زمانہ میں گذرا ہے اور نہ بعد کے زمانہ میں قیامت تک کبھی پیدا ہوگا یا نہیں، امیر خسرو نے فارسی نظم

اور نثر میں ایک کتب خانہ تصنیف کیا ہے اور اپنی سخنوری کا سکہ جمایا ہے، شاید خواجہ ثنائی نے یہ شعر امیر خسرو ہی کے متعلق کہا ہے :

بخدا ار بہ زیر چرخ کبود ٭ ہمچو او ہست و بود و خواہد بود

(ص ۳۵۹)

یہاں تک تو امیر خسرو کے شاعرانہ کمالات پر تبصرہ ہے لیکن میرے اس مقالہ کے لئے ان کی تحریر کا اہم ٹکڑا یہ ہے :

" اس تمام فضل و کمال اور فصاحت فن و بلاغت کے ساتھ وہ مستقیم الحال صوفی بھی تھے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، وہ شیخ (نظام الدین) کے خاص مریدوں میں تھے، میں نے اتنا عقیدت مند مرید کوئی اور نہیں دیکھا، عشق و محبت الٰہی سے ان کو پورا حصہ ملا تھا، صاحب سماع اور صاحب حال و وجد تھے (ص ۳۵۹)

سیر الاولیا کے مصنف بھی امیر خسرو کے پیر بھائی رہے ہیں، وہ بھی رقمطراز ہیں کہ

" امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف و خلف بودہ است، و در اختراع معانی و کثرت تصنعات غریبہ نظیر نداشت و مع ذالک الفضل والکمال والفنون والبلاغ صوفیٔ مستقیم الحال بود و بیشتر عمر او در صیام و قیام و تعبد و تلاوت گذشتہ است واز مریدان خاص حضرت سلطان المشائخ شیخ شیوخ العالم سید نظام الحق والدین محمد احمد بداؤنی البخاری الچشتی قدس اللہ سرہ العزیز بود و آں چناں مرید و معتقد من دیگرے را ندیدم واز عشق و محبت نصیبے تمام داشت و صاحب سماع و وجد و صاحب حال بود (ص ۸۸)

پھر بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ سے امیر خسرو کی مریدی کا ذکر کیا ہے

والہانہ انداز میں کیا ہے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ سیرالعارفین میں ہے کہ امیر خسرو کا پورا خاندان ان سے مرید تھا، اخبار الاخیار میں ہے :

"از یاران و مریدان قدیم شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ و غایت اعتقاد و محبت بہ شیخ داشت و شیخ را نیز بوے نہایت شفقت و عنایت بود، ہیچ کس را بہ خدمت شیخ آن قرب و محرمیتی کہ امیر خسرو داشت نبود" (ص ۹۳)

مراۃ الاسرار میں ہے :

"سلطان الشعراء امیر خسرو میر سیف الدین قدس سرہٗ در جمیع کمالات صوری و معنوی نظیرے نداشت و محبوب ترین مریدان پاک اعتقاد حضرت سلطان المشائخ بودہ کہ در خلاء و ملا بخدمت آں حضرت محرمیت تمام داشت" (ورق ۴۴۳)

سفینۃ الاولیا میں ہے :

"مرید و معشوق و نفس ناطقہ و منظور نظر سلطان المشائخ اند (ص ۱۶۸)

خزینۃ الاصفیا میں ہے :

"حضرت شیخ نظام الدین اولیا را نیز مثل وے (امیر خسرو) محرم اسرار و یار وفادار و محبوب مطلوب نبود" (ص ۳۲۹)

خسرو کی زندگی کا یہ اعجاز ہے کہ ایک طرف تو اپنے سارے معاصر سلاطین دہلی کے محبوب ہمدم ہمراز اور ہم جلیس بنے رہے، معزالدین کیقباد جیسا رند اور سرمست سلطان بھی ان کا گرویدہ رہا، جلال الدین خلجی جیسا نیک دل فرماں روا بھی ان کا فریفتہ تھا، علاؤ الدین خلجی جیسے سخت گیر حکمراں کو بھی ان کے بغیر چین نہیں ملتا تھا، قطب الدین مبارک شاہ خلجی جیسا لاپروا اور غیر ذمہ دار سلطان بھی ان کا گرویدہ رہا، غیاث الدین تغلق اور محمد ابن تغلق جیسے بیدار مغز

فرماں رواؤں کے درباروں میں بھی ان کو محبوبیت حاصل رہی، وہ ان سلاطین کے درباروں میں اس طرح رہے جیسے بھرے ہوئے دودھ کے پیالہ پر گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوں، ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کسی حال میں بھی اپنے معاصر سلاطین سے ملنا پسند نہ کرتے، ان کے اس رویہ کی وجہ سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو ان سے پرخاش بھی پیدا ہوگئی تھی، مگر امیر خسرو نے شاہی دربار سے منسلک رہنے کے باوجود اپنے مرشد کی غلامی، تابعداری اور اطاعت گذاری میں ایک بے مثال نمونہ پیش کیا، ان کے شاہی آقاؤں میں سے کسی کو ان سے یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے مرشد کے ادنیٰ غلام اور چاکر کیوں ہیں، اور نہ ان کے مرشد کو یہ گلہ ہوا کہ وہ دربار داری کر کے دنیا سے کیوں ملوث ہوئے، وہ اپنے شاہی آقاؤں اور روحانی پیشوا کے درمیان بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز دھار کے پل صراط پر پوری زندگی کامیابی سے چلتے رہے، وہ شاہی محلوں، شاہی درباروں، یا شاہی کیمپوں میں ہوتے تو ان کا دماغ تو ان جگہوں پر ضرور ہوتا مگر ان کا دل اپنے روحانی مرشد کے خرقہ و کلاہ میں اٹکا رہتا، وہ اپنے شاہی آقاؤں کو اپنی قصیدہ خوانی، مثنوی نگاری، خوش گلوئی، فن موسیقی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے خوش کرتے مگر اپنے روحانی آقا کے پاس پہونچ جاتے تو کبھی ان کی خدمت میں منقبت کہکر اپنی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے، کبھی خلوت میں ان کے ادنیٰ خادم بن کر رہتے، کبھی ان کے ساتھ مجلس سماع میں رقص کرتے، کبھی خوش الحان قوال بن کر شراب معرفت کے خم کے خم لنڈھاتے، کبھی سوز عشق کا درس حاصل کرتے، کبھی مجلس میں بیٹھ کر ان کے ملفوظات قلمبند کرتے رہتے، کبھی ان کی گرانی طبع کو اپنی محبوبانہ اداؤں سے دور کرنے کی کوشش کرتے، سیرالاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ سلطان المشائخ جب عشا پڑھ لیتے تو کوٹھے پر جاتے، وہاں کچھ دیر عبادت کرتے، پھر ان کے سونے کے لئے کھاٹ بچھائی جاتی، اس پر بیٹھ جاتے، ان کے لئے تسبیح آتی،

اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی، صرف امیر خسرو آتے، وہ ان کے سامنے بیٹھ کر ہر قسم کی باتیں اور حکایتیں سناتے، سلطان المشائخ سن کر ان کی خاطر اپنا سر مبارک ہلاتے رہتے، وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے کہ ترک کیا کیا خبریں ہیں، اس سے امیر خسرو کو اور بھی فراخدلی پیدا ہو جاتی، امیر خسرو کچھ پڑھ کر سنانے بھی لگتے، اس وقت چھوٹے بچے، کچھ رشتہ دار اور مولانا زادوں کو بھی حاضر ہونے کی اجازت مل جاتی اور وہ پاؤں دابنے لگتے، اسی موقع کے لئے امیر خسرو نے کہا ہے:

خفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

(سیر الاولیا ص ۱۲۶ - ۱۲۵)

رات کو اپنے روحانی آقا کے ساتھ خلوت آرا ہوتے لیکن دن کو اپنے شاہی آقا کے یہاں پہونچ کر انجمن آرائی کرتے، سیر الاولیا کے مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ان کا مسلک یہ تھا:

کمر بخدمت سلطاں بہ بند و صوفی باش

اس مصرع کا پورا شعر یہ ہے:

مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست
کمر بخدمت سلطاں بہ بند و صوفی باش

امیر خسرو کی صوفیانہ زندگی اسی شعر کی تفسیر ہے، وہ سلاطین دہلی کی دربار داری کے لئے کمر بستہ ضرور رہے مگر اسی کے ساتھ شاہراہ طریقت پر بھی بڑی کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ:

"سلطان الشعراء برہان الفضلاء امیر خسرو شاعر رحمۃ اللہ علیہ گوئے سبقت فضل از متقدمان و متاخران بردہ بود و باطنے صاف داشت طریقۂ اہل تصوف در صورت و سیرت او پیدا بود اگرچہ تعلق بہ بادشاہاں داشت"

اسی بات کو اور بھی واضح کر کے شیخ عبدالحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے :

"وہ اپنے علم و فضل کے باوجود تصوف کی صفات اور درویشوں کے احوال سے موصوف تھے، اگرچہ بادشاہوں سے تعلقات رکھتے اور ملوک و امراء سے خوش طبعی اور ظرافت سے اختلاط کرتے لیکن ان سب کی طرف ان کا دل متوجہ نہ تھا۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان کے کلام میں جو برکات ہیں وہ گنہگاروں کے دل میں نہیں پائی جا سکتی ہیں۔ برکات سے محروم لوگوں کے کلام کو مقبولیت اور قلبی تاثیر حاصل نہیں ہو سکتی۔"

(ص ۹۲)

دربار سے منسلک ہونے کے باوجود امیر خسرو کو اپنے مرشد سے جو قلبی لگاؤ رہا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے ایک بار ان سے فرمایا کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں لیکن تم سے تنگ نہیں آتا ہوں، دوسری بار اسی بات کو اس طرح فرمایا کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں حتیٰ کہ اپنے آپ سے تنگ آجاتا ہوں لیکن تم سے تنگ نہیں آتا ہوں۔

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

(باقی)

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات

از
عشرت افروز ایم۔ اے۔ کراچی

(۳)

سید صاحب کے ادبی مضامین پر ایک نظر

معارف میں سید صاحب کے جتنے مضامین شائع ہوئے، وہ کچھ تو ادبی ہیں، کچھ تاریخی، کچھ علمی اور کچھ مذہبی ہیں اور کچھ وہ خطبات ہیں جو انھوں نے کسی ادبی مجلس میں دئے، کچھ اردو سے متعلق مقالات اور کچھ اردو کی اہم کتابوں پر ان کے مقدمات ہیں، اس مقالہ میں ان کے ادبی مضامین کا مطالعہ زیادہ کرنا ہے۔

ان کے ادبی مضامین نقوش سلیمانی کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے تھے اس میں پہلے ان کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ ترقی اردو کی صدارت کرتے ہوئے پڑھا تھا، وہ بڑے اچھے مورخ بھی تھے، تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے ان کی ادبی تحریروں میں بھی تاریخ کی گہری چھاپ ملتی ہے اس میں وہ پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملانا اور جوڑنا ہے، اس کا تمدن مصر، شام، عجم، روم اور یونان کے تمدنوں کا خلاصہ ہے، اس کے علوم و فنون ہندستان، بابل، فارس، یونان اور اسکندریہ کے تجربہ خانوں اور درسگاہوں کا عطر ہیں، اس کی نسل تورانی، آریائی اور سامی قوموں کا مجموعہ ہے، اس کی زبان میں سنسکرت، پہلوی

قبطی، سریانی، لاطینی اور یونانی اصطلاحات کا ذخیرہ ہے۔ اسلام کی دنیا میں نسل، وطن، اور زبان کی کوئی تفریق نہیں، جس طرح دنیا کا ہر گوشہ اس کا وطن ہے، دنیا کا ہر لغت اس کی زبان ہے (ص ۳) لکھ کر کہتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب کہ سندھ کے کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور وہ قرآن کی زبان یعنی عربی تھی (ص ۳) ان کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے کہ عرب جس ملک میں گئے یا تو وہاں کی زبان بدل گئی اور بدل نہ گئی تو ان کی زبان کے الفاظ نے دیسی ملکوں کے الفاظ سے مل جل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار کر دیا، نئی فارسی، نئی ترکی، نئی ملائی، نئی بربری اور نئی ہندوستانی نے اسی طرح جنم لیا (ص ۴) اردو کی تاسیس پر مزید مورخانہ نظر اس طرح ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس حملہ کی ابتدا مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھی جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی ہے اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظ ماتقدم کے طور پر سندھ کا قبضہ ہے، تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے گذر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤں میں مل گیا، یہ اردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہے (ص ۴-۵) پھر ایک کھلی حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں اور مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے (ص ۵) اپنے اس دعوے کو مستحکم کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ اس کا پیدا ہونا ضرورۃً اور مجبوراً تھا۔ مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے، اس پر دو سو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہوگئی، اردو شاہجہاں کے عہد کی

دکار بتائی جاتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں یہ پیدا چلی تھی، امیر خسرو کی زبان میں ہندی الفاظ اور کبیر داس کی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش اردو کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتی ہے، رفتہ رفتہ یہ آمیزش بڑھتی گئی اور فوجی معسکروں میں جو ہندوستان کی مختلف اقوام کا سب سے زیادہ مخلوط مجموعہ تھا یہ بولی زبان بن گئی اور اسی لئے عام لوگ اس کو اردو کہنے لگے، اردو ترکی زبان میں معسکر یعنی فوجی پڑاؤ کو کہتے ہیں، اسی بنا پر ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اسکا نام ہندوستانی ہے (ص ۷) سید صاحب اردو زبان کی تاسیس کی ایک اور وجہ یہ لکھ کر بتاتے ہیں کہ بمبئی اور مدراس کے احاطوں میں ہر سو میل ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، ٹامل، تیلگو، خدا جانے کتنی زبانیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی (ص ۸)

سید صاحب نے یہ ساری باتیں آج سے کئی قرن پہلے کہی تھیں، اب جب کہ اردو کی تاسیس کے سلسلہ میں بہت سی نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطبے میں اردو کے متعلق جو چند اشارے کئے تھے وہ صحیح تھے، اور ان ہی کے اجمال کی تفصیل بیان کی جارہی ہے، انھوں نے اس وقت تو یہ دعوی کیا تھا کہ یہ ہندوستان کی عام زبان ہے اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس زمانہ میں قومی تعصبات کے باوجود ہندوستان کے کونے کونے میں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، پشاور مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اسی کی عملداری تھی، گو بیچ بیچ میں پشتو، پنجابی، بنگالی اور

زبانیں بھی آڑے آجاتی ہیں (ص ۸) مگر اب تقسیم ہند کے بعد اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا ہے۔

اسی خطبہ میں یہ بھی فرمایا کہ اردو زبان اپنے قواعد و لغت کی تدوین میں سب سے زیادہ انگریز قوم کی ممنون ہے (ص ۹) اس سلسلہ میں اردو زبان بولنے والوں کو شرمندگی سے بچانے کی خاطر یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی، عربی زبان کے قواعد اور لغت کی تالیف سب سے پہلے اخفش، سیبویہ، اصمعی اور ابو علی فارسی وغیرہ نے کی جو سب کے سب عجمی تھے، اس بنا پر اگر فالن صاحب نے اردو کی سب سے پہلی ڈکشنری لکھی یا جان گلگرسٹ صاحب نے ہندوستانی قواعد کی کتابیں یا ڈی ٹاسی نے اردو ادبیات کی سب سے پہلی علمی تاریخ مرتب کی تو تعجب کی بات نہیں، (ص ۹) اسی کے ساتھ سید صاحب یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ زبان کو تکلفات سے بری کر کے سادہ علمی اور تحریری زبان بنانا انگریزوں کی رہنمائی سے ہوا، ان کا خیال ہے کہ اس کو سادہ اور بے تکلف بنانے کا فخر مولانا اسماعیل شہیدؒ (سن ۱۸۳۱ - ۱۷۸۲ء) کو حاصل ہے، ان کی تقویۃ الایمان آج بھی فصاحت اور زبان کی سادگی کا بہترین نمونہ ہے، (ص ۹) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن بھی بیان کی صفائی میں کم نہیں، اس کے بعد مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالبؔ کے خطوط کی زبان ہے جو غالب کے بقائے نام کا ان کے اردو اور فارسی دواوین سے زیادہ محفوظ ذریعہ ہے (ص ۹) پھر وہ بڑی فراخ دلی سے اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کو ہر قسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی اور اخلاقی مباحث و مضامین کے قابل بنایا، سرسید کی ذات تھی (ص ۹)

اس خطبہ میں سید صاحب نے ہندی اور اردو کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا اور اس کو ایک ناگوار قضیہ بتایا تھا (ص ۱۰) مگر اس ناگوار قضیہ میں اس وقت سے اب تک ہندوستان میں اردو، ہندی سے شکست کھا چکی ہے، انھوں نے ساٹھ برس پہلے یہ بات کہی تھی کہ اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک حریفِ مقابل سمجھی جاتی ہے، پنجاب میں اس کو پنجابی سے مقابلہ ہے، صوبہ متحدہ اور بہار میں ہندی زبان سے، اڑیسہ میں اڑیا زبان اسکی حریف ہے، بمبئی میں مرہٹی، سندھی، گجراتی اور کنڑی، چار پہلوانوں سے اس کا معرکہ ہے، مدراس میں ٹامل، تیلگو اور اردوی سے دو چار ہے (ص ۱۰) انھوں نے اس سلسلہ میں اردو کو تلوۂ معلّٰی کا پہلوان کہا ہے (ص ۱۰) یہ پہلوان سب سے معرکہ آرائی میں آج بھی مشغول ہے مگر اس کے بازی مارنے کا امکان نہیں۔

انھوں نے اس خطبہ میں اپنی اس حقیقی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اردو زبان ہندوستان کے تمام باشندوں کی مشترک زبان قرار دی جائے، مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے، مگر ان کا یہ بھی پیام تھا کہ اگر بدقسمتی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی مشترک زبان بن جائے کیونکہ صوبوں کی چھوٹی چھوٹی زبانیں اور بولیاں جہاں مسلمانوں کی ایک تعداد آباد ہے، ان کے لئے مذہبی، علمی اور تعلیمی سرمایہ فراہم نہیں کر سکتی ہیں (ص ۱۱) ان کے اس پیام پر آج بھی بڑی سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے، انھوں نے اب سے نصف صدی پہلے اس کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اصول حکومت اور آئین عدل کی رو سے گورنمنٹ نے ہر احاطہ کی سرکاری اور دفتری زبان کو اس احاطہ کی عام ملکی زبان قرار دیا ہے جو کہیں بنگالی ہے کہیں مرہٹی ہے اور کہیں گجراتی ہے اور یہی وہاں کے سرکاری مدرسوں کی ذریعہ تعلیم اور سکول کی زبانیں ہیں۔

اس حالت میں مسلمان لڑکے تنہا اردو لیں تو سرکاری دفتروں میں وہ کارآمد نہیں رہتے، اسلئے وہاں ان کے لئے جگہ نہیں نکل سکتی اور اگر اردو نہیں لیتے تو وہ اپنے کو فنا کرتے ہیں، اور اگر اردو اور دوسری دیسی زبان دونوں ساتھ لیں تو وہ اپنے مقابل کے ہم وطن طالبعلموں کے مقابلہ میں کمزور رہتے ہیں (ص ۱۱) انھوں نے اپنی دوربینی اور مآل اندیشی سے اس وقت جو یہ ساری باتیں کہی تھیں، ان سے ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمان تقسیم ہند سے اب تک دوچار ہیں اور اس کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے مگر سید صاحب نے اس کی پرزور وکالت کی ہے کہ ہر شخص کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہئے، اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دنیائے گذشتہ اور موجودہ میں سیکڑوں قومیں عروج و کمال تک پہونچ چکی ہیں لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیر زبان کی تعلیم قوموں کے عروج اور ارتقاء کا باعث ہوتی ہے (ص ۱۴)

اس خطبہ میں اس پر بھی زور دیا گیا تھا کہ اردو کے لئے زبان کے اصول و قواعد کی تدوین اور اس کے لئے قاموس، لغات اور ڈکشنریوں کی تالیف پر زیادہ توجہ صرف کی جائے (ص ۱۵) ان کی یہ آواز صدا بصحرا نہ ہوئی اور اب تک اردو کے اچھے اچھے قواعد لکھے جاچکے ہیں اور لغت پر اہم کام جاری ہے، اس موقع پر اپنے اس افسوس کا بھی اظہار کیا تھا کہ اردو میں مذہب، تاریخ اور شاعری کے سوا ہر فن صفر یا قریب صفر کے نظر آئے گا (ص ۱۷) مگر اس وقت سے اب تک صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے، انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے محقق ماخذوں کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سیاسی اور علمی دونوں حیثیت سے نہایت ضروری ہے، مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کی تاریخ ہندوستان انگریزی فکر و دماغ کا بالکل عکس ہے (ص ۱۸) ان کی یہ آواز

بھی سنی گئی، خود دارالمصنفین کے اندر سید صاحب کی تحریک پر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی کوشش سے تاریخ ہند پر ۲۲ جلدیں لکھی جا چکی ہیں،

اس خطبہ کے اٹھارہ[۱۸] برس کے بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں انھوں نے "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے انجمن اردوئے معلّٰی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مقالہ پڑھا، جس میں ایک بار پھر اردو زبان پر بڑی پُرمغز بحث ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مقالہ کیا لکھا تھا بلکہ ادب، تاریخ اور لسانیات کا ایک درس دیا ہے، اس میں علم کا عرفان، نظر کی وسعت، فکر کی گہرائی اور تحقیق کی گیرائی پورے طور پر نظر آتی ہے، پوری تحریر میں بڑا وزن اور وقار ہے جس کے بارے قارئین پڑھتے وقت دبتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی محسوس کرتے ہیں کہ ان کو کچھ سکھایا جا رہا ہے اور وہ کچھ سیکھ رہے ہیں، ایسی باوزن اور باوقار تحریریں موجودہ دور میں کسی اور اہل قلم کے یہاں دیکھنے میں نہیں آتی ہیں، ان کے یہاں وہ سنجیدگی، متانت اور بصیرت نظر نہیں آتی جو سید صاحب کے یہاں ہے، وہ مغرب کے لٹریچر سے متاثر ہو کر وہاں کی لالٹینوں کی روشنی تو ضرور دکھا دیتے ہیں مگر تحریر کو جاندار بنانے کے لئے جو عمق ہونا چاہئے وہ عموماً نہیں ہوتا، یہ حصہ سید صاحب ہی کا تھا، اس مقالہ میں مسعودی کی مروج الذہب، البیرونی کی کتاب الہند، ابن ندیم کی الفہرست، ابن حوقل اور بشاری کے سفرنامے، مخدوم اشرف کچھوچھوی کے ملفوظات کے مجموعہ لطائف اشرفی اور امیر خسرو کی غرۃ الکمال وغیرہ کے حوالے ہیں جن سے اردو کے موجودہ لکھنے والے بالکل ناآشنا ہو چکے ہیں مگر سید صاحب نے ان ہی کی مدد سے ہندوستان کی مختلف زبانوں اور خصوصاً اردو کی بڑی مفید تفصیلات پیش کی ہیں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بیشمار

ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے تھے زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں پیمایش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروج ہیں، ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی، جن کے خط بھی مختلف ہیں، سید صاحب نے البیرونی کے حوالے سے ان رسم الخطوں کی نشان دہی یہ لکھ کر کی ہے کہ ایک خط سدھ ماترک کشمیر بنارس اور مدھیہ پردیش یعنی آریا ورت میں جاری تھا، مالوہ کے حدود میں جو خط جاری تھا اس کو ناگر کہتے تھے اور یہ بھاتیہ اور کچھ سندھ میں مروج تھا، ملواری خط جنوبی سندھ میں استعمال ہوتا تھا کنٹری کرناٹک میں، انتری آندھرا میں دروادڑی دراوڑ میں، لاری لاردیش یعنی گجرات اور کاٹھیاواڑ میں، گوڑی پورب دیش میں اور بیک شک، اودینور میں رائج تھا (ص ۲۱ – ۲۳) اس ملک میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں ان کے نام بھی سید صاحب نے مختلف کتابوں سے بڑی محنت سے جمع کئے ہیں اور وہ یہ تھیں: سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، گجراتی، تلنگی، معبری، دھورسمندری، اودھی، دہلوی، ملتانی، مارواڑی، مرہٹی، کرناٹکی، افغانی، بلوچستانی، کچھی، کنٹری، اڑیا، ٹامل، تلیگو، ملیالم، ترہتی، بھوجپوری، پنجابی، پالی، پراکرت، سنسکرت، ماگدھی، شورسینی، پیشاچی، اونگک اور اپ بھرنش وغیرہ (ص ۲۴-۲۵)

سید صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور بھاشاؤں کی کثرت دیکھ کر متحیر ہو گئے، وہ اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے

کسی صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اسے پورے ملک پر محیط کر دیا جائے۔ اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی، ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے۔ ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی، وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے (ص ۳۹) ایسے کچھ الفاظ کی ایک فہرست سید صاحب نے دے کر ہمارے ذہن کو ان کی طرف منتقل کیا ہے، وہ مذہبی، تمدنی، معاشی، سیاسی اور کاروباری الفاظ یہ ہیں، ان کا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا: اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، دعا، خیرات، رسول، پیغمبر، وحی، دوزخ، بہشت، بادشاہ، وزیر، صوبہ دار، قاضی، دیوان، تحصیلدار، ضلع دار، کارندہ، گماشتہ، واصل باقی نویس، خزانچی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، جمع بندی، مالگذاری، جمع خرچ، روزنامچہ، انگور، سیب، انار، بہی، خربوزہ، تربوز، سردہ، بادام، منقی، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، خوبانی، چلغوزہ، پلاؤ، فیرنی، بریانی، زردہ، قورمہ، شوربا، کباب، قیمہ، کوفتہ، حلوا، شربت، فالودہ، برف، آبخورہ، چپاتی، بالوشاہی، قلاقند، برفی، شکرپارے، نورے، نقل، چینی، زعفرانی، مخمل، کمخواب، تن زیب، چارخانہ، کامدانی، کرتہ، چکن، میرزائی، نیم آستین، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، موزے، ازاربند، کمربند، پان دان، اگالدان، خاصدان، دیگ، دیگچی، چمچہ، رکابی، پیالہ، صابون، باورچی، رکابدار، خانساماں، دیوارگیر، قندیل، فانوس، چق، چلمن، پردے، سوار، شہسوار، نیمچی، عقیق، فیروزہ، سنگ مرمر، دست بند، جہانگیری، بازو، نورتنے، جوشن،

ہیکل، موتی، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کرزیب وغیرہ (ص ۲۹ - ۳۰) اس کے بعد سید صاحب اردو کی تاسیس کے سلسلہ میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، کیونکہ عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر، عراق، سیراف اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندروں سے گذر کر گجرات ہو کر بحر ہند کے کنارے سفر کرتے تھے، انکے میل جول سے یہ نئی زبان بنی جس میں تمام فعل اور حروف ہندوستان ہی کی بولیوں کے ہیں، البتہ آدھے اسما مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں، سندھی کے بعد ملتانی اور پنجابی زبانوں پر مسلمانوں کا اثر پڑا، یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، اردو کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی، ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو محسوس ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ عوام کو اور ان سے زیادہ صوفیوں کو تھی جو ہر بولی کے انسانوں تک پہونچنا اپنا فرض سمجھتے، چنانچہ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ نصیر الدین اودھیؒ، خواجہ بندہ نواز دکنیؒ، شیخ شرف الدین منیری بہاریؒ، مخدوم اشرف کچھوچھویؒ، شیخ علاؤ الدین بنگالیؒ، مخدوم عبد الحق ردولویؒ، شیخ عبد الوہاب متقیؒ اور شیخ علی متقیؒ کے یہاں اس زبان کے اثرات ملتے ہیں۔

سید صاحب نے ان تمام باتوں کو مستند حوالہ جات اور مفید علمی معلومات اور اقتباسات فراہم کرکے ایسے مدلل اور محققانہ انداز میں لکھا ہے کہ ان سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا

جاسکتا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے دلائل کو رد کرنا آسان بھی نہیں، ان کی اپنی تحقیق یہ تھی کہ شروع میں اردو کا نام اردو نہ تھا، یہ کہیں دہلوی، کہیں دکھنی، کہیں گوجری، اور کہیں ہندی وہندوی، کہیں قلعۂ معلی کے لحاظ سے اردوے معلی کہلائی۔ اس کی تائید میں یہ لکھتے ہیں کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ فرمایا، اُس کو انھوں نے ہندی ہی کہا (ص ۶۰)۔ یہ تمام باتیں لکھ کر سید صاحب فرماتے ہیں:۔

" انگریزوں نے دہلی کے اردوے معلی کو اجاڑ کر جب کلکتہ کے فورٹ ولیم میں اپنا نیا اردوے معلی بناکر کھڑا کیا، تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا، کہ اگر ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے، تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے، اس کے لئے ضرورت تھی، کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک مسلمانوں کے سر تھوپا گیا، اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا، اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا، اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں، یہ سبب آغاز اس انجام کا، جو آج اردو ہندی کے مباحث کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔" (ص ۶۱)

سید صاحب کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انگریز بیچ میں نہ ہوتے، تو اس ملک کی زبان ایسی بنتی جس کو ہندو اور مسلمان دونوں گوارا کرتے، اور ان دونوں میں زبان کا جھگڑا نہ پیدا ہوتا، اور ملک میں ایک ایسی زبان نمودار ہوتی جس کو ہندوستانی کہنا صحیح ہوتا، اس میں فعل اور حروف تو ہندوستان کی بولیوں ہی کے ہوتے، کچھ اسماء عربی اور فارسی سے لئے جاتے، مگر انگریزوں نے اردو اور ہندی کا جھگڑا پیدا کرکے دو مستقل زبانیں بنا دیں، اس رائے میں بہت کچھ وزن ہے،

سید صاحب اپنے مضامین میں برابر اس کا اظہار کرتے رہے کہ اُردو کا نام اگر ہندوستانی ہوجاتا تو اُردو اس ملک کی مشترکہ زبان کی لڑائی جیت لیتی، مگر ایک غیر ملکی لفظ کے نام کے ساتھ مشہور ہوئی تو اس کے مخالفین اس کو ایک غیر ملکی زبان سمجھنے اور سمجھانے کی مہم برابر آئے، جس سے اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، اس رائے میں بھی بڑی حقیقت ہے،

سیّد صاحب کو جہاں اپنی مادری زبان اردو سے محبت تھی، وہاں ان کو اپنے وطن سے بھی لگاؤ تھا، اس لئے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھنے ہیں تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت میں کابل اور بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمراں ہے، دوسری طرف سواحل عرب و افریقہ سے لے کر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہوئی ہے، تمام بیرونی قوموں کے لئے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے، وہ اردو ہے، یہی سبب ہے کہ یہ زبان ان تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے،

جہاں ہندوستانیوں کی آمدورفت ہے، برما، سیلون، آسام، مالدیپ، انڈمان، ماریشس، سنگاپور، پورٹ بلیر، اور افریقہ کے ان تمام مختلف ملکوں میں جہاں جاکر ہندوستانی بسے ہیں، اس زبان کو اپنے سینوں سے لگا کر ساتھ لے گئے ہیں، اور سواحل عرب میں، عدن، جدہ، بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے (ص ۶۷ - ۶۹) سید صاحب نے یہ بات چوالیس ۴۴ سال پہلے کہی تھی، اور اب جب کہ ہندی ہندوستان کی قومی زبان بن چکی ہے، اور اس کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے، اس نئے ماحول میں بھی سید صاحب کے یہ مشورے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، اور اگر فراخدلی کو راہ دی جائے، تو یہ مشورہ اب بھی قابل قبول سمجھا جا سکتا ہے،

اس مقالہ میں سید صاحب نے اردو بولنے والوں کو حسب ذیل مفید مشورے بھی دیئے :-

۱- اس زبان کا نام اردو کے بجائے ہندوستانی رکھا جائے، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے،

(۲) اردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو الفاظ آکر مل چکے ہیں، وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، مگر ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہئے، الا یہ کہ علمی اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی منگنی مانگنے کی ضرورت پیش آئے، جہاں تک ہو لفظوں کی عربی اور فارسی جمع، اور واو عطف اور فارسی اضافتوں سے

جھٹک بچا جائے، ان کی جگہ ہندوستانی جمع اور عطف و اضافت کو رواج دیا جائے،

۴۔ ہندی کے ان لفظوں کو جو ہندوستانی یعنی اردو میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سیکڑوں اچھے اور پیارے لفظ تھے، جن کو ٹکسال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے،

پہلا مشورہ یعنی اردو کا نام ہندوستانی ہو، اردو بولنے والوں نے تو قبول نہیں کیا لیکن دوسرے مفید اور خیرخواہانہ مشورے قابل قبول سمجھے گئے، اور ان پر بڑی حد تک عمل ہو رہا ہے،

یہ مقالہ، ۵ صفحے میں ختم ہے، لیکن اس کو لکھنے میں سید صاحب نے ادب کو تاریخ اور تاریخ کو ادب بنا دیا ہے، اس کے پڑھنے میں تاریخ اور ادب دونوں کا لطف ملتا ہے،

۱۹۳۶ء میں سید صاحب نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی پانچویں اردو کانفرنس کی صدارت لکھنؤ میں کی، اپنے خطبہ میں لکھنؤ میں اردو زبان و ادب کی جو سرگرمیاں شروع سے ہوتی رہیں، اس کا جائزہ اس مبصرانہ اور فاضلانہ انداز میں لیا، کہ اس شہر کی پوری ادبی اور علمی تاریخ سامنے آ جاتی ہے، یہ خطبہ اُن کی تحریر کے ایجاز کے آرٹ کا بڑا عمدہ نمونہ ہے، اپنے خطبہ میں پہلے تو اردو کے ان مشاہیر کا ماتم کرتے ہیں، جن کی وفات اسی سال ہوئی تھی، مختصر طریقے پر ان کے ادبی احسانات کا ذکر اس طرح کیا ہے، کہ ان کا اختصار دوسرے کی تفصیل پر بھاری پڑتا ہے، مثلاً پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی ان کا

قلم ہمارے پرانے کیرکیٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا (ص ۸۷) پریم چند کی افسانہ نویسی اور ناول نگاری کی یہ کیسی صحیح مرقع آرائی ہے۔

اصغر مرحوم کو یاد اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا پہلا دیوان نشاط روح اعظم گڈھ سے مطبع ہوکر نشاط عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے ان شعرا میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رخ پلٹا ہے اور ایک نئے دور سخن کا آغاز کیا ہے (ص ۸۷) اس رائے سے بھی کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

نور اللغات کے مرتب نور الحسن نیر کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، خود بھی شاعر سے بڑھ کر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات ان ہی آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا (ص ۸۷) چند سطروں میں کیسی جامع تعریف ہے۔

لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب، شاعر اور مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خاں طاہر کا ماتم اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا (ص ۸۷) ہنگامہ برپا رکھا لکھ کر نواب صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

سید صاحب نے اس خطبہ میں اعتراف کیا ہے کہ لکھنؤ ہی کی گود میں ان کے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، اسی کی آب و ہوا میں ان کا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ ان کے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری ان کے لئے نظر افروز ہے۔ اسی لئے اس مانوس چمن زار اور نظر افروز سرزمین کی علمی خدمات کے ذکر میں ان کے قلم میں بڑی شگفتگی بلکہ دلربائی پیدا ہو گئی ہے، اس کو

یہاں ذیل میں اختصار سے اس لئے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ سید صاحب نے لکھنؤ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جو ذکر کیا ہے وہ ناظرین کے سامنے آجائے اور اسی کے ساتھ جس انشا پردازانہ انداز میں اس کو لکھا ہے اس سے بھی ناظرین محظوظ ہوں، لکھنؤ کی اہمیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

"دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا" (ص ۷۹)

یہاں کی پرانی ادبی اور علمی مجلسوں کے ذکر میں ان کا قلم اور بھی رواں ہو گیا ہے :

"اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میر، انشاء اللہ خاں انشا، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رخ کیا، میر انیس کا خاندان دلی سے پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امراء کی ڈیوڑھیاں اور اہل علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پرشور بن گئیں، ناسخ و آتش وزیر و صبا اور ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دئے، شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جھگڑوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی، محاورات کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اسی کا اثر ہے کہ اس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا، ملک سخن کے وہ اخیر فرماں روا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہل ملک میں تقسیم کرتے رہے" (ص ۷۸ - ۷۹)

لکھنؤ میں زبان کی جو خدمت ہوئی اس کو سید صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "یہ نئے

ن کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر علا دینے میں کرتا ہے۔ ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط اور سبک لفظوں کو س طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر و انشا کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پھلوں کے لئے سند پیدا کی۔ لکھنؤ میں یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا جس کا نام نفیس اللغۃ ہے، سید انشا اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا۔ شیخ امداد علی بحر المتوفی ۱۳۰۱ھ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔ حکیم ضامن علی جلال نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے مالا مال کیا ہے۔ سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعرا، مجمع اللغات، گلشن فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں۔ منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے (ص ۸۱ - ۸۰)

سید صاحب نے اپنے اس خطبہ میں لکھنؤ کی وہ خدمتیں بھی گنائی ہیں جن کو لوگ اب تک بھول چکے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے جو معلومات دئے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں، مثلاً یہاں نواب سعادت علی خاں کے دور میں علامہ تفضل حسین خاں نے جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک، فخر الدولہ، دبیر الملک، ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علم ہیئت میں حدائق النجوم لکھی اور اس نئے علم کے لئے نئی اصطلاحات وضع کیں، رائے منوں لال فلسفی، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے۔ انھوں نے علم حساب، جغرافیہ، ہیئت اور

حکمت، انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے۔ نواب نصیر الدین حیدر کے عہد میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی محمد حسین لندن بھیجے گئے۔ ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم وفنون سے اہل ملک کو آشنا کیا۔ شاہان اودھ ہی کے زمانہ میں ایک دار الترجمہ قائم ہوا۔ یہاں سے ہیئت، کیمیا، مناظر، طبیعیات، قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا، علم الحرارت پر ایسے[19] رسالے ترجمے کرکے شائع کئے گئے۔ لارڈ بروم کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے میں چھپا۔ لکھنؤ کی اس علمی وتعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا (ص ۸۴-۸۳)

سید صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ دلی سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس اسکول بک سوسائٹی کا نام بھی لیا جائے اور اس کی مطبوعات کا پتہ لگایا جائے، مگر اب تک اس سوسائٹی پر خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ہے۔

سید صاحب نے لکھنؤ کی ادبیات میں داستان امیر حمزہ، نوشیرواں نامہ، طلسم ہوش ربا، ایرج نامہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ یہ ہماری پرانی زبان کے بہترین نمونے ہیں (ص ۸۵) پھر نثر میں سرور کے فسانۂ عجائب اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں سے متعلق اپنی یہ رائے لکھی ہے کہ یہ وہ جواہر پارے ہیں جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں۔ امانت کی اندر سبھا کے متعلق وہ رقمطراز ہیں کہ مدتوں تک یہ اہل شوق کا تماشہ گاہ بنا رہا۔ پھر لکھنؤ میں جو ناول لکھے گئے ان کے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ عبد الحلیم شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن، رسم ورواج اور طور وطریق کو مرزا رسوا نے ایک خاص طبقے کی خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر

ان ہی کے دم قدم سے پُر رونق تھا ۔ لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد ، شرر کی فردوس بریں اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں (ص ۸۹)

سید صاحب نے لکھنؤ کے مطبعوں کا بھی ذکر کیا ہے ، ان کے جو نام دئے ہیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھوج لگا کر اپنی تحریروں کو کس قدر باوزن بناتے تھے ، جو مطبعے بھلا دئے گئے تھے ان کے یہ نام گنائے ہیں ، مطبع سلطان ، مطبع محمدیہ ، مطبع علوی ، مطبع مصطفائی ، مطبع محمدی ، مطبع جعفریہ ، مطبع امینی ، مطبع صدیقی ، نول کشور پریس ، سید صاحب نے ان میں مطبع مصطفائی اور نول کشور پریس کی بہت تعریف کی ہے ، لکھتے ہیں : مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجے پر تھا ، اس کی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی تھیں ، نول کشور پریس نے مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں شائع کیں ، ان کا مقابلہ ہندوستان کیا ، مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا تھا ، میر ، سودا ، ناسخ ، آتش ، جرأت ، مصحفی ، انشا ، رند ، وزیر ، صبا ، انیس ، دبیر ، مونس ، اسیر اور امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے (ص ۸۷ ـ ۸۹)

لکھنؤ کے اخبارات میں اودھ اخبار ، اودھ پنچ ، مشیر قیصر ، آئینۂ آزاد اور ہندوستانی اور مسلم گزٹ کا ذکر کیا ہے ، اودھ اخبار کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے ، اودھ پنچ کو اردو کا سب سے پہلا کامیاب ظرافتی اخبار قرار دیا ہے ، جس کے صفحات میں ان کی رائے کے مطابق منشی سجاد حسین

منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طرز طریق سے آگاہ تھے، روشناس ہوئے (ص ۸۸)

لکھنؤ کے رسالوں پر جو تبصرہ ہے وہ گو بہت مختصر ہے لیکن جامع تبصرہ کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔

رسالہ محشر۔ یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ ہے جو مولوی عبد الحلیم شرر کا بھی پہلا ادبی کارنامہ تھا۔ یہ ۱۸۸۱ء میں نکل کر ۲ سال کے بعد بند ہو گیا۔

رسالہ دل گداز۔ ۱۸۸۲ء میں عبد الحلیم شرر نے نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طریقہ کا بہترین معیار تھا۔ یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کئے۔ نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا۔

پیام یار۔ منشی نثار حسین کا یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا۔ اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعراء، امیر داغ، جلیل اور تسلیم وغیرہ اور ان کے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں۔ یہ انیسویں صدی کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا۔ جس کی باتوں کو سن کر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

مرقع عالم۔ یہ حکیم محمد علی خاں کی ایڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا۔ اس کو دل گداز کا حریف سمجھنا چاہئے۔ حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے ان کا قلم وقت کا سماں دکھانے میں خاص ملکہ رکھتا تھا (۸۹)

(باقی)

مولانا شاہ محمد بدرالدینؒ

از

جناب مولوی محمد عالم صاحب قادری ندوی

(۲)

فقہی تحقیقات مولانا کی فقہی تحقیقات، ارباب علم وافتاء کے لئے بصیرت افروز ہوتی تھیں ان تحقیقات میں اسباب وعلل کی مجتہدانہ بحث اور اسرار ومناط کے تجزیہ سے فکر ونظر کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور سنت نبوی کی حقیقی معنویت، منفرد فقیہانہ لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں علمائے ہند اس کے روادار نہ تھے کہ خطبۂ جمعہ کی ضروری باتوں کا ترجمہ اثنائے خطبہ میں پڑھ دیا جائے وہ عربی خطبہ میں کسی غیر زبان کی آمیزش گناہ اور عمل سلف کے خلاف سمجھتے تھے۔

آپ نے ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلے اس مسئلہ پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی اور ایک مدلل ومبسوط مقالے میں زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا استقصاء کرکے اپنی تحقیق پیش کی، اگرچہ یہ رائے عام علماء کے مسلک کے خلاف تھی، مگر اس کے اظہار میں آپ کو بالکل تامل نہ ہوا، اپنی تحقیق کی صحت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے، اس مقالہ کی اشاعت کے بعد اگرچہ علماء کے درمیان اتفاق عام نہ ہو سکا مگر اس مسئلہ پر عمل کرنے والوں کو تقویت ہو گئی، ذیل میں آپ کی تحریر ملاحظہ ہو:

" خطبہ جمعہ کا ہو یا عیدین، یا کسوف وخسوف یا استسقاء کا، عربی زبان میں پڑھنا سنت ہے اور دوسری کسی زبان میں پڑھنا خلافِ سنت ہے، فقہاء نے ایسا ہی لکھا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے ہر موقع اور ہر موسم کے احادیث کی کتب میں منقول ہیں، آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی عربی زبان میں خطبے پڑھا کئے، حالانکہ اشاعت اسلام کے لئے یہ بزرگوار شام، مصر، فارس بلکہ افریقہ کے بعض حصوں تک پہونچ گئے تھے، لیکن ہر ملک، ہر شہر اور ہر قریہ میں اپنی ہی زبان عربی میں خطبے پڑھتے رہے، یہ دلیل ہے عربی میں خطبہ پڑھنے کے سنت متوارثہ ہونے کی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خطبہ کس غرض سے پڑھنا مقرر کیا گیا ہے، اس کا فائدہ خطبہ پڑھنے والے کے لئے مخصوص اسی کی ذات تک محدود ہے یا سننے والوں کیلئے مخصوص، یا دونوں کا نفع [illegible] میں ہے، ظاہر ہے کہ نفع دونوں کا ہے لیکن پڑھنے والے کی غرض یہی ہونی چاہئے کہ سننے والوں کو اس خطبہ سے نفع پہونچے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم الٰہی تھا: وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولاً بلیغا۔ (اے خاتم النبیین آپ ان کو نصیحت کریں اور ایسی بات کہیں جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو)

اس جہت سے آپ کے خطبے لوگوں کی حالت کے موافق، ان کے ادراک اور سمجھ کے مطابق اور مواقع اور موسم کے مناسب ہوتے تھے، خود آپ اور آپ کے اصحاب کی زبان عربی تھی تو عربی میں خطبہ کا ہونا لازم تھا، آج کل بھی اگر وہی

مناسبت سے سننے والوں کی حالت اور سمجھ کی رعایت کرکے سننے والوں کی زبان میں خطبے پڑھے جائیں تو گو زبان کی حیثیت سے وہ خطبہ سنت نہ ہو لیکن معنیٰ اور مفاد کی حیثیت سے وہ خطبہ سنت سے خارج بھی نہ ہوگا اور اس معنی میں سنت بھی ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سامعین کی اور اپنی متحد زبان میں خطبہ فرمایا ہے' تو جو خطیب اپنی اور سامعین کی متحد زبان میں خطبہ کہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اللہ تعالیٰ کے حکم وقل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً کی تعمیل کرنے والا بہ نیابت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوگا' اس کے خلاف میں ہرگز یہ ادائے نیابت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے نہ ہوگی۔

یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اصحاب رسولؐ نومسلموں کی رعایت سے ان کی زبان میں خطبہ کیوں نہ پڑھا' اس کا جواب یہ ہے کہ اصحاب رضی اللہ عنہم دوسری زبان نہ جانتے تھے' ایک ملک میں انھیں قرار بھی نہ تھا' کبھی شام میں تو کبھی مصر میں . . . . کبھی فارس میں' اور حاضر کی زبان میں کوئی آدمی وعظ کہنا چاہے تو جب تک اس زبان میں پوری مہارت حاصل نہ کرے وعظ نہیں کہہ سکتا' اسلئے اصحاب مجبور تھے کہ اپنی ہی زبان میں وعظ کہیں۔

دوسرے یہ کہ جس قدر لوگ مسلمان ہوئے تھے' احکام شریعت کی تعلیم انھی اصحاب سے پاتے رہتے اور بیشتر اوقات ان کے ہم جلیس رہنے کے سبب سے کچھ کچھ عربی سمجھ لیتے تھے۔

تیسرے یہ کہ عام دستور ہے کہ فاتحین اپنی زبان کی ترویج چاہتے ہیں مولوع

وعظ میں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اپنی ہی زبان میں کہتے ہیں، بہ نسبت مفتوح کی زبان کے، اس لئے اصحاب برابر اپنی ہی زبان میں خطبے پڑھتے رہے۔

عجمی جو اس وقت اسلام میں داخل ہوئے اہل عرب فاتحین کے تتبع میں عربی زبان میں خطبہ پڑھنا ان کا فخر تھا، اس طرح عموماً عربی خطبہ تمام عجم میں رائج ہوگیا، دوسری زبان کا خطبہ شاذ و نادر ہی کوئی دیکھا اور سنا جاتا ہے، جیسا کہ شیخ سعدی شیرازیؒ کا فارسی منظوم خطبہ مشہور ہے اور پورب بنگالہ کی طرف اردو منظوم جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہیں، میں نے متعدد بار سنا ہے۔

دوسری زبان میں خطبہ پڑھنے والوں نے فقہاء کی رخصت سے فائدہ اٹھایا ہے، یعنی امام محمد، امام ابو یوسف اور امام زفر رحمہم اللہ نے اس شرط پر فارسی زبان میں خطبہ پڑھنے کی اجازت دی ہے کہ عربی عبارت پڑھنے سے وہ عاجز ہوں، اور امام اعظمؒ نے بلا شرط، اس کی علت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کوئی حکم نہ فرمایا، تو کسی دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا گناہ نہیں ہی سنت فعلی کے خلاف ہے۔

اگر ایسی صورت نکالی جائے کہ خطبہ کی ضروری چیزوں میں سے وہ جس کو عوام بھی عربی الفاظ میں پڑھنا پڑھانا دینی بات جانتے ہیں مثلاً ابتدائی کلمات جو اکثر حدیثیہ خطبوں میں ہیں اور حمد و نعت اور درود و کلمۂ تشہد و قرآن مجید کی آیات اپنے حال پر عربی میں رہیں، باقی وعظ و پند کے کلمات سننے والوں کیلئے مناسب حال ان کی زبان میں ہوں تو ایسا خطبہ بھی سنت کہا جا سکتا ہے اسلئے کہ اس میں خطبات حدیثیہ کے کلمات ضروریہ عربی میں پڑھے جائیں گے اور پند و

نصیحت اور ضروری احکام شریعت سننے والوں کی زبان میں جو ان کے حق میں مفید ہوں گے، خطبہ کا مقصد یہی ہے، کل خطبوں میں جو مضمون ضروری اور مشترک ہے، وہ باری تعالیٰ کی حمد ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و تشہد کا کلمہ اور کم سے کم ایک آیت شریفہ قرآن مجید کی ہے اور پند و نصائح کے بیانات کلام اللہ سے یا احادیث سے ہوں، خطبات نبویہ کے ہر خطبے میں یہی ہے اور اس قدر عربی میں پڑھنے سے ادائے سنت ہو جاتی ہے اور خطیب اپنی طرف سے حسب ضرورت سامعین اور ان کی حالت کے جو کچھ چاہیں کہیں، آخر میں درود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب پر اور دعائے نصرت دین اسلام اور مغفرت مومنین و مسلمین ہو"

خطبہ کے مشترک اور غیر مشترک مضامین کی وضاحت کے بعد مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"عربی خطبہ پڑھنے سے خطیب نے ادائے سنت ضرور کر لی لیکن عربی نہ جاننے والوں کو مفید نہ ہونے کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو غرض خطبہ فرمانے سے تھی وہ یہاں پوری نہیں ہوتی، حاجت ہے کہ خطبوں کی قدر مشترک چیزیں تو عربی میں پڑھی جائیں، اس طرح عربی میں خطبہ پڑھنے کی سنت ادا کی جائے، باقی پند و نصائح و احکام وغیرہ اور خاص خاص مہینوں کے متعلق مضامین کو خطبہ سننے والوں کی زبان میں پڑھیں، اس نیت سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامعین ہی کی زبان میں انھیں احکام بتاتے ہیں، وعظ و پند فرماتے ہیں، میں بھی سامعین ہی کی زبان میں، وعظ و پند کرتا ہوں، دین کے احکام بتاتا ہوں، اس طرح حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ فرمانے کا مفاد بھی پورا کرتا ہوں، عرب تو آپ ہی کی زبان جانتے تھے،

غیر عرب کے بعض سوال کا جواب اسی کی زبان میں آپ نے دیا، ایمان و اسلام کی تلقین بھی اسی کی زبان میں کی ہے، خطبہ کے متعلق امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کا اختلاف اور ان کی دلیلیں جو بالتصریح لکھی گئیں[1] پورا خطبہ غیر عربی زبان میں پڑھنے کے متعلق ہیں اور فقہا نے اس کو جائز کہہ کر خلاف سنت متوارثہ ہونے کے سبب اس کو مکروہ تنزیہی لکھا ہے لیکن خطبہ میں کلمات مسنونہ اور ماثورہ ضروریہ پڑھ لینے کے بعد اگر عیدین اور صیام وغیرہم کے احکام اور پند و نصائح بھی عربی میں پڑھے جا چکے ہوں یا نہ پڑھے گئے ہوں، وہ سب عوام کو مطلع کرنے کی غرض سے فارسی یا اردو میں سنا دئے جائیں تو ایسے خطبے پر کراہت تنزیہی ہونے کا بار بھی نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ خطیب خطبہ کے کلمات مسنونہ کو پڑھ کر ادائے سنت متوارثہ کے فرض سے فارغ ہو چکا ہے۔"

یہ محققانہ موشگافیاں اور علمی نکتہ آفرینیاں داد سے مستغنی ہیں۔

خطاب سے معذرت | ملک و ملت میں آپکی سیادت علم و عرفان تو مسلم تھی ہی، پھر بھی حکومت برطانیہ نے آپ کے اثرات کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں شمس العلماء کا خطاب پیش کیا، لیکن وہ جس مسند ارشاد پر متمکن تھے، وہ عرفان و تزکیۂ باطن کی مسند تھی، یہاں ذکر و شغل، زہد و ورع اور فقر و درویشی کی قدر تھی، اقلیم باطن کے تاجداروں نے دنیوی اعزاز کو اپنے منصب سے ہمیشہ فروتر تصور کیا ہے اور اس سے نفور و گریزاں رہے ہیں، آپ جس سجادہ پر متمکن تھے اس کی تو خصوصی روایت استغناء و بے نیازی رہی ہے۔

بانئ خانقاہ مجیبی حضرت تاج العارفین قدس سرہٗ کے توکل و قناعت کا ذکر کرتے ہوئے صاحب تذکرۃ الکرام نے لکھا ہے کہ نواب قاسم علی خاں صوبیدار نے اپنے عروج و ترقی کے

---

(۱) بخوف طوالت درج اقتباس نہیں۔

زمانے میں بعض ارکان دولت کی تحریک اور اپنی عقیدت مندی کی بناء پر یومیہ رقم خرچ خانقاہ کے لئے مقرر کی اور ایک پروانہ ۱۱۹۵ھ میں بایں عبارت لکھ بھیجا :

"برائے بست وارد و صادر کفاف ضروریات، پروانہ یومیہ مع مبلغ سی صد روپیہ متضمن براں که مبلغ پنج روپیہ یومیہ جہت خانقاہ آں ولی متوکل مقرر کردہ شد "

حضرت تاج العارفین نے پروانہ کی پشت پر یہ عبارت لکھ کر پروانہ واپس کردیا:

" بر در کریمیکہ نشستہ ایم الی الآن	میں جس کریم کے در پر بیٹھا ہوا ہوں،
مقرر و معین مارا بندہ نہ کردہ و کاسۂ رزق	اس نے اب تک میرا مقررہ روزینہ بند نہیں کیا
مارا نہ شکستہ کہ بر در دیگر رویم "	ہے اور نہ میرا کاسۂ رزق توڑا ہے کہ میں دوسرے کے در پر جاؤں ۔

۱۱۹۵ھ میں شاہ عالم بھی حاضر خدمت ہوا اور اس نے خرچ خانقاہ کے لئے جاگیر پیش کرنی چاہی مگر حضرت تاج العارفین نے انکار فرمایا ۔

مولانا شاہ بدرالدین کو بھی حکومت کی یہ پیشکش ناگوار گذری اور خطاب، تمغہ وخلعت قبول فرمانے کے بجائے اپنی ناراضگی سے حکومت کو باخبر کرنا چاہتے تھے مگر سر فخرالدین وزیر تعلیمات اور نور الہدیٰ صاحب سابق جج پٹنہ کے پیہم اصرار کی وجہ سے خاموش رہے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار سب سے کردیا ۔ سر علی امام کو جو اس زمانہ میں سرکاری حلقہ میں بڑی اہمیت رکھتے تھے ایک مفصل خط کے ذریعہ اپنی ناپسندیدگی سے مطلع کردیا لیکن ان لوگوں نے حالات کی نزاکت کی بنا پر کچھ عرصہ تک آپ کو باضابطہ واپسی سے باز رکھا مگر آپ کے دل میں یہ بات برابر کھٹکتی رہی بالآخر تحریک ترک موالات نے اس کا مناسب موقع فراہم کردیا اور آپ نے خطاب اور اس کے لوازمات واپس کردئے ۔

امارت شرعیہ | آپ کے ارشادات و افادات کا دائرہ صرف علم و فن اور فقر و عرفان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ملک و ملت کی وسیع اور عظیم الشان خدمات کی بنا پر اس عہد کی تمام اہم اور دینی تحریکوں میں آپ کی حیثیت بہت ممتاز نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں امارت شرعیہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ نے ہندوستان میں اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرائی، اس تجویز نے ملک بھر میں قیام امارت کا ولولہ پیدا کر دیا لیکن کہیں کوئی عملی صورت نہ پیدا ہو سکی، صرف بہار کو اسے جامۂ عمل پہنانے کا شرف حاصل ہوا، جون ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت علمائے بہار نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہار و اڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا، آپ کے اثر سے تحریک امارت نے بہت جلد ایک فعال ادارہ کی شکل اختیار کر لی، مولانا محمد سجاد مرحوم آپ کے نائب اور مشیر کی حیثیت سے برابر شریک کار رہے، امارت کے ذریعہ فتنۂ ارتداد کے استیصال، تبلیغ دین، زکوٰۃ و صدقات کی تنظیم اور قضا و افتاء کے سلسلہ میں بے نظیر کام ہوا اور بہار میں مستحکم شرعی نظام قائم ہو گیا۔

اس تحریک کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ اس کو حضرت شاہ بدرالدین جیسی جامع کمالات ہستی کی امامت اپنے اولین مرحلہ ہی میں حاصل ہو گئی، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

> "امارت کی تنظیم میں مسلمانان بہار کو کامیابی ہوئی اور میرے نزدیک اس کامیابی میں سب سے زیادہ تحسین و تبریک کا مستحق مسلمانان بہار کو ان کے اس فیصلے نے بنا دیا جو انھوں نے امیر کے انتخاب میں اختیار کیا، مسلمانوں کی ذمہ داریوں سے صحیح معنوں میں وہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کا دل بھی دماغ کے ساتھ روشن ہو"

تنہا دماغ یا صرف دل کی روشنی سے یہ کام انجام نہیں پاسکتا، کہ زندگی کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کی تجلیاں جس کے اندر تڑپتی ہوں مسلمانوں کا سچا امیر اور صحیح امام وہی بن سکتا ہے، بہار کی امارت شرعیہ کے امیر اول سیدنا الامام مولانا شاہ بدر الدین قدس سرہ العزیز کی ذات گرامی سمات میں یہی جامعیت پائی جاتی تھی(۱)۔

اس ذاتی عظمت اور ہمہ گیر اثر ورسوخ کے علاوہ آپ نے علمی طور پر بھی امارت کی ضرورت اور نصب امام کے وجوب پر بڑی پُرزور تحریریں لکھی ہیں اور کتاب وسنت کے نصوص اور فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں اس معاملہ کی اہمیت واضح کی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ بنگال میں اس کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ نصب امارت کی ضرورت واہمیت شک وشبہہ سے بالاتر ہے، اس موضوع پر امارت شرعیۂ بہار نے اہم ترین مواد پیش کردیا ہے

سیرت کی ممتاز خصوصیات | علم وعرفان کی اس جامعیت کے باوجود فخر وادعاء، کبر و اعجاب، ریا و سمعہ سے بالکل پاک تھے، آپ کی سیرت کی جو ممتاز خصوصیت سب سے زیادہ پرکشش تھی، وہ آپ کی بے نفسی تھی، جس کی شہادت علماء، مشائخ اور خدام کے علاوہ آپ کی تصانیف بھی دیتی ہیں۔

آپ کے عہد کے مشائخ میں بہار شریف کے ایک ممتاز بزرگ نے آپ کی برگزیدگی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"میں نے اپنی اس عمر میں بڑے بڑے عرفاء کو دیکھا، بڑے بڑے صفا صید(؟)

(۱) حیات محی الملۃ والدین ص ۱۱۱۔

اور بہت سے صاحب سجادہ اور پیرزادوں کو دیکھا مگر حق یہ ہے کہ ایسا نفیس بزرگ میری نظر سے تو نہ گذرا "

حقیقت یہ ہے کہ بزم علم ودانش ہو یا حلقۂ عرفاں، آپ ہر جگہ بیحد انکسار اور اخفائے حال سے کام لیتے تھے، خانقاہ مجیبی کی سجادگی سے پہلے آپ کو ایک بار لکھنؤ کے سفر کا اتفاق ہوا، حضرت مولانا فتح محمد تائب صاحب علامۃ التفاسیر کے یہاں مہمان ہوئے، ایک دن مولانا شاہ محمد عبدالرزاق قادری فرنگی محلی سے ملنے کے لئے مولانا فتح محمد صاحب اور اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ ان کی خانقاہ میں تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد اسی مجلس میں شاہ التفات احمد صاحب سجادہ نشین ردولی بھی تشریف لائے، صاحب سلامت کے بعد وہ ایک ممتاز جگہ پر حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب کے قریب بیٹھ گئے اور ان سے باتوں میں مشغول ہوئے لیکن اثنائے گفتگو میں بار بار ان کی نگاہ آپ کی طرف اٹھتی رہی، آخر انھوں نے آپ سے مخاطب ہو کر مکان پوچھا، آپ نے فرمایا: اطراف پٹنہ، اس مختصر جواب کی وضاحت اور آپ کا مکمل تعارف کرانے کے لئے مولانا فتح محمد صاحب نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا، مگر آپ نے اشارہ سے روک دیا، تھوڑی دیر کے بعد شاہ التفات احمد صاحب نے پوچھا کہ اطراف پٹنہ میں ایک جگہ پھلواری شریف ہے، جناب وہاں سے واقف ہیں؟ آپ نے فرمایا: بخوبی! پھر پوچھا: وہاں سے جناب کا کوئی تعلق بھی ہے؟ آپ نے فرمایا: بیعت اور غلامی کا شرف وہیں سے حاصل ہے، جناب کو وہاں کس سے بیعت ہے؟ شاہ التفات صاحب نے دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ میں حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر کا غلام ہوں، پھر انھوں نے خانقاہ کی حالت پوچھی، اس وقت کے صاحب سجادہ کا نام پوچھا، خانقاہ کے مزید حالات دریافت کئے، آپ نے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی، یہ سن کر شاہ التفات صاحب نے فرمایا، جس تفصیل

کے ساتھ آپ سب کچھ بتا رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کو وہاں کی جزئیات تک کی خبر ہے، آپ خاموش ہو گئے، اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے کہا کہ حضرت شاہ علی حبیب قدس سرہ کے خلیفہ اور داماد جناب شاہ بدر الدین صاحب کے خلیفہ خواجہ سید حسن صاحب آروی سے مجھے طریقۂ قادریہ وارثیہ بھی پہونچا ہے، آپ نے محض لاعلمی کے انداز سے فرمایا جی ہاں! پہونچا ہوگا۔ راستے میں مولانا فتح محمد صاحب نے فرمایا: جناب نے تو وہ کمال کیا جو کسی سے ممکن نہیں، گفتگو کا وہ عنوان اختیار کیا جس سے وہ ذرہ برابر نہ سمجھ سکے کہ جناب خاص پھلواری کے رہنے والے اور خانقاہ کے رکن ہیں اور طرفہ تو یہ کہ آخر میں آپکا نام لے کر تعلق بھی ظاہر کر گئے مگر آپ نے یہ نہ سمجھنے دیا کہ "جناب شاہ بدر الدین" آپ ہی ہیں، میں بار بار چاہتا تھا کہ جناب کا تعارف ان سے کرا دوں، مگر آپ کے ایما کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا، ورنہ بات تو منہ تک آ چکی تھی، آپ نے فرمایا کہ ان کا نہ سمجھنا بہت بہتر ہوا، مجھے اپنے تعارف اور اپنے پیر کی خصوصیات ظاہر کرنے میں ادباً احتیاطاً منظور ہے، جب آپؒ مولانا فتح محمد صاحبؒ کے مکان پر پہونچ گئے تو شاہ التفات صاحب کو کچھ خیال آیا، اور آپ نے حضرت شاہ عبد الرزاق قادریؒ سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے جو ابھی آپ کے یہاں تشریف لائے تھے؟ شاہ صاحب نے ہنس کر فرمایا: اتنی دیر تک جناب نے گفتگو کی جب بھی نہ پہچانا، یہی بزرگ شاہ بدر الدین صاحب تھے، خاص پھلواری کے رہنے والے اور حضرت مولانا شاہ علی حبیب قدس سرہ کے داماد اور خلیفہ ہیں، شاہ التفات احمد صاحب نے کہا کہ میں تو اتنی دیر سخت مغالطہ میں پڑا رہا، دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی، پھلواری کے حالات پوچھتا رہا، وہ پوری واقفیت کے ساتھ بیان کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ان کا نام لے کر اپنے تعلق کو بھی بیان کیا، جب بھی انھوں نے

ظاہر نہ ہونے دیا۔ اللہ رے آپ کا انکسار و استتار، میں تو قائل ہوگیا۔"(1)

بعض ارباب علم وفضل جب علمی استفاضہ کے لئے رجوع ہوتے تو آپ اصلاح ورہبری تو ضرور فرمادیتے مگر اظہار تفوق سے کلیتہً اجتناب فرماتے۔

ترک موالات کی تحریک کے اکثر پہلو مولانا ظفرالدین صاحب رضوی کے نزدیک شرعی حیثیت سے محل نظر تھے، انھوں نے اپنے رسالہ ہادی الهداة میں مولانا آزاد اور دیگر علمائے کرام سے اختلافات کا اظہار کیا اور اس رسالہ کا مسودہ آپ کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجا۔ آپ نے قرآنی آیات کے ترجمہ میں مصنف سے جو تسامح ہوا تھا وہ دور فرمادیا، اعتراضات کی ساری عمارت ازخود منہدم ہوگئی، لیکن اصلاح میں جو بے نفسی تھی اس کا اظہار آپ کے مکتوب کے ان جملوں سے ہوتا ہے:

"علمی تحریروں میں اصلاح یا کم یا بیش کرنا علماء کا منصب ہے۔ میرا منصب نہیں، میں اپنی حقیقت سے تمامتر واقف ہوں، نہ عالم ہوں، نہ فاضل، میں نے ایک خدمت کردی ہے کہ کاتب نے کتابت میں جو غلطی کی ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیت شریفہ سے کہیں سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے اور کوئی بڑھ گیا ہے، پھر آپ کی عبارت میں بھی کہیں پر بعض لفظ اس نے چھوڑ دیا تھا میں نے لکھ کر صحیح کردیا ہے"(2)۔

دربھنگہ کے ایک ذی علم طبیب کے ایک خط کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

"مضمون مسئول کی نسبت آپ کی تشفی خاطر کرنے سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ میں بڑے بڑے القاب کے لائق نہیں، میں نہ عالم ہوں نہ فاضل، نہ

---

(1) قلم پر لال از نذیر پھلواروی (2) لمعات بدریہ، ترجمہ کی غلطیوں کی اصلاح اور تفسیر و حدیث کے فوق کی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو...

درویش کامل، میں اپنے خالق و مالک کا گنہگار غافل بندہ ہوں، اگر آیندہ
کبھی مجھے یاد فرمائیں تو ان القاب سے معاف فرمائیں "

ورع و تقویٰ | آپ کی سیرت کا اہم ترین پہلو اس بے نفسی اور انکسار کے ساتھ وہ کمال ورع و تقویٰ ہے جس نے آپ کی ذات میں تقدس و پاکیزگی پیدا کردی تھی، اسی لئے آپکے آستانہ پر "ہدیۂ دل و جان" پیش کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور علماء و مشائخ سے لے کر عوام تک اپنے دلوں میں شیفتگی اور گرویدگی محسوس کرتے تھے۔

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ایک مرتبہ آپ کے منجھلے فرزند مولانا شاہ قمرالدین امیر شریعت ثالث سے پوچھا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد کی طرف لوگوں کے قلوب کیوں اس قدر کھنچے جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا، شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان کا اخلاص اور کمال تقویٰ ہے جو سب کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔

حضرت نیر پھلواروی فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نے نہایت خوشنما چائے کی پیالیوں کا ایک جوڑہ مجھے دیا کہ میری جانب سے آپ کی خدمت میں نذر کردو، میں نے نماز مغرب کے بعد خلوت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ فلاں صاحب نے چائے کی یہ پیالیاں خدمت میں نذر کی ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ واپس کردو، میں نہ لوں گا، چہرۂ مبارک پر برہمی کے آثار تھے، میں فی الفور باہر چلا آیا اور میں نے پیالیاں ان کے سامنے رکھ دیں، انھوں نے پوچھا کہ واپسی کی وجہ کیا ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ میری طرف سے دوبارہ لیجا کر پیش کرو اور کہو کہ میں پیالی اسی نیت سے لایا تھا، چونکہ میری کوئی نذر رد نہیں فرمائی گئی ہے، اس لئے امید ہے کہ یہ بھی قبول کرلی جائے گی، میں نے کہا مجھ میں اب ہمت نہیں، ان شاء اللہ کل موقع دیکھ کر عرض کردوں گا، صبح کے وقت خلوت میں حاضر ہوا اور مزاج مبارک خوش پاکر

دریافت کیا کہ رات پیالی کے قبول نہ کرنے کی وجہ معلوم نہ ہوئی ۔ ارشاد ہوا کہ تم کو یاد نہیں کہ دو چار روز ہوئے وہ مجھ سے پانچ روپئے مانگ کر لے گئے ہیں اور تم ہی نے لے جا کر دئے ہیں ، ادائے قرض سے پہلے ان کی کسی چیز سے میرے لئے انتفاع جائز نہ ہوگا ۔ اگر میں اس کو لے لوں تو میرے لئے سود ہو جائے گا اس لئے ابھی تو میں نہیں لے سکتا ۔ کمال تقویٰ یہ تھا کہ آپ مشتبہ چیزوں سے بھی کلیتہً اجتناب و احتراز فرماتے تھے ۔

ایک بار خادم نے اپنی لاعلمی سے زکوٰۃ کے پانچ روپئے نذر کے بیس پچیس روپوں میں یکجا کر کے رکھ لئے اور مغرب بعد خلوت میں حاضر ہو کر ان روپوں کو جیب سے نکالا اور پانچ روپئے علٰحدہ رکھے ، آپ نے فرمایا کہ اب اس روپیہ کو علٰحدہ رکھنے کا کیا فائدہ ہے ؟ ان پانچ روپئے سے وہ سارے روپیے مشتبہ ہو گئے ، اس کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے کہ زکوٰۃ کے روپے کون سے تھے اور نذر کے کون ؟ سب کو ایک جگہ کر دو ، اس کو بھی زکوٰۃ ہی کے مد میں رکھ دیتا ہوں ، یہ فرما کر آپ نے سارے روپئے زکوٰۃ کی مد میں اٹھا کر رکھ دئے ، ان میں سے ایک بھی اپنی ذات پر صرف نہ فرمایا ۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر ایس پرشاد خلوت میں حاضر ہوئے ، دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ حضور کو ملیریا ہے اور یہ تپ اسی کی ہے ، اگر حکم ہو تو ہومیو پیتھک کی دوا ایک خوراک بنا کر حاضر کر دوں ، آپ نے ارشاد فرمایا : نہ میں ڈاکٹری دوا پیتا ہوں ، نہ ہومیو پیتھک ، کیونکہ ایک میں الکحل اور دوسری میں اسپرٹ ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی میرے نزدیک ناجائز ہیں ۔

مرض ہو یا صحت ، ہر حال میں خورد و نوش اور استعمال و صرف کی تمام اشیاء میں غایت درجہ احتیاط و تقویٰ سے کام لیتے تھے ، وفات سے ایک سال پہلے اپنے آخری لیوس مبارک

(کفن) کا اہتمام تقویٰ اور طہارت کے معنوی برکات کے ساتھ آپ نے جس طرح فرمایا تھا، وہ آپ کے غایت تورع کا مظہر ہے۔

۱۲۹۵ھ میں آپ کے پیرزادے حضرت شاہ عبدالحق نے جب بیعت کی تو دو روپے نذر کے طور پر پیش کئے، پھر اپنے نکاح کے موقع پر انھوں نے ایک اشرفی کی نذر گذرانی، یہ نذر پیرزادے کی تھی اور آپ اُن مشائخ میں سے تھے جن کے نزدیک پیر و مرشد سے نسبت رکھنے والی ہر چیز قابل اعزاز و تکریم ہوتی ہے، یہ رقم آپ نے اسی وقت اس کام کے لئے مخصوص و محفوظ کر دی، جس کاغذ میں یہ رقم ملفوف تھی اس پر آپ کی یہ تحریر ہے:

"دو روپیہ کہ خاص از جناب حضرت مولوی شاہ محمد عبدالحق صاحب مدظلہ وقت بیعت بہ طور خاص عنایت شدہ بود برائے کفن خود داشتم، محبین و وارثین من بہ ہمیں کار صرف نمایند، و یک اشرفی کہ وقت عقد نکاح خود بہ مقام بہار عنایت نمودہ بودند نیز بہ ہمیں مطلب داشتہ ام کہ بہ تجہیز و تکفین بکار آید۔

راقم محمد بدر الدین قادری"

۱۳۴۱ھ کے ماہ ذیقعدہ میں یازدہم کے بعد جناب مولوی فیض محمد رحمۃ اللہ علیہ کو خلوت میں طلب فرماکر کاغذ کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر وہ رقم ان کو دی اور تاکید فرمائی کہ یہ دو روپئے ہیں، آپ ان کو علیحدہ رکھیں اور دوسرے روپیوں میں نہ ملائیں، اسی روپے کی روئی خرید کر سوت بنوائیں، مگر روئی خریدنے کے بعد جو لوگ اس کے بنگولے چنیں، پھر اس کی پونیاں بنائیں، اس کے بعد چرخہ پر سوت کاتیں تو اس طرح کہ یہ تمام کام وضو اور طہارت کے ساتھ ہو اور درود شریف کا ورد بھی جاری رکھیں، اسی طرح بننے والے بھی باوضو ہوں اور تانی و بھرنی میں ہر وقت درود پڑھتے رہیں۔

حق مزدور خدمت | آپ جب بھی کسی سے کوئی خدمت لیتے تو اس کے معیار سے زیادہ اسکی اجرت مرحمت فرماتے، پٹنہ کچہری میں ایک صاحب آپ کے متوسلین میں تھے اور وہ دفتری کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، بے مرمت کتابوں کی جلد سازی کے لئے آپ انھیں خانقاہ بلانا چاہتے تھے، مگر یہ گوارا نہ تھا کہ ان کا نقصان ہو، جب یہ اطلاع ملی کہ وہ ترک ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے اپنے خادم خاص سے ارشاد فرمایا کہ وہاں ان کو دس روپئے ماہانہ ملتے ہیں، اگر وہ خانقاہ کے نوکر ہو جائیں اور جلد سازی کی خدمت اپنے ذمہ لے لیں تو میں ان کو پندرہ روپیے ماہوار تک دے سکتا ہوں۔

حاجت مندوں کی پوشیدہ امداد | حاجت مندوں اور سائلوں کا سوال کبھی رد نہ فرماتے، خود تو اسباب معاش سے بے نیاز، خالص متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر آپ کے آستانہ پر سائلوں کا ہجوم ہوتا تھا اور آپ برابر ان کی حاجت روائی فرماتے رہتے تھے۔

آپ کے خوان کرم سے بیشمار تیموں اور ناداروں کی پرورش ہوتی تھی، اہل قرابت اور غیر اہل قرابت، متوسلین اور غیر متوسلین میں بیشمار غرباء اور مساکین ایسے تھے جن کی آپ مالی امداد و اعانت اس طرح فرماتے کہ اعزہ اور خدام خاص میں سے کسی کو علم نہ ہوتا، آپ کی وفات کے بعد آپ کی اس فیاضی کا اعتراف متعدد حضرات نے کیا۔

عسر میں خندہ جبینی | عسر و یسر دونوں حالتوں میں آپ کے معمولات، عبادات و ریاضات، مشاغل، اوراد اور خلق ظاہر و باطن میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا تھا، فیاضانہ وضعداری ہمیشہ قائم رہی، معاشی اعتبار سے ایسے ناسا عد حالات بھی پیش آئے کہ خود آپ اور آپ کے خانوادے کے تمام حضرات نے ابالے ہوئے چنے، ہفتہ دو ہفتہ نہیں، عرصہ دراز تک کھائے مگر آپ کی خندہ جبینی اور لینت خلق برقرار رہی اور اگر کوئی مہمان آگیا

تو کسی عنوان سے اس کے حسب حیثیت اس کی مدارات بھی کر دی۔

غیبت سے نفرت | آپ کبھی کسی کے پس پشت اس کو برا نہ کہتے اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ آپ کی مجلس میں کسی کی غیبت کرے، یہ خصوصیت صرف تقریر کی حد تک نہ تھی، تحریر میں بھی آپ اس درجہ محتاط تھے کہ علمی، فکری، ہر طرح کے مسائل میں اپنے اختلافات تو بیبا کانہ طور پر ظاہر فرما دیتے مگر کسی کے علم و فضل کی توہین یا اس پر ذاتی حملہ کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

تحریک خلافت اور تحریک موالات کا عہد نہایت پر شور و پر آشوب تھا، افکار و آرا کا تصادم رزم و پیکار کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، اس عہد میں بھی آپ کے مضامین ذاتی مناقشات سے پاک، اعلیٰ درجہ کی متانت کا نمونہ ہوتے تھے، دوسروں کو بھی اسی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

صدق و امانت | راست گفتاری اور امانت آپ کی طینت میں تھی، آپ کبھی کذب و خیانت کے قریب بھی نہیں گئے، عہد طفولیت سے صادق و امین تھے، مذاق و مزاح میں بھی خلاف واقعہ کہنے کو آپ گناہ تصور فرماتے تھے، آپ کے زمانہ طفولیت میں کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص سے مذاق میں فلاں بات کہہ دو، آپ نے فرمایا: یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا، والد صاحب نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔

آپ کے پیر و مرشد شیخ الاسلام حضرت نصر قدس سرہٗ آپ کی صدق مقالی کی اکثر تعریف فرمایا کرتے تھے، فرماتے کہ جب شرف الدین بھائی کسی بات کے کہنے کو "بدر الدین" کو ہمارے یہاں بھیجتے ہیں اور وہ کہنا شروع کرتے ہیں تو میں ان کے الفاظ پر غور کرتا رہتا ہوں، لفظ بلفظ شرف الدین بھائی کے بیان کو میرے سامنے ادا کرتے ہیں اور ایک ذرہ بھر اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ نہیں کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا شرف الدین بھائی کی زبان اپنے منہ

میں لے کر آتا ہے۔

جب آپ علم و عرفان کے صدر نشین ہوئے تو تقریر کی طرح تحریر میں بھی روایت بالمعنیٰ سے آپ کو احتراز ہوتا اور جب کسی کی بات نقل کرنی ہوتی تو آپ اسی کے الفاظ میں بیان فرماتے، الفاظ میں رد و بدل کو آپ خلاف امانت تصور فرماتے۔

اسرار شریعت و طریقت کی طرح آپ بہت سے لوگوں کے رازوں کے بھی امین تھے، لیکن کبھی کسی کا راز آپ نے کسی پر ظاہر نہ فرمایا۔ اگر کسی نے امانۃً کوئی چیز آپ کے پاس رکھی تو اس کو بجنسہٖ وہی چیز لوٹائی، امانت کے روپوں میں دوسرے روپیے لانے کو سخت ناپسند فرماتے۔

اپنی وفات سے کچھ پہلے آپ نے مختار وحید صاحب کو طلب فرما کر اپنے امانت داروں کی ایک فہرست مع اشیاء لکھوائی اور چیزوں کی نشاندہی کردی، ارشاد فرمایا کہ جس کی امانت واپس کی جائے اس کے نام کے سامنے نشان دے دیا جائے، جب فہرست مکمل ہوگئی تو آپ نے اپنے دستخط کے بعد اسے محفوظ رکھ لیا۔ اگر کسی نے آپ سے قرض لیا تو آپ نے واپسی کا تقاضا کبھی نہیں کیا، مصنف "غم پر ملال" لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے کچھ روپے بطور قرض لئے تھے، جب میں واپس کرنے کے لئے حاضر ہوا تو آپ نے روپے قبول فرمالئے اور زیر لب ارشاد فرمایا: اَوفاکَ اللہُ تعالیٰ کما اوفیتنی۔ پورے الفاظ کی عدم سماعت کی وجہ سے انھوں نے عرض کیا: کچھ حکم ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں! میں نے دعا پڑھی ہے، حدیث میں آیا ہے کہ جب تم سے کوئی کچھ مانگ کر لیجائے تو یہ پڑھو، پھر آپ نے وہ دعائیہ الفاظ دوہرائے۔

علماء و مشائخ سے تعلقات | آپ کی ذات میں علم و عرفان کی اعلیٰ خصوصیات جمع ہوگئی

تھیں، اس لئے آپ اپنے عہد میں ارباب فضل و کمال اور اساطین فقر و تصوف دونوں کے مرجع تھے لیکن بایں ہمہ آپ سب کی تکریم کرتے تھے، علمائے کرام خواہ آپکے متوسلین و مسترشدین میں کیوں نہ ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھتے، قدیم بزرگوں کی خانقاہوں کے سجادہ نشین آتے تو آپ تکریماً فرش کے کنارے تک تشریف لاکر ان کا خیر مقدم کرتے، اکثر خانقاہوں اور درگاہوں کے مشائخ آپ کے جامع السلاسل ہونے کی بنا پر آپ سے استفادہ کرتے، خواجہ حسن نظامی، شاہ التفات احمد رودلوی اور دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد کے مشائخ نے آپ سے بعض چیزوں کی اجازت حاصل کی تھی، بہار کی اکثر خانقاہوں کے پیرزادوں اور مشائخ نے بھی آپ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے علمی کمالات اور زہد و تقویٰ کی اعلیٰ صفات کی بنا پر پٹنہ، گیا، آرہ، مونگیر، بہار شریف کے علماء و مدرسین کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اکابر علم و فضل سب آپ کے گرویدہ تھے، علمائے فرنگی محل میں مولانا عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلقات تھے وہ آپ کے علم و عرفان کے بیحد مداح تھے، مولانا فخر محمد تائب آپ کی ذات ستودہ صفات سے بیحد گرویدگی رکھتے تھے، مفتی کفایت اللہ دہلوی آپ کے تبحر علمی کے ثناخواں تھے، علمائے کرام کی جتنی تعداد آپ کے گرد مجتمع ہوگئی تھی، اس کی مثال بمشکل کہیں اور مل سکے گی، صاحب نزہۃ الخواطر مولانا حکیم عبد الحی ناظم ندوۃ العلماء نے پھلواری آکر آپ سے ملاقات کی، انھوں نے آپ کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے اس عہد کے تمام اکابر علماء کے محسوسات کی ترجمانی ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

الشیخ العالم الفقیہ الزاھد	شیخ، عالم، فقیہ، زاہد جناب شاہ بدرالدین
بدرالدین ابن شرف الدین ابن	ابن شرف الدین ابن ہادی ابن احمدی حنفی

الهادی ابن الاحمدی الجعفری الحنفی البهلواری احد کبار المشائخ رزق قبولاً عظیماً فی ولایة بهار وقصده الطالبون لله من اعناء البلاد واشتهر علمه وزهده ونزاهة نفسه وجرأته فی قول الحق و حرصه علی نفع المسلمین فاختاروه امیرالشریعة فی بهار واستقام علی ذلك بصدق وعفة ونصیحة للمسلمین حتی لقی الله۔

جعفری اپنے عہد کے کبار مشائخ میں سے ہیں، صوبہ بہار میں آپ کو عظیم ترین مقبولیت حاصل ہے، ملک کے اطراف واکناف سے طالبین حق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں، آپکے علم، زہد، تقدس اور جرأت حق نیز دردمندیٔ ملت کی شہرت ہمہ گیر ہے، بہار کے مسلمانوں نے آپ کو امیر شریعت منتخب کیا تو آپ نے صدق واخلاص کے ساتھ مسلمانوں کی صلاح وفلاح پر استقامت اختیار فرمائی، یہاں تک کہ واصل بہ حق ہوئے۔

لقیته بپهلواری فوجدته شیخاً صادقاً متودداً حسن الاخلاق حسن السمت والهدی ملیح الشمائل شدید التعبد مدیم الاشتغال بالکتب یلوح علیه آثار التوفیق والقبول (۱)

میں پھلواری ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، میں نے ان کو شیخ کامل، صاحب محبت کریم الاخلاق، فیاض اور صاحب اتحاف پایا ہے، آپ نہایت حسین وجمیل، سخت ترین عبادت وریاضت کرنے والے، ہمیشہ مطالعہ کتب میں مشغول رہنے والے ایسے بزرگ ہیں جن کی پیشانی پر قبولیت وتوفیق کے انوار چمکتے ہیں۔

ذوقِ مطالعہ آپ کے معمولات میں ریاضت ومجاہدہ کے ساتھ مطالعۂ کتب کو بھی بڑی اہمیت

(۱) نزہۃ الخواطر، الجزء الثامن ص ۸۸

حاصل تھی، نماز عشاء کے بعد معمولات سے فارغ ہوکر آپ کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہوجاتے، اور یہ سلسلہ نصف شب تک جاری رہتا، دوپہر کو بھی گھنٹے دو گھنٹے تک آپ کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے، اس زمانے کے تمام اخبارات اور اہم علمی رسائل وجرائد آپ کی خدمت میں پابندی سے آتے، اخبارات کے لئے اگر کوئی وقت نہ ملتا تو تناول طعام کے وقت بائیں جانب رکھ کر دونوں معمولات سے بیک وقت فارغ ہوتے، خانقاہ کے کتب خانے کی فنی ترتیب آپ کی نگرانی میں آپ کے فرزندان گرامی مولانا شاہ قمرالدین اور مولانا شاہ نظام الدین صاحب مدظلہٗ کی کوششوں کا نتیجہ ہے، ہر کتاب کے اوراق پر آپ کے کچھ نہ کچھ نوٹ ضرور ملتے ہیں۔

ادارہائے طبع وتصنیف کی سرپرستی | اسی خصوصی ذوق مطالعہ کی بنا پر ملک کے تمام اہم تصنیفی اداروں سے سرپرستی یا رکنیت کا تعلق تھا، دارالمصنفین اور دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی مطبوعات آپ کی خدمت میں برابر آتیں اور آپ انھیں پسند فرماتے، نئی کتابیں اس کثرت کے ساتھ آتیں کہ ان کی جلد سازی کے لئے ایک دفتری کے باقاعدہ تقرر کی ضرورت محسوس ہوئی۔

علمی کتابوں کے وسیع اور عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپکی بین الاقوامی معلومات کا دائرہ بھی وسیع تھا، دنیا کے تمام اہم واقعات پر نظر رکھتے۔ (باقی)

ہندوستان کے سلاطین، علما ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ہندوستان میں مسلمان فرماں رواؤں کا عہد تیرہویں صدی عیسوی تک رہا، یہاں انھوں نے اپنے گوناگوں کارناموں سے ہندوستان کو صحیح معنوں میں جنت بنانے کے ساتھ اپنے دور کے علماء وفضلاء اور مشائخ سے بھی مخلصانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات رکھے اور ان سے فیوض وبرکات حاصل کرتے رہے اس کتاب میں اسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمن

عبدالرزاق قریشی مرحوم

از

جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب، پٹنہ،

ضلع اعظم گڑھ کی ایک چھوٹی سی بستی بسہم میں ۳۰ ر جولائی ۱۹۷۰ء کو عبدالرزاق قریشی پر ۹ بجے دن کو دورہ پڑا، دو تین قے ہوئی، ۱۲ بجکر دس منٹ پر "یا اللہ" کہکر آنکھیں بند کرلیں، اور پانچ منٹ بعد یہ خاموش متین اور سنجیدہ، سادہ مزاج اسکالر اور ادیب اپنے مالک حقیقی سے جاملا، اناللہ وانا الیہ راجعون،

عبدالرزاق قریشی کم عمری میں بمبئی چلے گئے تھے، جہاں میری اور اُن کی رفاقت ۴۱ سال تک قائم رہی، اُن کا خاندانی ماحول کچھ ایسا حوصلہ افزا نہ تھا، کہ وہ کسی اسکول یا مدرسے کی تعلیم مکمل کرسکتے، اس کے باوجود وہ بمبئی آئے تو اپنے ساتھ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی لیتے آئے تشنگی علم انھیں مختلف چشموں تک لے گئی، مگر آخر میں میکدۂ شبلی کے اس بادہ خوار کو جس ساقی کی تلاش تھی، وہ ۱۹۳۲ء میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کی صورت میں نظر آگیا، جو دارالمصنفین چھوڑنے کے بعد پہلے گورنمنٹ کالج احمد آباد پھر وہاں سے بمبئی کے ایک سرکاری کالج میں اردو کے پروفیسر ہو کر آگئے تھے، اعظم گڑھ کے ہونے کے ناتے اور دبستان شبلی کے خوشہ چیں کی حیثیت سے قریشی صاحب نے ندوی صاحب سے اپنا تعارف کرایا، طالب و مطلوب کی یہ ملا

استاد اور شاگرد، بزرگ اور عزیز، دوست اور رفیق کی حیثیتوں میں تبدیل ہو کر زمانے کے بدلتے ہوئے لیل و نہار کے باوجود پوری وضعداری کے ساتھ ۱۹۳۲ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کی زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہی۔

عبدالرزاق قریشی نے ابتدا میں تقریباً بمبئی کی اردو صحافت کی دنیا میں بھی دشت نوردی کی، پھر ایک مشن اسکول میں، اس کے بعد پارسی اسکول میں ٹیچر ہو کر پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ ایک گجراتی اسکول میں بھی پڑھایا، پھر انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) میں بھی اُردو اور فارسی کے مدرس ہوئے، جہاں انھوں نے طلبہ کو صرف اعلیٰ نمبری کے لئے نہیں تیار کیا، بلکہ ان میں سے بیشتر طالب علموں میں زبان کا ستھرا ذوق بھی پیدا کیا، جتنے شوق سے وہ لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ وہ اُن کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں بھی لگے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے شاگرد اُن کا نام بڑے احترام و عقیدت سے لیتے رہے، درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کرتے، اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تعلیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کام بھی وہ بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے، مگر جیسے جیسے ان کا علمی معیار بلند ہوتا گیا انھیں ہائی اسکول کا تدریسی میدان اپنے لئے تنگ نظر آنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن اسلام کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا، ۱۹۵۵ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی (کالج سے ریٹائر ہو کر) اس ادارے کے پورے وقت کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، اس درمیان میں انسٹی ٹیوٹ سے عبدالرزاق قریشی کا تعلق گہرا ہوتا گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا میدانِ عمل انسٹی ٹیوٹ ہی ہو سکتا ہے مگر دوسری طرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین صاحب ان کے ایسے قدر شناس تھے کہ ان کو اسکول سے جدا کرنا گوارا نہ تھا۔ جب معاملہ میرے سپرد ہوا تو ایک روز میں نے خلیفہ صاحب سے کہا، "دیکھئے

قریشی صاحب سے ہم اور آپ دونوں خصوصی تعلقات رکھتے ہیں مگر ان کا ایک اہم کام آج تک نہ کر پائے، یعنی ان کی شادی نہ کرا سکے، اس طرح تو وہ دنیا سے لاولد ہی رخصت ہو جائیں گے، اب میں ان کی شادی کی تجویز لے کر آیا ہوں وہ حیرت سے میرا منھ تکتے رہے، پھر بولے: "تمہید چھوڑیئے، تجویز بیان کیجئے" میں نے کہا: "عبدالرزاق قریشی کا رشتہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک کر دیا جائے، جہاں سے ان کی تصنیفات معنوی اولاد کی صورت میں ظہور میں آسکیں" ایک لمحے توقف کے بعد وہ متبسم ہوئے اور بولے: "رشتہ منظور" اور ۱۹۶۲ء سے عبدالرزاق قریشی نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اپنا شریک حیات بنا لیا، اور آخری دم تک اس رشتے کو اس طرح نبھایا کہ انتہائی معذوری کے سوا ایک دن ایسا نہیں گذرا جب کہ وہ بمبئی میں موجود ہوں اور یہاں حاضر نہ رہے ہوں۔ وہ یہاں اسکول ہی کی تنخواہ پاتے لیکن شادمانی اور انبساط کا یہ عالم تھا کہ جیسے انھیں یونیورسٹی پروفیسر کا گریڈ مل گیا ہو، جب تک رہے اسی نشہ میں سرشار رہے۔

ایک بار وہ چھٹی لے کر وطن گئے اور وہاں علالت کی وجہ سے قیام میعاد سے زیادہ طویل ہو گیا، وہ تنخواہ پیشگی لے گئے تھے، واپس ہوئے تو خود ہی حساب لگا کر معلوم کیا کہ جتنی چھٹی ان کی جمع تھی اس سے دو چار دن زائد ہو گئے تھے، اکاؤنٹ آفس نے کوئی پرسش نہیں کی، کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہ چند دن اگلی چھٹی میں منہا کر دئے جائیں مگر انھیں اطمینان نہیں ہوا، میں انجمن اسلام کا جنرل سکریٹری تھا، انسٹی ٹیوٹ کے انتظامی امور سے بھی میرا تعلق تھا، انھوں نے مجھے صورت حال سمجھائی اور زائد دنوں کی تنخواہ واپس کرنے پر اصرار کیا، بڑی مشکل سے میں انھیں اس پر راضی کر سکا کہ وہ ان کو

نصف تنخواہ کی چھٹی میں منہا کرا دیں جو ان کے حساب میں جمع تھی۔

استغنا کی ایک شان یہ بھی تھی کہ نوائے ادب اور تحقیق و تالیف کے سلسلہ میں انھیں مختلف ادیبوں اور اسکالروں سے کافی خط و کتابت کرنی پڑتی تھی، ایک روز میں نے انھیں ڈاکخانے کے عام قسم کے کارڈ اور ان لینڈ کاغذ پر خطوط لکھتے دیکھا تو کہا "آپ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسٹیشنری اور ٹکٹ کیوں نہیں استعمال کرتے؟" ہنس کر فرمانے لگے: "بھائی! میں اپنی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی یہی چھوٹی سی خدمت تو کرتا ہوں"

اکتساب علم میں عبدالرزاق قریشی نے جتنی محنت، شوق اور تلاش سے کام لیا وہ اپنی جگہ خود ایک مثال ہے۔ وہ ہر اتوار کو نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کے بنگلہ جوگیشوری پہونچ جاتے۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ یہ کتابیں اور ندوی صاحب کی ہدایتیں ہر اتوار کو قریشی صاحب کو وہاں کھینچ لے جاتیں۔ اس معمول پر وہ اس پابندی سے عمل کرتے کہ بمبئی کی بے تحاشہ بارش اور تیز و تند ہوائیں بھی انھیں اس گیارہ میل کے سفر سے کبھی باز نہ رکھ سکیں، صبح سے شام تک وہ مطالعے میں غرق رہتے۔ یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا، اور اس وقت ختم ہوا جب ان کی صحت بہت خراب ہو گئی اور وہ اتنی لمبی مسافت طے کرنے کے لائق نہیں رہے۔

وہ اپنا ہر کام بڑی لگن کے ساتھ کرتے اور علمی کاموں میں خوب سے خوب تر کے قائل تھے۔ ان کی سیدھی سادہ زندگی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ وہ اپنے مسودے اتنے سلیقے، احتیاط اور اتنی نفاست کے ساتھ تیار کرتے ہوں گے۔ ان کا خط بڑا پاکیزہ اور پختہ تھا۔ تحقیقی کاموں میں وہ دوسرے درجہ کی چیز گوارا نہیں کر سکتے تھے،

انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی لیکن مغربی طریقۂ تحقیق کا نہایت گہرا مطالعہ کرکے اس پر عمل پیرا تھے۔ ان کی مختصر سی کتاب "مبادیات تحقیق" ریسرچ کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ہدایت نامہ ہے اور اردو زبان میں اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عبدالرزاق قریشی ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اپنے خاص موضوعات پر تحقیق کرنے کے علاوہ ادارے کے سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" کی ادارت بھی سنبھالی اور رسالے کو جس بلند معیار اور وقار کے ساتھ ایڈٹ کیا، اس نے ساری اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کی، جب ان کی وفات کی خبر ملی تو مجھے اور باتوں کے ساتھ نوائے ادب کی یاد آئی اور بے اختیار غالب کا شعر زبان پر آگیا ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

عبدالرزاق قریشی نے بڑی تعداد میں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بمبئی کی مشہور سوشل ورکر مسز کلثوم سایانی نے ۱۹۴۰ء میں ایک پندرہ روزہ اخبار "رہبر" نکالا تو کئی مہینوں تک اس کے سارے مضامین عبدالرزاق قریشی اور راقم الحروف نے مل کر لکھے۔ ان مضامین میں بڑی عمر کے لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سہل نگاری کا لحاظ بہت ضروری تھا۔ اخبار، زبان اور مضامین دونوں حیثیتوں سے اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑے دنوں میں بہ یک وقت یہی اخبار اردو (ٹائپ)، دیوناگری اور گجراتی تینوں رسم خط میں چھپنے لگا، اس کوشش کو ملک کے مشہور سربراہوں نے بہت سراہا۔

قریشی صاحب کے ستر۷۰ شائع شدہ مضامین کا مجموعہ "تاثرات" کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جس میں بعض کتابوں اور شخصیتوں کے متعلق ان کے تاثرات ہیں، مضامین میں ان کی انشا پردازی شبلی اسکول سے وابستگی ظاہر کرتی ہے اور کتاب کا معارف پریس میں طبع کرانا ان کی دارالمصنفین کے دلدادہ ہونے کی دلیل ہے۔

مہاراشٹر کی ریاست میں (جو پہلے ریاست بمبئی کہلاتی تھی) اردو کی تعلیم میں خاصی سہولتیں فراہم تھیں، پھر بھی بعض چیزیں خود اردو والوں کے کرنے کی تھیں، جب تک حکومت نے درسی کتابیں تو مہیا نے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت کا مسئلہ اردو والوں کے لئے منفعت بخش نہ ہونے کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھا جاتا تھا، اوپر کی جماعتوں کی زبان دانی کی مناسب کتابیں مفقود تھیں، انجمن اسلام نے صورت حال کا جائزہ لے کر تالیف کا کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا، اور ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں "نگار اردو" کئی سال تک داخل نصاب رہیں اور اس طرح ہزاروں اردو داں طلبہ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہی۔

مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد اردو کانفرنس کی ایک نشست میں "اردو اور تحریک آزادی" موضوع بحث تھا، اسی نشست میں یہ خیال پیش ہوا کہ اگلے سال جب پہلی جنگ آزادی کی صدسالہ سالگرہ منائی جائے تو اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا جن سے ملک کی آزادی کی تحریکوں کو بڑی تقویت پہونچی ایک انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو، انجمن اسلام کے صدر سیف طیب جی بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے انجمن اسلام کی جانب سے انتخاب کے شائع کرنے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلی، مگر بعض اسباب کی بنا پر انجمن ترقی اردو اس انتخاب کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ ہوئی اور انجمن اسلام نے یہ کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کردیا جو اس وقت تک انجمن کے لائف ممبر بن چکے تھے، اگلے سال مئی میں چار سو صفحات کا

یہ انتخاب قریشی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ "نوائے آزادی" کے نام سے ٹائپ میں چھپ کر شائع ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اس کا پہلا نسخہ انجمن کے صدر نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا، یوں تو اس موقع پر جنگ آزادی اور تحریک آزادی کی تاریخیں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھی گئیں لیکن اردو کے سوا کسی زبان کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ وہ کوئی ایسا مجموعہ (نثر و نظم کا) پیش کرتی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ اس ملک کی تحریک آزادی میں معاون ہوئی ہو، یہ کتاب انجمن کے شعبۂ اشاعت (ادبی پبلشرز) کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے قریشی صاحب نے مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنایا، جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی حیثیت سے پیش کر دی جاتی تو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

انسٹی ٹیوٹ کے تحقیقی پروگرام کے تحت انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ "دیوانِ عزلت" اور "بارہ ماسہ" دو نایاب قلمی نسخے ایڈٹ کر کے شائع کرائے۔ پھر "اردو کا تمدنی سرمایہ" کے عنوان سے "نوائے ادب" میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے، موخر الذکر کام میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی اور اتنا مواد جمع کیا کہ ایک مستقل تصنیف کا مسودہ تیار ہو گیا جو اب دارالمصنفین کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

"مبادیاتِ تحقیق" کا ذکر اوپر آ چکا ہے، قریشی صاحب کا تعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قائم ہوا تو پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کی خاصی تعداد ان کے اردگرد منڈلانے لگی وہ لوگ ان سے مشورے کرتے، مقالے دکھاتے، مشکل مقامات کے حل طلب کرتے، عبد الرزاق قریشی

رنجاں مرنج طبیعت کے آدمی، بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے محسوس کیا کہ بیشتر طلبہ تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقۂ کار سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی والے اس مفروضے کے تحت کہ طلبہ یہ باتیں خود ہی معلوم کر لیں گے، انھیں اس فن کی معلومات دینا غیر ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ اکثر مقالے اس طرح لکھے اور پیش کئے جاتے ہیں کہ جن کو پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ قریشی صاحب نے مبادیاتِ تحقیق میں وہ اصول بتائے ہیں جن سے مقالہ کی تیاری میں باضابطگی پیدا ہوتی ہے۔

کردار کے اعتبار سے عبدالرزاق قریشی بڑے بلند مرتبے کے انسان تھے۔ وضعداری پسند کرتے اور اسے نباہنا بھی خوب جانتے تھے۔ ان کے عزیز اور رشتہ دار وطن سے علاج کے لئے بمبئی آتے تو یہ ان کے مشیر اور مددگار ہوتے۔ مرض کے لحاظ سے کسی ماہر طبیب کا انتخاب، اس سے وقت طے کرنا، پھر بیمار کو وہاں تک لے جانا، ضرورت ہوئی تو اسپتال یا نرسنگ ہوم میں داخل کرانا اور اس وقت تک اس کا حال چال دریافت کرتے رہنا جب تک کہ اس کا قیام بمبئی میں رہتا ہے، یہ سب ان کی زندگی کے معمول میں داخل تھا۔ یہی سلوک وہ اکثر ان طالب علموں کے ساتھ بھی کرتے جن کے بارے میں انھیں شبہہ ہو جاتا کہ وہ بغیر والی یا مددگار کے ہیں۔

عبدالرزاق قریشی راسخ العقیدہ تو ضرور تھے مگر مذہبی فرائض کی ادائیگی میں ان سے شروع میں کوتاہی ہوتی رہی۔ میں جب بھی ان سے کہتا: "حضرت! آپ پر صوم و صلوٰۃ کا حکم کب نازل ہوگا؟" تو وہ بڑے معصوم انداز میں مسکرا دیتے اور بس! پھر ایک وقت وہ آیا جب وہ عبادت کی طرف رجوع ہوئے اور اس جوش و خشوع کے ساتھ عبادت میں مشغول دکھائی دینے لگے کہ ان کے وہ احباب بھی جو بہت پہلے سے پابند صوم و صلوٰۃ تھے ان کی عبادت پر رشک کرنے لگے، ان کے قلب کی اس تبدیلی کا راز افشا کرنا شاید اخلاقی جرم ہو، پھر بھی ان کی روح سے معذرت کرتے ہوئے

بیان کر دینے کو جی چاہتا ہے، خود ان کا کہنا تھا کہ ایک روز وہ اپنے کمرے میں تنہا سو رہے تھے فجر ہونے والی تھی، اب دھندلکا تھا کہ انھیں محسوس ہوا کہ اذان کی آواز آرہی ہے، اس سے پہلے ایسی آواز کبھی سنائی نہ دی تھی، ان کی آنکھ کھل گئی مگر وہ پلنگ پر لیٹے رہے، دوسرے دن پھر یہی ہوا، اس مرتبہ اذان کی آواز اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر آنکھ کھلی اور یہ لیٹے رہے تیسرے دن اور چوتھے دن بھی یہی بات ہوئی، ہر روز آواز قریب تر ہوتی گئی، پھر ایک صبح ایسی آئی جب کہ انھیں لگا جیسے اذان ان کے کانوں میں دی جا رہی ہو — اور یہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے، کچھ دیر تک غور کرتے رہے، پھر اٹھے، وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے بیٹھ گئے، اس دن سے ان کی نماز شروع ہوئی جس کی پابندی آخری دم تک قائم رہی، امسال وہ فریضۂ حج ادا کرنے کا عزم کر چکے تھے مگر وقت آگیا اور وہ سوئے عدم سفر پر چلے گئے۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ریٹائر ہو کر ان کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ دارالمصنفین میں رفیق بن کر کام کریں، اس کی پوری تیاری انھوں نے کر لی تھی، ذاتی کتب خانے کی کثر کتابیں انھوں نے وہاں بھجوا دی تھیں اور اربابِ دارالمصنفین بڑے شوق کے ساتھ انکے چشم براہ تھے، مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عبدالرزاق قریشی کی پوری زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی زبان سے میر کا یہ شعر کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

از جناب عروج زیدی صاحب ، رام پور ،

آسودگیٔ قلب و نظر کون لے گیا؟ — ہم سے ہماری شام و سحر کون لے گیا؟
موتی جڑے ہوئے تھے چمن میں روش روش — وہ دولت نگار سحر کون لے گیا؟
آشوب جاں تھی ہم کو ملاقات اولیں — ان کے حضور بارِ دگر کون لے گیا؟
آنکھوں کے میکدے میں اداسی کی ہے نمود — ان کی نظر سے کیف نظر کون لے گیا؟
کیا پاسبان عقل کو بھی کچھ پتا نہیں — رنگینیٔ حیات بشر کون لے گیا؟
اب تو غم فراق بھی ہے قابل قبول — دل سے یقینِ جذبِ اثر کون لے گیا؟
ہلچل مچی ہوئی ہے حریم جمال میں — ان کے حضور دل کی خبر کون لے گیا؟
وہ کیا گئے کہ اپنی تو دنیا بدل گئی — کیا کہیے حسن شام و سحر کون لے گیا؟
اے چشم شوق تو یہ کہاں جم کے رہ گئی — توفیق احتیاط نظر کون لے گیا؟
بے تابیاں اگر مری تقدیر میں نہ تھیں — وہ جس طرف تھے مجھکو ادھر کون لے گیا؟
چونکا ہوں خواب سے تو یہ مصرع ہے بر زباں — سرمایۂ نشاطِ نظر کون لے گیا؟
کسب کمال پہ یہ بنا وضع انکسار! — دل سے مجال عرض ہنر کون لے گیا؟
دامان ناز بھی ہے نہ پلکوں پہ اے عروج — میری متاع دیدۂ تر کون لے گیا؟

مطبوعات جدیدہ

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ از جناب الک رام صاحب متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۶، مجلد قیمت ۹ روپے۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں عورتوں کی مختلف حیثیتوں یعنی بیٹی، بیوی، ماں، مطلقہ، بیوہ اور وارثہ کا ذکر کرکے ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اس سلسلہ میں زوجین کے باہمی حقوق، نکاح وطلاق اور وراثت کے متعدد جزئی فقہی احکام کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اسلامی مسائل میں مصنف کے ذہن کی بے تعصبی وسلامت روی اور قلم کا اعتدال و توازن مشہور ہے، مجموعی حیثیت سے اس کتاب کا بھی نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن زانی کو مومن تسلیم نہ کرنا اور الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ الخ کی رو سے یہ خیال کرنا کہ وہ مسلمان عورتوں سے شادی نہیں کرسکتا، نیز شادی شدہ زناکاروں کے لئے رجم کی سزا کا انکار (ص ۶۶ تا ۷۱) یہ سب جمہور کے مسلک کے خلاف ہے، رجم کا حکم قرآن مجید سے چاہے نہ ثابت ہو لیکن صحیح حدیثوں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے تعامل سے ثابت ہے، قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمہ میں روانی اور مطلب خیزی کے خیال سے الفاظ کی سرے سے رعایت نہ کرنا چاہے قاری کو بظاہر اچھا معلوم ہو لیکن احتیاط کے منافی ہے، جیسے سیصلون سعیرا میں صیغہ معروف تھا لیکن ترجمہ صیغہ مجہول سے یہ کیا گیا ہے " وہ دوزخ کی آگ میں جھونکے ہی جائیں گے" (ص ۱۵۱) اسی طرح ولا تاکلوا کا ترجمہ "ضائع نہ کرو" (ص ۵۲) قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم میں انزلنا کا "دیا" اور

سوأت کا عیب (ص ۱۲۴ - ۱۲۵) اور فان اللہ غفور رحیم کا ترجمہ " اللہ رحمت سے بخشنے والا " (ص ۱۲۵) کیا گیا ہے ۔ وقل رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا میں ربیانی کا یہ ترجمہ تو بالکل ہی غلط ہو گیا ہے " اور دعا کر کہ اے میرے رب جیسے تو نے میرے بچپن میں پرورش کی تھی اسی طرح اب دونوں پر رحم فرما " (ص ۱۴۲) ص ۱۲۸ پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمان درج ہے " کوئی شخص چھ ماہ سے زیادہ فوج کے ساتھ باہر نہ رہے " مگر حوالہ نہیں دیا گیا ہے، مولانا شبلیؒ نے بھی الفاروق حصہ دوم میں اس کو بلا حوالہ ہی نقل کیا ہے لیکن چار ماہ لکھا ہے۔ کتابت و طباعت کی متعدد غلطیوں سے قطع نظر کہیں کہیں لغزش قلم بھی ہو گئی ہے۔ جیسے " اگر گھر میں کوئی نہو تو ان میں داخل نہ ہو " (ص ۳۶) اللہ کی صفات رحمت و غفر (ص ۱۲۵ - ۱۲۶) اردو میں غفران اور مغفرت مستعمل ہیں لیکن غفر کا استعمال عام نہیں، اس کتاب کا پہلا اڈیشن بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ اس زمانہ میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا تھا، اب گو متعدد کتابیں چھپ گئی ہیں تاہم یہ بہت مفید اور سیر حاصل ہے، لائق مصنف نے نظر ثانی میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔

تذکرہ علمائے اعظم گڈھ - مرتبہ - مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۰۵ قیمت ۱۲/ مجلد پتے

(۱) جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس، (۲) مکتبہ نعمانیہ، دیوبند،

اعظم گڈھ کا ضلع مردم خیزی میں ہمیشہ سے ممتاز چلا آرہا ہے، اسکی خاک سے بڑے بڑے اصحاب علم و کمال پیدا ہوئے لیکن ابھی تک انکے حالات میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس لئے یہاں کے ایک لائق اہل قلم مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی نے نویں صدی سے اب تک کے شہرت پانے والے تقریباً پونے دو سو علما و فضلا کے مختصر حالات

وکمالات زیر نظر کتاب میں لکھے ہیں، مصنف کے انتخاب میں وہی اہل علم آسکے ہیں، جو علمی و دینی حیثیت سے ممتاز تھے، یعنی مدرسین مصنفین اور اصحاب سلوک و معرفت وغیرہ، یہ کام بڑا محنت طلب تھا، لیکن مصنف نے اس کو انجام دے کر ایک مفید علمی خدمت کی ہے، ان کو تحریر و تصنیف کا اچھا ذوق ہے، لیکن ابھی جوان ہیں، اور یہ ان کی پہلی کتاب ہے، اس لئے زبان و بیان کی معمولی خامیوں اور بعض واقعاتی غلطیوں کے علاوہ جوش و جذبہ اعتدال پر اور جماعتی عصبیت غیر جانبداری پر غالب آگئی ہے، اس لئے دوسرے طبقہ و مسلک کے اہل علم کے ذکر میں فراخدلی اور غیر جانبداری سے کام نہیں لیا ہے، انھوں نے جماعت اسلامی کے ذکر میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ نامناسب اور متانت تحریر کے خلاف ہے، متن میں معروف اشخاص پر تو حواشی تحریر کئے گئے ہیں، لیکن غیر معروف لوگوں پر نوٹ نہیں لکھا گیا ہے،

جدید عربی شاعری۔ از جناب نسیمہ فاروقی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش قیمت ہے، پتہ: ۱۔ انجمن ترقی اردو راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ (۲) مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، (۳) شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد۔

عربوں کی حکمرانی اور سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوا تو ان کے علوم و فنون کی ترقی رک گئی، لیکن نپولین کے مصر پر حملہ کے بعد ان میں یک گونہ بیداری پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں ان کی شاعری نے نئی کروٹ لی اور اس میں عصری میلانات اور قوم پروری و حب الوطنی کے جذبات کی ترجمانی ہونے لگی، اردو میں اس دور کی عربی شاعری کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے، اس کتاب میں

جدید عربی شاعری کا جائزہ لے کر اس کی اہم خصوصیات دکھائی گئی ہیں اور ہر دور کے بعض ممتاز شعراء کا تعارف کرایا گیا ہے، اس سے عربوں کی بعض ادبی، تعلیمی، قومی اور سیاسی تحریکوں کے بارہ میں بھی واقفیت ہوتی ہے، شروع میں نپولین کے مصر پر حملہ اور قدیم عربی شاعری اور آخر میں شعرائے مہجر (عرب ملکوں سے جاکر یورپ و امریکہ میں آباد ہونے والے عربی شاعر) کا بھی مختصر ذکر ہے، یہ لائق مصنفہ کی پہلی کتاب ہے اور بہت عجلت میں لکھی گئی ہے، لیکن بایں ہمہ طلبہ اور عام ناظرین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

صحیفہ:۔ مرتبہ جناب ابو البیان حماد عمری صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۶۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ:۔ جمعیۃ ابنائے قدیم جامعہ دار السلام، عمر آباد، ضلع شمالی ارکاٹ، تمل ناڈ۔

جامعہ دار السلام عمر آباد جنوبی ہند کی قدیم اور مشہور دینی درسگاہ ہے، اس سال اپریل میں اس کا جشن طلائی بہت دھوم دھام سے منایا گیا تھا جس میں ہندوستان کے ہر طبقہ و مسلک کے اصحاب علم کے علاوہ متعدد عرب ملکوں کے مندوبین بھی شریک ہوئے تھے، اس موقع پر جامعہ کے طلبائے قدیم کی جانب سے یہ یادگار مجلہ شائع کیا گیا ہے جو متنوع مضامین پر مشتمل ہے، مذہبی، علمی، تعلیمی اور سوانحی مضامین کے علاوہ ایک حصہ میں جامعہ کے مقاصد اور اس کے فضلا کی خدمات سے متعلق مضامین درج ہیں اور آخر میں اس کے بانی اور اس سے وابستہ اہم اشخاص کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، یہ نمبر سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، مضامین اوسط درجے کے ہیں اس لئے ہر مذاق و استعداد کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، دار المصنفین اور جامعہ کا تعلق بہت قدیم ہے، حضرت سید صاحبؒ وہاں تقسیم اسناد کا خطبہ دے چکے ہیں، اگر اس نمبر میں وہ خطبہ اور جامعہ سے سید صاحب کے تعلق کا ذکر بھی آجاتا تو اچھا تھا۔

تاریخ میلاد :- مرتبہ مولوی حافظ حکیم عبدالشکور مرزاپوری مرحوم تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۲۰۰، مجلد مع گردپوش قیمت صہ پتہ :۔ الفرقان بکڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

گذشتہ سو سال سے مسلمانوں کے درمیان جو مسائل سخت اختلاف و انتشار کا باعث بنے ہوئے ہیں ان میں ایک میلاد کا مسئلہ بھی ہے، اس کتاب میں اس کا جائزہ لے کر دکھایا گیا ہے کہ مروجہ میلاد کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس پر پہلے کون سی کتاب لکھی گئی، اس کے مصنف نیز میلاد کے بانی اور اس کو فروغ دینے والے کی علمی و دینی حیثیت کیا تھی، پھر رفتہ رفتہ میلاد میں کیا اضافہ ہوتا رہا، مصنف کے خیال میں نفس ذکر ولادت اور مروجہ مجلس میلاد میں بڑا فرق ہے، وہ اول الذکر کو بالاتفاق جائز اور موخر الذکر کو مختلف فیہ بتاتے ہیں، آخر میں یہ بحث کی گئی ہے کہ میلاد کو مطلقاً بند کر دیا جائے یا باقی رکھا جائے تو کس صورت میں؟ مصنف کا خیال ہے کہ اصلاحات کے ساتھ یہ جاری رکھا جا سکتا ہے، یہ کتاب نصف صدی پہلے لکھی گئی تھی، یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو لوگ واقعی سنجیدگی سے اس مسئلہ کی نوعیت و حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہوں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ :- از مولانا محمد عارف سنبھلی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴۸ مجلد مع گردپوش، قیمت ۔/ پتہ :۔ کتب خانہ الفرقان، ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ۔

چند ماہ قبل اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا گیا تھا، اب دوسرا ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، ارشد القادری صاحب نے اپنی کتاب "زلزلہ" میں علمائے دیوبند پر یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہ جن امور کی انبیاء و اولیاء کی جانب نسبت کو کفر و شرک بتاتے ہیں ان ہی امور کو خود اپنے اکابر کی جانب منسوب کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، زلزلہ کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، یہ کتاب سب میں بہتر اور مدلل ہے جو اس فن کے پرانے ماہر مولانا محمد منظور نعمانی کی نگرانی میں لکھی گئی ہے، کاش مسلمان باہمی اختلافات میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں نہ ضائع کرتے۔

"ض"

JAMIA NAGAR NEW DELHI-110025 LIBRARY

جلد ۱۲۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

ہماری بادشاہی کا نیا اڈیشن جلد چھپ رہا ہے، تاجر اور شائقین آرڈر دیں،

شذرات

۳۰/اکتوبر سے ۲/نومبر تک علامہ اقبال کی یک صدی سالگرہ کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے دہلی میں ایک بین الاقوامی سمینار تھا، جس میں ہندوستان کے علاوہ روس، تاجکستان، جرمنی، زکوسلاویکیہ، آئرلینڈ، مصر، ایران، عراق، اور پاکستان کے مندوبین شریک ہوئے، شروع میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کا ایک مشاعرہ بھی تھا جس میں معلوم نہیں کیوں بہت کم شعراء شریک تھے، لیکن سمینار ہر طرح کامیاب اور خاطر خواہ رہا،

تقسیم ہند کے بعد اقبال بعض حلقوں میں محض اسلامی شاعر اور پاکستان کی تحریک کے بانی سمجھے جانے لگے تھے، اس لئے اُن کو اس ملک میں متفقہ طور پر دنیا کا ایک عظیم شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، لیکن دہلی کے بین الاقوامی سمینار میں وہ دنیا کے ایک عظیم شاعر کے ساتھ عظیم مفکر بھی مان لئے گئے، اس اجتماع میں روسی، زکوسلاوکی، تاجکی، ایرانی، مصری، عراقی، پاکستانی ہندو اور مسلمان تمام مقالہ نگاروں کا لب و لہجہ بہت ہی خوشگوار تھا، اور اقبال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی فضا تھی، تین روز کے اجلاس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی گئی، ہندوؤں میں اوتانسکر جوشی، ال کے اڈوانی ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر بیچوے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے تقریریں کیں، مقالے پڑھے، مباحثے میں حصہ لیا اور اقبال کو خاطر خواہ طریقے پر خراج عقیدت پیش کیا، ڈاکٹر ملک راج آنند نے اپنے مقالے میں اقبال کو ایک عالمگیر شاعر ثابت کیا، اور ڈاکٹر بی بیچوے نے اقبال کی شاعری میں عشق کے تخیل پر اپنے مقالے سے بہت ہی خوشگوار فضا پیدا کر دی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد تو اقبال کے عشاق میں ہو گئے ہیں بلکہ اُن کو اپنا معشوق بلا شرکت غیرے بنانا چاہتے ہیں، انھوں نے اقبال، اسلام اور عصر جدید پر ایک

ت ہی فاضلانہ مقالہ پڑھا جو بہت پسند کیا گیا، اس سیمینار کے لئے انھوں نے اقبال کی زندگی، تصانیف اور تحریروں
ں ایک بہت ہی عمدہ نمائش بڑی خوش سلیقگی اور محنت سے لگائی تھی جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ
ساری چیزیں سینما کے سیمیں پردے پر متحرک ہیں،

اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر جی۔ آر۔ صابری تبریزی نے اپنا مقالہ "موجودہ دنیا میں اقبال کا مقام"
کے عنوان سے پڑھا، وہ بھی اس وقت اقبالیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، مقالے اور مباحثے میں وہ
اقبال کے خلاف کوئی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے، اقبال کے اشعار برجستہ پڑھ کر دوسروں کے دلائل رد کر دیتے،
مباحثے میں وہی سب سے زیادہ نمایاں رہے، پروفیسر اینے میری شمیل نسلاً جرمن خاتون ہیں لیکن آج کل ہارورڈ یونیورسٹی
میں ہیں، سات زبانیں جانتی ہیں، اسلامی ادب میں بڑی گہری واقفیت رکھتی ہیں، بڑی اچھی مقررہ ہیں، مباحثے میں
ان کی باوقار اور باوزن رائے غور سے سنی جاتی، ان کے مقالہ کا عنوان "اقبال اور جرمنی" تھا، روس کے پروفیسر ای۔ پی
جیلسٹیوف نے اپنے مقالہ "اقبال اور پشکن" میں روس کے عظیم شاعر پشکن اور اقبال میں بڑی مماثلت دکھانے کی کوشش کی،
اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر وکٹر کرنن نے اقبال کو انقلاب کا ایک پیغمبر بتایا، زیکوسلاویکیہ کے مندوب نے اقبال اور یورپ کے
مشہور شاعر پالو نیرودا کا موازنہ اور مقابلہ بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا جس پر کافی دیر تک بحث بھی رہی، روس
کے ایک نمائندہ پروفیسر جی۔ پی۔ پولن کے نے اپنا مقالہ "اقبال اور معاشرتی انصاف" کے عنوان سے پڑھا، روس
کے نمائندہ محمد عاصمو کا مقالہ "اقبال اور تاجک شاعری" پر تھا۔

ایران کے نمائندوں نے بھی بڑی فراخدلی سے اقبال کی تعریف کی، وہاں کے پروفیسر محمد رضا جلالی نائنی کے
مقالہ کا عنوان "مقام اقبال در زبان و ادبیات فارسی" تھا، ایران کے ایک دوسرے نمائندہ پروفیسر ام۔ اے اسلامی ندوشن
نے بھی فارسی میں اپنا مقالہ پڑھ کر اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا، ایران اور عراق کے دو نمائندوں نے عربی
اور فارسی میں اقبال کی شان میں نظمیں بھی کہیں، پاکستان کے پانچ نمائندے تھے، ان کے مقالے ان کی قومی
زبان اردو میں تھے، اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین کا مقالہ "علامہ اقبال اور عظمتِ انسانی"

پڑھا، پاکستان کے مشہور اہل قلم ڈاکٹر جمیل جالبی کے مقالہ کا عنوان "مطالعۂ اقبال کے چند نئے گوشے" تھا، وہاں کے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اقبال کی اردو نثر پر اپنا مقالہ پڑھا، ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے بعض خطوط کے ذریعہ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی، پاکستانی مندوبین کے مقالے بہت غور سے سُنے گئے، اور اُن پر ہر طرف سے اچھی رائے کا اظہار کیا گیا، اُن سے ایک خاتون عالیہ امام صاحبہ بھی آئی تھیں جن کا مقالہ پسند کیا گیا، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر امیر حسن عابدی کا مقالہ فارسی زبان میں تھا، انھوں نے اقبال کی غزل سرائی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، ظ۔ انصاری صاحب نے اپنے مقالہ میں یہ دکھایا کہ اقبال کے خیال میں کوئی تضاد نہیں،

راقم کا مقالہ "اقبال اور امیر خسروؒ" کے عنوان سے تھا، اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال یورپ کے فلسفیوں کی گاڑی کے قلی نہ تھے، بلکہ وہ اسلام کے حکما، صوفیہ اور شعراء سے متاثر رہے، انہی کے بعض اشعار سے ثابت کیا کہ وہ خسروؒ ہی کی طرح خسروِ ملکِ سخن بننا چاہتے تھے، اپنے اشعار کہتے وقت خسروؒ کے تازہ اور شیریں نغموں کو سامنے رکھتے، اور اللہ تعالیٰ سے شورِ رومی کیساتھ سوزِ خسروؒ کے عطا کرنے کی دعا مانگی، اور یہ سوز اُن کو ملا، اسی لئے اُن میں اور امیر خسروؒ میں صبغۃ اللّٰہی عشقِ رسولؐ، فلسفۂ عشق اور تخیلِ مردِ مومن میں بڑی مماثلت ہے، دونوں عقل کے مقابلہ میں فلسفۂ عشق کو بلند درجہ دیتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ اقبال آخر میں عقل و عشق سے مفاہمت کر لیتے ہیں لیکن خسروؒ کے یہاں عشق کے دربار میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں، اس مقالہ کو سُن کر پروفیسر جی، آر صابری تبریزی نے اپنے جن تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا وہی میری محنت کا اصلی صلہ تھا، لنچ کے وقت وہ میرے پاس آئے، میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے اس مقالہ میں شروع سے آخر تک ایمان کی روشنی نظر آئی جو اصل چیز ہے، انھوں نے کہا کہ اس زبان میں بڑی شعریت تھی، کیا آپ شاعر بھی ہیں، میں نے ہنس کر نفی میں جواب دیا، پاکستان کے مندوبین نے کہا کہ مقالہ میں دار المصنفین کا رنگ اور معیار پوری طور پر جھلک رہا تھا،

اقبال کے مسئلۂ زمان و مکان کے سلسلہ میں یہ حدیث لا تسبوا الدھر انا الدھر بھی زیرِ بحث آئی جو انھوں نے فرانسیسی مفکر برگساں کو سنائی تھی، ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ یہ موضوع حدیث ہے، اس کا جواب ان کو ملا کہ یہ حدیثِ قدسی ہے اور یہ مسلم اور بخاری شریف میں بھی ہے،

اس سمینار کے جنرل سکریٹری ملک کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری تھے، جنھوں نے استقبالیہ خطبہ میں اپنی دانشوری کا پورا ثبوت دیا، وہ پورے سمینار کے روح رواں بنے ہوئے تھے، بڑی خوش سلیقگی سے ساری کارروائی کو انجام تک پہنچایا، تمام مندوبین سے محبت اور حسن اخلاق سے پیش آتے رہے، مباحثہ میں کوئی ناخوشگوار بات آنے نہیں دی، اگر کبھی آئی بھی تو اس کو خوش اسلوبی سے روکا، اقبال کے برمحل اور برجستہ اشعار پڑھ کر اپنے وسیع مطالعہ کی داد بھی لی، مشاعرہ میں جہاں اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پڑھوایا، وہاں اقبال کی نظم لا الہ الا اللہ بھی سنواکر حاضرین کو محظوظ کیا، ان کے ساتھ ڈاکٹر محمد احسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) ڈاکٹر قمر رئیس (دہلی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (جامعہ ملیہ) نے بھی پوری تندہی سے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی،

اس سمینار میں جو خوشگوار فضا پیدا ہوئی تھی، وہ جاب کل ہند انجمن ترقی اردو کے اردو گھر کی رسم افتتاح کے موقع پر مکدر ہو گئی، جہاں سمینار کے تمام مندوبین خاص طور پر مدعو تھے، انجمن ترقی اردو کے لئے ایک عالی شان عمارت تعمیر ہوئی ہے، اس کا افتتاح ہمارے وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے کیا، انجمن کے صدر جناب آنند نرائن ملا نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس دیرینہ کی ساری تاریخ دہرادی جو اردو کے ساتھ حکومت ہند کا رہا ہے، اس کو سن کر جناب وزیر اعظم کو معلوم نہیں کیوں غصہ آگیا، اور یہ کہہ گئے کہ اس قسم کی باتوں سے اردو کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہوگا، جناب آنند نرائن ملا نے جس صاف اور سلیس زبان میں اُن کو مخاطب کیا تھا، وہ بھی اُن کو پسند نہیں آئی، اور کہا کہ ایسی سخت زبان ملک میں نہیں چل سکتی، اور یہ الزام بھی رکھ دیا کہ اردو زبان سخت ہو گئی ہے تو اسی ردعمل میں ہندی بھی سخت ہوتی جارہی ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ مسلم لیگ اس کو اپنی زبان قرار دے کر اس کے معاملہ کو خراب کر چکی ہے، دہ آئین کے کسی دفعہ کے مطابق کسی ریاستی حکومت کو اردو کے سلسلہ میں خصوصی سلوک کرنے کی ہدایت نہیں دے سکتے،

ایک وزیر اعظم ہر زبان کے بولنے والے طبقہ کا وزیر اعظم ہوتا ہے، وہ کسی وجہ سے کسی طبقہ کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تو اس کی حوصلہ شکنی اور دلآزاری کرنا بھی اس کے ذمہ دار عہدہ کے لئے مناسب نہیں، وہ اس کے قائل ہیں کہ جمہوریت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر فرد کو آزادی سے اپنی رائے کے ظاہر کرنے کا حق نہ ہو

جناب آنند نرائن ملا کو ان کے سامنے اردو بولنے والوں کے مجروح جذبات کی ترجمانی کا پورا آئینی حق تھا، اس پر ہمارے وزیر اعظم کی برہمی اور جھلاہٹ اُن کے تدبر کے بالکل منافی تھی،

پہ راقم ستمبر میں دہلی گیا تھا تو مولانا امداد صابری کی اردو صحافت نگاری کی ایک جلد کی رسم اجرا غالب اکیڈمی میں تھی اس تقریب کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر اطلاعات جناب ل۔ کے۔ اڈوانی نے کیا تھا، اسی تقریب میں ملک کے مشہور صحافی جناب کلدیپ نائر نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو کی حمایت میں کہا تھا کہ نسیم سحری جیسی لطیف اور شفقت مادری جیسی پیاری زبان کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کا حق ابھی تک تسلیم کرایا جاسکتا ہے جب اس کیلئے زبردست ایجی ٹیشن کیا جائے اس کا جواب جناب ل۔ کے۔ اڈوانی نے بڑی بردباری اور ٹھنڈک سے دیا کہ ملک میں اردو اخبارات کی تعداد ہندی اور انگریزی کے بعد ہی ہے بلکہ اردو ہفتہ وار اخبارات کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے وہ اردو اخبارات کے حق کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں اُن کی ترقی میں وہ ہر طرح کی مدد پہونچاتے رہیں گے، مجمع اُن کی اس تقریر سے خوش تھا،

اس تقریب میں جناب ہیم وتی نندن بہوگنا وزیر حکومت ہند بھی موجود تھے انھوں نے اردو کی حمایت میں ایک پرجوش تقریر کی بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ یو پی میں جب ہندی ذریعۂ تعلیم بنائی گئی اور اس کا نصاب تیار ہوا تو اس زمانہ کے وزیر تعلیم کو ایک بڑے لیڈر نے لکھا کہ اس نصاب کے بعد آیندہ تیس برس میں اردو یو۔ پی میں ختم ہو جائے گی وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ وہ اُن کے دل کی بات کو خوب سمجھے، جناب بہوگنا نے یہ بھی کہا کہ اس زبان کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہ اب تک زندہ ہے، اور پہلے سے زیادہ اس میں زندگی آتی جارہی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ در اصل اردو اور ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ اردو اور ناسمجھی کا جھگڑا ہے جب یہ ناسمجھی ختم ہو جائیگی تو یہ جھگڑا بھی جاتا رہے گا، تالیوں کی گونج میں وہ یہ بھی بولے کہ جنتا حکومت کو اردو کے مسئلہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی، خدا کرے ہمارے وزیر اعظم صاحب اپنے ایک اہم اور ممتاز وزیر کی اس رائے کو قابل توجہ سمجھیں اردو بولنے والوں کو بھی اپنی خود داری، غیرت اور عزت نفس کا جائزہ از سر نو لینا ہے کسی زبان کو دریوزہ گری کرکے زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں،

مقالات

امیر خسروؒ بحیثیت ایک صوفی

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

حضرت خواجہ کو امیر خسروؒ سے جو محبت اور شیفتگی رہی، یا امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ سے جو مودت اور فریفتگی رہی، وہی امیر خسرو کے تصوف کی دل آویز اور دلپذیر کہانی ہے، جس کو سیر الاولیا کے مصنف نے حضرت خواجہ کی زبانی بیان کرکے اس میں عارفانہ رنگ پیدا کر دیا ہے،

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مندہ پل کے پاس شیخ نجیب الدین متوکلؒ کے گھر کے دروازہ کے نزدیک بہت پاک صاف پانی بہ رہا ہے، خسرو ایک اونچی دکان پر بیٹھے دکھائی دیئے، میں بہت خوش اور مسرور نظر آرہا ہوں، میرے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اس وقت خسروؒ کے لئے خدا سے وہی چیز مانگوں جو میں چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ میری دعا قبول کی گئی، اور خسرو میں وہی کیفیت پیدا ہوگئی، (ص ۳۰۳)

ایک اور موقع پر حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ ایک روز خسرو کے لئے دعا کرتے وقت یہ خیال آیا کہ خسروؒ دو دشمنوں کا نام نہیں ہو سکتا ہے، خسرو کو محمد کاسہ لیس کے نام سے پکارنا چاہئے، خسروؒ سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ میرے لئے یہ خطاب غیب سے آیا ہے، اور گویا رسول اللہ صلعم

نے اس کی خبر دی ہے، اس سے مجھ کو ابدی نعمتوں کی امیدیں ہوگئی ہیں، (ص ۳۰۳)

حضرت خواجہؒ نے امیر خسروؒ سے فرمایا کہ میرے لئے دعا کرو، کیونکہ تمھاری بقا میرے اوپر منحصر ہے، میری بقا کے لئے تم کو میرے پہلو میں دفن کرنا چاہئے، یہ بات لوگوں نے کئی بار حضرت خواجہ کو یاد دلائی تو فرمایا ایسا ہی ہوگا، (ص ۳۰۳)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ اگر مجھ کو بہشت بھیجا جائیگا تو خسرو کے ساتھ جاؤں گا، (ص ۳۰۳)

ایک اور موقع پر حضرت خواجہؒ نے امیر خسروؒ سے فرمایا کہ میں نے جمعہ کی رات کو خواب میں دیکھا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کے بیٹے شیخ صدرالدینؒ تشریف لائے، تو میں نے بڑھ کر ان کی اتنی تواضع کی، کہ بیان نہیں کیا جاسکتا، یکایک تم (یعنی امیر خسرو) دور سے نظر آئے اور میرے پاس پہنچ گئے، اور معرفت کی باتیں شروع کر دیں، اسی کے بعد موذن نے فجر کی نماز کی اذان دی، تو میں نیند سے بیدار ہوگیا، اس خواب کو بیان کرکے حضرت خواجہؒ نے خسرو سے فرمایا، دیکھو تم کو کیا رتبہ مل گیا ہے، خسروؒ کا بیان ہے کہ یہ سن کر میں نے اپنی نیازمندی میں عرض کیا کہ مجھ جھاڑو دینے والے کو یہ سب کچھ آپ ہی کا دیا ہوا ہے، یہ سن کر حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر زور زور سے رونے لگے، خسرو پر بھی گریہ طاری ہوگیا، اس کے بعد حضرت خواجہؒ نے اپنی کلاہ خاص اپنے دست مبارک سے خسروؒ کو پہنائی، اور فرمایا کہ مشائخ کی باتوں کا لحاظ رکھا کرو، (ص ۳۰۴)

سیر الاولیاء کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ نے ترک اللہ کا خطاب ایک کاغذ پر لکھ کر دیا تھا، خسروؒ نے اس کو تعویذ بنا کر رکھا تھا، اور ہدایت دی تھی کہ اس کو ان کی قبر میں رکھ دیا جائے، اسی کی بدولت قیامت میں ان کی بخشش ہو جائے گی، (ص ۳۰۳)

پھر ایک منقبت میں بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے،

برز بانت چو خطاب بندہ ترک اللہ رفت

دست ترک اللہ گیرد ہم بہ اللش سپار

امیر خسرو ایک فطری شاعر بھی تھے، اپنی صغر سنی ہی میں اساتذۂ فن کے تتبع میں اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے، جو کچھ منظوم کرتے حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کرتے، وہ اپنی شاعری کے سارے کمالات کو محض اپنے مرشد کے لعاب دہن کی برکت سمجھتے، مثنوی نہ سپہر میں اپنے مرشد کی شان میں جو منقبت کہی ہے، اس میں کہتے ہیں:۔

من از دے لعاب دہن یافتم   کہ زیں گونہ آب دہاں یافتم

ایک روز حضرت خواجہ نے امیر خسرو سے کہا کہ معشوقوں کے زلف وخال کے ساتھ اصفہان کے شعراء کے طرز میں عشق انگیز کلام کہا کرو۔ امیر خسرو نے انہی دلآویز صفات کے ساتھ اپنا کلام کہنا شروع کیا، اور اس کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا، (سیر الاولیاء ص ۳۰۱)

ایک بار امیر خسرو نے حضرت خواجہؒ کی مدح میں ایک منقبت کہی، اور جب اس کو سنایا تو حضرت خواجہؒ نے فرمایا: کیا صلہ چاہتے ہو" خسرو نے جواب دیا" کلام میں شیرینی" اس وقت حضرت خواجہؒ کی چارپائی کے نیچے ایک طشت میں شکر رکھی تھی، انھوں نے خسرو سے یہ طشت منگوائی اور ان سے کہا اپنے سر کے اوپر چھڑک لو، اور کچھ کھا بھی لو، اس کے بعد ہی ان کے کلام میں بڑی شیرینی پیدا ہوگئی، امیر خسرو آخر عمر میں پچھتایا کرتے، کہ کوئی اور بہتر صلہ مانگتا تو وہی ملتا، (سیر الاولیاء ص ۲-۳۰۱)

حضرت خواجہؒ نے اپنے محبوب مرید کی شاعری سے متعلق یہ اشعار کہکر اپنی شفقت کا اظہار کیا ہے، (سیر الاولیاء ص ۳۰۲)

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست | ملکیت ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست | زیرا کہ خدائے ناصر خسرو راست

اور واقعی خدا خسرو کا ناصر و حامی بنا رہا، وہ جب کوئی کتاب لکھتے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پیش کرتے، وہ اس کو ہاتھ میں لے کر اس پر فاتحہ (فاتحۃ الکتاب) پڑھتے، خسرو اور اُن کے قدردانوں کا بیان ہے کہ اسی وجہ سے ان میں کمال پیدا ہوتا گیا،

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

حضرت خواجہؒ کو یہ بھی خیال رہا کہ کہیں امیر خسروؒ شعر و شاعری میں پڑکر اسی میں الجھ کر نہ رہ جائیں، اس لئے اُن کو اس سے بھی بہتر کام میں لگایا، ان کی ہدایت کے مطابق تہجد کے وقت امیر خسروؒ کلام پاک کے سات پارے پڑھنے لگے، ایک روز حضرت خواجہؒ نے اُن سے پوچھا ترک! تمھارا کیا حال ہے، خسرو نے جواب دیا کہ اب رات کے آخری حصہ میں گریہ طاری رہتا ہے، یہ سُن کر حضرت خواجہؒ نے فرمایا" الحمد للہ اب تم کچھ ظاہر ہونے لگے،

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

امیر خسرو نے معشوقوں کے زلف و خال کے ساتھ جس طرز میں عشق مجازی کا راگ الاپنا شروع کیا تھا، وہ حضرت خواجہؒ کی صحبت میں رہتے رہتے عشقِ الٰہی میں بدل گیا، رفتہ رفتہ اس میں ایسا سوز پیدا ہو گیا کہ حضرت خواجہ کو اس ترک بچہ کے سوزِ سینہ پر فخر ہونے لگا اور اُن کے اشعار سن کر مست ہو جاتے، ایک بار امیر خسروؒ اُن کے سامنے اپنی ایک غزل گانے لگے جب اس شعر پر پہونچے،

رخ چہ دراز نمودی زمرا گفت تو ببیں | زیں ذوق مست تیغ خبرم کہ غیر سخن چہ بود

تو حضرت خواجہؒ نے نگاہِ محبت سے ان کو دیکھا، بے خود ہو گئے، اور اُن پر گریہ طاری ہو گیا،

امیر خسرو اس شعر کو بار بار گاتے رہے، (سیر الاولیاء ص ۵۱۶)

ایک اور موقع پر امیر خسروؒ کے صاحبزادے امیر حاجی نے اُن کی ایک غزل حضرت خواجہؒ کے سامنے شروع کی، اور جب یہ شعر سنایا تو

خسرو تو کیستی کہ درآئی درین شمار

کیں عشق تیغ بر سر مردانِ دین زدہ است

تو حضرت خواجہؒ پر وجد طاری ہو گیا، اور جب امیر حاجی نے اس کو بار بار دہرایا تو حضرت خواجہ نے اسی وجد و کیف میں اپنی ایک دستار امیر حاجی اور ایک امیر خسرو کو دیدی،

(سیر الاولیاء ص ۵۱۶ - ۵۱۵)

سیر الاولیاء میں تو نہیں لیکن سفینۃ الاولیاء میں ہے، کہ حضرت خواجہؒ فرمایا کرتے کہ قیامت کے روز مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ یہ ترک اللہ کا سوز سینہ،

(سفینۃ الاولیاء ص ۱۰۰)

حضرت خواجہ کو امیر خسروؒ سے ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے حضور میں جانے کی ہمت جب کسی کی نہ ہوتی، تو اُس وقت وہی اُن کے پاس بھیجے جاتے، حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ حضرت خواجہؒ کے بڑے محبوب مرید تھے، اُن کو خلافت بھی عطا کی تھی، اور رشد و ہدایت کی غرض سے سات سو ہمراہیوں کے ساتھ دولت آباد بھی بھیجا، جب وہ حضرت خواجہؒ سے روحانی تعلیم پا رہے تھے، تو کچھ لوگوں نے حضرت خواجہؒ سے بیان کیا کہ وہ یعنی شیخ برہان الدین غریبؒ مشائخ کی طرح کمبل کو دو تہہ کرکے سجادے پر بیٹھتے ہیں، حضرت خواجہ کو ان کی نشست کا یہ طریقہ ناگوار گذرا، جب وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اُن سے مخاطب ہونا پسند نہیں فرمایا، اور جب جماعت خانہ میں تشریف لائے تو اپنے خادم اقبال سے اُن کو یہ کہلا بھیجا کہ وہ

جماعت خانہ میں نہ بیٹھیں، وہ یہ سن کر پریشان ہوئے، گھر جا کر سوگ میں بیٹھ گئے، برابر روتے رہتے،
لوگ ان کی عیادت کے لئے آتے، ان کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتے، امیر خسروؒ بھی ان کی حالت سے
متاثر ہوئے تو اپنی دستار گردن میں لٹکائی اور حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہؒ نے
ان کو اس طرح دیکھا تو پوچھا: "ترک کیا ہے؟" عرض کیا: "مولانا برہان الدینؒ کی معافی
چاہتا ہوں" یہ سن کر پوچھا: "مولانا برہان الدینؒ کہاں ہیں؟" امیر خسروؒ نے مولانا برہان الدینؒ
کو بھی ان کی دستار گردن میں ڈال کر صفِ نعال میں کھڑا کر دیا، پھر تو حضرت خواجہؒ نے تقصیر معاف
کر دی اور تجدید بیعت سے مشرف کیا۔

(سیر الاولیاء ص ۱۸۱ - ۲۷۹)

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی حضرت خواجہؒ کے بہت ہی چہیتے مرید تھے، دہلی میں ان ہی نے
ان کی جانشینی کی، جب روحانی تربیت پا رہے تھے تو ان کے دل پر جو کیفیت گذر رہی تھی اس کا
حال خود اپنے مرشد سے نہ کہہ سکے، امیر خسرو ہی نے جا کر ان کی طرف سے عرض حال کیا جیسا کہ
آگے ذکر آئے گا۔

سیر الاولیاء ہی کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک بار ایک شخص نے بڑی جرأت کے ساتھ حضرت
شیخ المشائخؒ سے کہا کہ جس نظر سے آپ امیر خسروؒ کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے مجھے بھی دیکھ لیجئے،
شیخ المشائخ نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن خسرو کو خیال آیا کہ میں اس کو یہ جواب دوں کہ پہلے ویسی
صلاحیت پیدا کرو (ص ۳۰۲)

امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ سے جو عشق رہا۔ اس کا ذکر تو ان کے پیر بھائی یعنی سیر الاولیاء کے
مصنف نے بہت کیا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان ہوا، بعد کے تذکروں میں بھی اس
عشق و محبت کی داستانیں بہت کچھ ملتی ہیں جو یا تو امیر خسرو کے ان معاصر تذکروں سے لی گئی ہیں،

جواب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ یا بزرگوں کے سینہ بہ سینہ جو روایتیں چلی آئیں ان کو قلمبند کر دیا گیا ہے۔

امیر خسروؒ اپنے مرشد کی ہر ادا اور ہر بات پر جان چھڑکتے۔ اخبار الاخیار (ص ۵۵) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ رات بھر اپنے حجرہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے جس سے ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بے خودی و وارفتگی طاری رہتی، ایک روز امیر خسروؒ صبح کے وقت حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شغل باطن سے ان کی آنکھیں سرخ تھیں، ان خمار آلود آنکھوں کو دیکھ کر امیر خسرو مست ہو گئے اور یہ شعر برجستہ کہا:

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب

کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

تزک جہانگیری (ص ۱۰ مطبوعہ علی گڑھ) میں ہے کہ ایک بار حضرت خواجہؒ جمنا کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے، تو دیکھا کہ ہندو اپنے کسی تہوار کے موقع پر جوق در جوق اس خیال سے غسل کر رہے ہیں کہ ان کو ثواب حاصل ہوگا۔ خسرو بھی ان کی معیت میں تھے، حضرت خواجہؒ نے ہندوؤں کے مذہبی شغف اور انہماک کو دیکھ کر امیر خسرو سے مخاطب ہو کر فرمایا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت خواجہؒ کے سر مبارک پر اس وقت ٹوپی کج تھی، امیر خسرو حضرت خواجہؒ کی زبان اقدس سے یہ مصرع سن کر مست ہو گئے، اور فوراً دوسرا مصرع یہ کہا:-

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

اس واقعہ سے کہ خسرو نے اپنے کج کلاہ مرشد ہی کی وجہ سے اپنے قبلہ کو راست کر دکھایا،

سفینۃ الاولیا (ص ۱۰۰) میں ہے کہ ایک بار امیر خسروؒ دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے،
واپس ہوئے تو ان کے پاس پانچ لاکھ نقرئی ٹنکے تھے، جو ان کے شاہی آقا نے ان کو ایک قصیدہ کے
صلہ میں عطا کیا تھا، دہلی کے قریب پہونچے تو ایک فقیر کو اپنے پاس آتے دیکھا جو حضرت خواجہؒ کی خانقاہ
تک آیا تھا، اس کو انھوں نے اپنی جوتیاں دے کر رخصت کیا تھا، امیر خسرو اس کے نزدیک آئے تو بے اختیار ہو کر
اس سے مخاطب ہوئے کہ تم سے میرے پیر روشن ضمیر کی خوشبو آرہی ہے، کیا تمھارے پاس ان کی کوئی
نشانی تو نہیں؟ فقیر نے وہ جوتیاں دکھائیں، امیر خسروؒ دیکھ کر بیتاب ہو گئے، فقیر سے پوچھا کہ اسے
فروخت کرتے ہو؟ وہ راضی ہو گیا تو انھوں نے پانچ لاکھ ٹنکے اس کو دے کر اپنے مرشد کی جوتیاں
خرید لیں، ان کو اپنے سر پر رکھ کر مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اس درویش نے
اتنے ہی پر اکتفا کیا، اگر اس کے بدلے تمام جان و مال طلب کرتا تو میں حاضر کر دیتا۔

یہ روایت تو بہت مشہور ہے کہ حضرت خواجہؒ کے محبوب بھانجے مولانا تقی الدین نوح کا عین شباب میں
انتقال ہو گیا تو ان کو اس سے بڑا صدمہ پہونچا، چھ مہینے تک ان پر مہر سکوت لگی رہی، اس سے
امیر خسروؒ بھی مغموم رہتے تھے، ان کو فکر ہوئی کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، ایک روز بسنت کا میلہ تھا،
ہندو دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہو کر ترانے الاپ رہے تھے،
امیر خسروؒ اس کو دیکھ کر بیخود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے
پھول توڑے، پگڑی کو کج کر کے مستانہ شان پیدا کی اور جھومتے جھامتے، اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی
خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر
اور ان کے اشعار سن کر تبسم فرمایا تو امیر خسروؒ کا کام بن گیا، اس روز سے جب ہندو کالکاجی کے
مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لئے اشعار
پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدینؒ کے مرقد پر جاتے ہیں اور وہاں سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے

مزار پر آتے ہیں، ان اشعار میں ایک شعر یہ ہے:

اشک ریز آمدست ابر بہار ساقیا گل بریز و بادہ بیار

قوال ہندی کی ایک ٹھمری کو پڑھ کر بار بار دہراتے ہیں، جس کا ایک مصرع یہ ہے:

ع عرب یار توری بسنت منائی

رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں پندرہ دن تک بسنت کا میلہ رہنے لگا اور دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے اور اب بھی یہ منایا جاتا ہے۔

مولانا شبلیؒ نے شعرالعجم کی دوسری جلد (ص ۱۲۸) میں رقمطراز ہیں کہ خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دوں گا، دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے: "الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بخش"

اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ حضرت خواجہؒ اور امیر خسروؒ ایک دوسرے کے حبیب و محبوب بنے رہے، مگر ان کے عارفانہ رشتے کے سلسلہ میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ جب حضرت خواجہ خود سلاطین وقت سے ملنا اور دربار میں جانا کسی حال میں بھی پسند نہیں کرتے تھے تو اپنے محبوب امیر خسروؒ کو دربار سے وابستہ رہنا کیوں گوارا کر رکھا تھا؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ دربار کی وابستگی سے شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی، سلاطین وقت سے ملنے پر چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے کوئی قدغن بھی عائد نہیں کر رکھا تھا۔

سیرالاولیا جیسے مستند تذکرہ کی روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس اجمیر کے نزدیک ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے ان کے لڑکوں کو تنگ کیا تو لڑکوں کے کہنے پر وہ

بادشاہ سے ملنے کے لئے اجمیر سے دہلی گئے، جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ساتھ مقیم ہوئے، خواجہ بختیار کاکیؒ خود سلطان شمس الدین سے ملے، جس کو صورت حال معلوم کرکے تعجب ہوا، وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ملا اور ان کے لئے فرمان لکھ دیا۔ (ص ۵۳) پھر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سلطان شمس الدین التتمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل نہ تھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے شہزادے خضر خان اور شادی خان خود حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی خانقاہ میں تربیت پاتے رہے (سیر العارفین ص ۴۷) حضرت خواجہ کا سلاطین دہلی سے نہ ملنا کسی شرعی قباحت کی بنا پر نہ تھا بلکہ یہ محض ان کے ذاتی کردار کا ایک پہلو تھا، اس لئے دربار سے امیر خسرو کا وابستہ رہنا کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہ تھی جس کو حضرت خواجہؒ کو گوارا نہ کرنا چاہئے تھا۔

حضرت خواجہ چنگ، رباب اور دوسرے مزامیر کے استعمال کو ناجائز سمجھتے تھے، ان سے کہا گیا کہ بعض خانقاہوں میں درویش چنگ، رباب اور مزامیر کی محفل سماع میں رقص کرتے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے کیونکہ جو فعل نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے، ایک مرید نے عرض کیا کہ یہ درویش جب محفل سے باہر آتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسی محفل میں کیوں شریک ہوئے جہاں مزامیر تھے اور وہاں کیوں رقص کیا تو جواب دیتے ہیں کہ ہم سماع میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی کہ اس جگہ مزامیر بھی ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ جواب درست نہیں، اور یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں (فوائد الفواد ص ۲۲۷) امیر خسرو کی زندگی تو چنگ، رباب اور مزامیر ہی میں گذری، ان کے دوست مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"وہ گانے اور راگ وغیرہ ایجاد کرنے کے فن میں کمال رکھتے تھے، موزوں اور لطف طبیعت سے جس فن کو بھی نسبت ہے اس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے سرآمد روزگار پیدا کیا تھا، ان کا وجود عدیم المثال تھا۔" (ص ۳۵۹)

امیر خسرو کے پیر بھائی سیر الاولیاء کے مصنف نے بھی لکھا ہے :

"در علم موسیقی کمال داشت" (ص ۵۰۸)

امیر خسرو کے ان دونوں معاصروں نے مزامیر کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن خود امیر خسرو نے اعجاز خسروی میں فن موسیقی پر بہت کچھ لکھا ہے جس کی مشکل عبارت آرائی کی وجہ سے ان کے اس فن کے کمالات کو سمجھنا آسان نہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلے گا کہ انھوں نے اس زمانہ کے مزامیر میں سے بچہ رباب، پنجہ چنگ، دست نائی، دست طنبور، دستک قوال، دستان ختنی، شہنائی، بالک شہنائی، بگل، مسنگ، دم سہنے، دمدمہ نے، تیرۂ ہندی، دہل غازی، دہلاک زناں، دہل زناں وغیرہ کا ذکر کیا ہے (اعجاز خسروی ص ۲۸۳، حصہ دوم) وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان مزامیر کے فن سے اچھی طرح واقف تھے.

صحت وعلت مزامیر نیکو دانیم کہ چوں چنگ از سفیدی اندام سر افگندہ ماند و نامے کہ شکمش از نغم افزار دہد و مسلک کہ از دمش در نالیدن آید و نوالک کہ تنگی نفس گلوگیرش کند و کونگی دف کہ از حرارت مدقوق گردد (ایضاً ص ۲۸۶)

ان کے بجانے کے فن میں اصلاحات بھی کیں اور کچھ نئی چیزیں بھی دریافت کیں.

اصلاح ہر یک بچہ طریق باید کرد و گرفتن نبض رباب و زدن رگ بربط چناں بر قانون حکمت دریافتہ ایم کہ بیمار را طبیب شفا توانیم شد (ایضاً ص ۲۸۶)

اس سے ظاہر ہے کہ امیر خسرو کو مزامیر سے خاص شغف رہا اور عام روایت تو یہ ہے کہ انھوں نے ستار، طبلہ، ڈھولک وغیرہ کے بجانے میں بہت سے اختراعات کئے.

اس سلسلہ میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب حضرت خواجہ مزامیر کی حلت کے قائل نہ تھے تو اپنے محبوب کو اس سے شغف رکھنے کی اجازت کیوں دی؟ اس کا جواب تو بظاہر یہ ہے کہ وہ مزامیر کو

مکروہ اور حرام ضرور سمجھتے رہے مگر ان کے مریدوں کی مجالس سماع میں اس کا استعمال جاری رہا ان کے بعض محتاط مرید اور خلیفہ مثلاً حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ تو اس سے پرہیز کرتے رہے مگر اور مرید اس سے اجتناب نہ کر سکے، امیر خسروؒ کا شمار موخر الذکر مریدوں ہی میں کرنا چاہئے۔ مزامیر کی حلت وحرمت پر بحث اب تک جاری ہے، بعض معتدل لوگوں نے یہ لکھ کر معاملہ کو طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ فقہاء کے یہاں یہ حرام ہے، لیکن صوفیائے کرام کے یہاں اس کی اجازت ہے۔

امیر خسروؒ کو بہت ہی محبوب اور عزیز رکھنے کے باوجود حضرت خواجہ کو کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ امیر خسرو دنیا کو تیاگ کر کے صرف ان کے آستانہ پر سر جھکائے ہوئے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا تعلق دنیا سے باقی ہے، سیر الاولیاء ہی کی روایت ہے (ص ۵۰۶) کہ ایک بار امیر خسروؒ مجلس سماع کے رقص میں شامل ہو گئے، انھوں نے رقص میں اپنے ہاتھوں کو اوپر کیا تو سلطان المشائخ نے ان کو اپنے پاس طلب کیا اور فرمایا کہ تم دنیا سے تعلق رکھتے ہو، تم کو رقص کے وقت ہاتھ اوپر نہ کرنا چاہئے، امیر خسروؒ نے اپنے ہاتھ نیچے کر لئے اور مٹھی باندھ کر رقص کرنے لگے، چشتیہ سلسلہ میں رقص کے آداب میں ہے کہ جب وہ رقص میں اپنے پاؤں زمین پر پٹکتے ہیں تو دنیا کو گویا لات مارتے ہیں اور جب رقص میں ہاتھوں کو اوپر کرتے ہیں تو گویا آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں، اسی کو اس شعر میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

رقص گر ہمی کنی رقص عارفانہ کن   دنیا زیر پائے نہ دست بر آخرت فشاں

سیر الاولیاء ہی کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں ہر قسم کے لوگ تھے، خوب طبعان عالم بھی، شعرائے بے نظیر بھی، ندیمان دلپذیر بھی اور جوانان لطیفہ گو بھی تھے، ان سب کی تربیت ان کے انداز طبع کے مطابق کرتے اور ان کے ذوق کو بیدار کر کے ان کا گویا امالہ کرتے رہتے۔

"خوب طبعان عالم از شعرائے بے نظیر و ندیمان دلپذیر و جوانان لطیفہ گوے ہمہ بر آستان حضرت سلطان المشائخ نہادہ بودند واز دولت او ہر کسے باندازہ طبع خویش در ہر قسم کرمی بودند ذوقہا در سینۂ خود احساس کردند۔"

(ص ۵۱۱)

چشتیہ سلسلہ کے اکابر بزرگ راہِ سلوک میں توبہ، عبادت، زہد، رضا، قناعت، مجاہدہ، مشاہدہ، ذکر، فکر، اصلاح، اخلاص، معرفت، شکر اور محبت پر زیادہ زور دیتے، ان میں جو اعلیٰ ترین مقامات پر پہونچے، وہ کوشش فرماتے کہ ان کی توبہ حضرت آدمؑ کی طرح ہو، عبادت حضرت ادریسؑ کی ہو، زہد حضرت عیسیٰؑ کا ہو، رضا حضرت ایوبؑ کی طرح ہو، قناعت حضرت یعقوبؑ، مجاہدہ حضرت یونسؑ، صدق حضرت یوسفؑ، تفکر حضرت شعیبؑ، اصلاح حضرت داؤدؑ، اخلاص حضرت نوحؑ، معرفت حضرت خضرؑ، شکر حضرت ابراہیمؑ اور محبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو۔

(سیر الاقطاب ص ۱۳۸-۱۳۷)

مگر ظاہر ہے کہ یہ تمام اوصاف ہر رہرو سلوک کے لئے ممکن نہ تھے مگر جوہر شناس بزرگ اپنے مریدیں کی ذاتی اور انفرادی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے اور ان ہی کے مطابق ان کو تعلیم دیتے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اپنے مریدوں کی تعلیم و تربیت میں بہت سخت تھے، کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے، مگر جو جیسا ہوتا اسی لحاظ سے پیش بھی آتے پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کی بیعت محض اس لئے فسخ کردی کہ وہ کمبل کو دوتہ کرکے اس پر بیٹھتے تھے، اس کو ان کی تن پروری اور راحت پسندی پر محمول کیا، حضرت جلال الدین اودھیؒ اپنے زہد و ورع، ترک اور تجرید کیلئے مشہور تھے، ان کے ساتھیوں نے ان سے درس و تدریس کی خواہش ظاہر کی، حضرت خواجہ نے

اس کی اجازت چاہی تو انھوں نے فرمایا کہ وہ کسی اور ہی کام کے ہیں۔ خواجہ مؤیدالدین کرہ سلطان علاؤالدین خلجی کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کے جاں نثاروں میں تھے، مگر ترک دنیا کرکے حضرت خواجہ کے آستانہ پر جبیں سائی کرنے لگے، علاؤالدین خلجی بادشاہ ہوا تو اس نے حضرت خواجہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ وہ خواجہ مؤیدالدین کرہ کو رخصت کردیں کہ اس کا کام بنائیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کو ایک اور کام درپیش ہے، اسی میں وہ کوشش کر رہے ہیں، جب پیامبر نے حضرت خواجہ سے کہا کہ آپ چاہتے ہیں کہ اپنے جیسا سب کو کرلیں ہے تو حضرت خواجہ نے فرمایا: اپنے جیسا کیا، میں تو اپنے سے بہتر کرنا چاہتا ہوں، خواجہ شمس الدین دھاری شاہی ملازمت میں دیوان کے عہدہ پر مامور تھے، اس کو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے مرید ہوگئے، اور ان کے ملفوظات کو جمع کرکے مرتب کیا، ایک دن اپنے مرشد سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آنے جانے والوں کے لئے ایک مکان بنوالوں، مرشد نے فرمایا: یہ کام اس کام سے جس کو تم نے چھوڑا ہے کم نہیں (سیرالاولیا؛ اخبارالاخیار ص ۱۰۲ - ۱۰۱۔ بزم صوفیہ از خاکسار مقالہ نگار ص ۲۶۰ - ۲۵۹) حضرت نصیرالدین چراغ دہلوئ جب حضرت خواجہ سے تربیت حاصل کر رہے تھے تو ان ہی کی ہدایت کے بموجب دس دس روز گذر جاتے مگر کچھ نہ کھاتے، جب خواہشات کا غلبہ ہوتا تو لیموں کا عرق پی لیتے، جب ان کی عبادت و ریاضت میں یاد الٰہی بڑھی تو خلق اللہ کے ہجوم میں ان کو سکون میسر نہیں ہوتا، اپنی یکسوئی میں خلل پانے لگے، جنگل جاکر عبادت کرنا چاہتے تھے، مگر مرشد سے اس کی اجازت براہ راست مانگنے کی ہمت نہیں ہوئی، امیر خسروؒ کا سہارا لیا اور ان ہی کو سفارش کرنے کے لئے مرشد کی خدمت میں بھیجا، مگر حکم ملا کہ وہ خلق اللہ کے درمیان ہی میں رہیں اور خلق کی جفاؤں کو برداشت کریں، اس ایثار کا بدلہ ان کو ملے گا، اس سلسلہ میں حضرت خواجہ نے یہ بھی فرمایا کہ مختلف افراد مختلف کاموں کیلئے موزوں ہوتے ہیں اسی لئے میں کسی سے توبہ کرنے کو کہتا ہوں کہ توآپ کو بھی بند رکھے اور اپنے دروازہ کو بھی

کسی کو یہ ہدایت دیتا ہوں کہ وہ مریدوں کی تعداد بڑھائے اور کسی کو یہ حکم دیتا ہوں کہ خلق اللہ کے درمیان ہی میں رہے، ان کی جفاؤں کو برداشت کرتے ہوئے ان سے حسن سلوک سے پیش آئے یہی مقام انبیاء اور اولیاء کا ہے، (سیر الاولیاء ص ۳۴۸)

حضرت خواجہ نے امیر خسروؒ کی تربیت ان کی افتادِ طبع اور ان کی سیرت کی فطری خوبیوں کے مطابق کی، وہ خود تو بادشاہوں سے کسی حال میں بھی ملنا پسند نہ کرتے، مگر امیر خسروؒ کو ان کا ہم جلیس اور ندیم بننے کی اجازت دے رکھی تھی، ان کو یہ اچھی طرح یقین تھا کہ امیر خسرو دربار کی رنگ رلیوں اور سرمستیوں میں شریک رہیں یا وہاں کے نغمہ و سرود سے لطف اندوز ہوں یا ان پر شاہانہ جود و کرم سے مال و دولت کی بارش کتنی ہی ہو، وہ ہر حال میں اپنے اخلاق و کردار کو بلند رکھیں گے اور اپنی سیرت کو داغدار نہ ہونے دیں گے، حضرت خواجہؒ نے ان کے متعلق جو رائے قائم کی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، وہ بادشاہوں کو اپنے قصیدوں سے خوش رکھتے، شاہانہ تقریبات میں شان و شوکت کی تصویر کشی کرکے درباریوں کو بھی محظوظ کرتے، پری رویانِ ہندی کے رقص کا ذکر کرنے میں اپنے شاعرانہ کمالات بھی دکھاتے، ہندی اور ایرانی راگ راگنیوں کو ملا کر ایک فن کارانہ امتزاج بھی پیدا کر دیا، مگر دربار داری کرکے اپنے مرشد کے پاس پہونچتے تو کچھ اور ہی نظر آتے، حضرت خواجہ کی روحانی تعلیم یہ تھی کہ محبتِ حق جب قلب کا محض غلاف بنی رہے تو معصیت کا امکان ہے لیکن جب خدا کی محبت قلب کے سویدا میں پہونچ جائے تو معصیت کا امکان نہیں ہوتا امیر خسرو کے قلب میں اپنے مرشد کی تعلیم کی وجہ سے خدا کی محبت ان کے قلب کے سویدا میں پہونچ چکی تھی اس لئے درباروں کی دنیاداری میں ان کے یہاں معصیت کا امکان ہی نہیں پیدا ہوا، سیر الاولیاء ص ۳۰۹ میں ہے کہ حضرت خواجہؒ کی تعلیم یہ تھی کہ طہارت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ دل کو خیانت وغیرہ کے ظواہر سے پاک رکھا جائے دوسرے یہ کہ اعضاء کو گناہوں سے پاک رکھا جائے تیسرے یہ کہ دل کو اخلاق ذمیمہ سے پاک رکھا جائے، امیر خسروؒ نے ہر حال میں اپنے دل کو اخلاق ذمیمہ سے پاک رکھا، اس لئے اپنے

شاہی اور روحانی دونوں آقاؤں کے یہاں محبوب رہے، حضرت خواجہؒ کی تعلیم یہ بھی تھی کہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک تو وہ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور اسی کی یاد اور طلب میں تمام دن مشغول رہتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو دنیا کو دشمن جانتے ہیں، اس کی مذمت کرتے اور اس کی عداوت میں عبادت کرتے رہتے ہیں، تیسرے وہ ہیں جو اس سے نہ محبت نہ عداوت کرتے ہیں اور اس کا ذکر بھی نہ محبت اور عداوت سے کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگ ان دونوں لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں (فوائد الفواد ص ۱۳)، امیر خسروؒ تیسرے قسم کے لوگوں میں سے تھے، وہ محض ایک زاویہ نشین صوفی ہو جاتے تو حضرت خواجہ کے حلقہ میں ایسے صوفیوں کی کوئی کمی نہ تھی، ان کی زندگی کے کمالات کا راز تو اس میں ہے کہ لسان حال اور لسان قال بن کر جام شریعت اور سندان عشق دونوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے خاتمہ بالخیر کو پہونچے، حضرت خواجہ کی تعلیم تھی کہ انسان کے پاس نفس بھی ہے اور قلب بھی، نفس سے غوغا اور فتنہ پیدا ہوتا ہے، قلب کے ذریعہ سے سکون، رضا اور ملاطفت حاصل ہوتی ہے، نفس قلب کے ذریعہ سے مغلوب ہو سکتا ہے، لیکن نفس کو نفس سے سہارا مل جائے تو فتنہ اور خصو کی کوئی حد نہیں ہوتی، اس لئے تحمل اور حلم اس درجہ کا ہونا چاہئے کہ

زہر بادی چو کاہی گر میرزی   اگر کوہے بکاہی ہم نیرزی

(فوائد الفواد ص [illegible])

امیر خسروؒ کی زندگی اس کا مظہر ہے کہ اپنے نفس کو اپنے قلب پر غالب نہیں ہونے دیا، جس سے ان کے قلب کو ایسا سکون حاصل ہوتا رہا کہ وہ اپنے روحانی آقا کی رضا اور شاہی آقا کی ملاطفت کے سایہ میں زندگی گذارتے رہے، وہ اگر اپنے روحانی آقا کی ہر نفس سے پر کاہ کی طرح لرزتے رہے تو انھوں نے اپنے شاہی آقا کی شان و شوکت کے پہاڑ کے سامنے جھک کر اپنے دین و ایمان کی بازی بھی لگانا پسند نہیں کیا، جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، مگر حضرت خواجہ سلطان وقت سے ملنا کسی حال میں بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے سلطان نے بھیس بدل کر امیر خسروؒ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، امیر خسروؒ سے سلطان نے اس کو

راز میں رکھنے کی فہمایش کی۔ امیر خسروؒ کے دل میں یہ خیال آیا کہ راز افشا ہونے کے بعد کہیں ان کے مرشد کو گرانی اور ناگواری نہ ہو، اس لئے سلطان کی فہمایش کے باوجود اپنے مرشد کو اپنے شاہی کلاہ بنا دیا جس کے بعد حضرت خواجہؒ شہر چھوڑ کر اپنے مرشد کی زیارت کے لئے اجودھن روانہ ہوگئے۔ سلطان کو خبر ہوئی تو امیر خسروؒ سے باز پرس کی کہ یہ راز کیوں فاش کیا، امیر خسروؒ نے ایمانی قوت سے سلطان کو یہ جواب دیا کہ اگر آپ رنجیدہ ہوتے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے، لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ تھا۔ سلطان کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ (سیر الاولیا ص ۱۳۵)

امیر خسروؒ کی روحانی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ ہر حال میں اپنے ایمان کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھا۔

امیر خسروؒ کو اپنے مرشد سے باطنی تعلیمات کے ساتھ ظاہری تعلیمات بھی برابر حاصل ہوتی رہیں، پہلے ذکر آیا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق روزانہ تہجد کے وقت کلام پاک کے سات پارے پڑھتے،

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

پھر ان کو یہ بھی تلقین کی کہ وہ مشائخ کی باتوں کا لحاظ رکھیں۔ (ایضاً ص ۳۰۴) حضرت خواجہؒ کی یہ تعلیم تھی کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں، لازمہ اور متعدیہ، عبادت لازمہ میں نماز، روزہ، حج، اوراد اور تسبیحات داخل ہیں، جن سے عبادت کرنے والوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔ عبادت متعدیہ کا فائدہ غیروں کو پہونچتا ہے، عبادت لازمہ میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو، طاعت عبادت متعدیہ میں اخلاص جہاں تک بس میں ہو اختیار کیا جائے۔ (فوائد الفواد ص ۲۱)

امیر خسروؒ اپنے مرشد کی اس تعلیم پر بھی برابر عمل کرتے رہے، جیسا کہ ان کے دوست مولانا ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ، عبادت اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزے رکھتے تھے۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹)

سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ اپنے دست خاص سے خطوط لکھ کر کچھ نہ کچھ تعلیم دیتے رہتے، ایک میں نصیحت کی کہ جسم کی حفاظت کے بعد شریعت کی ناپسندیدہ باتوں سے اجتناب کیا جائے، اپنے اوقات کی نگہبانی کرتے رہنا چاہیے، عمر عزیز کے ذریعہ سے تمام مرادیں حاصل ہوتی رہیں تو اس کو غنیمت سمجھا جائے، زندگی بیکار کاموں میں نہ گذاری جائے، اگر دل میں انشراح کی قوت پیدا نہ ہو تو انشراح قلبی کی پیروی کی جائے، کیونکہ یہی راہِ طریقت میں معتبر ہے اور تمام امور میں طلبِ خیر کو مقدم رکھا جائے۔

(سیر الاولیا ص ۳۰۵، ۳۰۶۔ اخبار الاخیار ص ۹۳)

اس بات کی کون تردید کرسکتا ہے کہ امیر خسروؒ کی زندگی اس نصیحت کے مطابق نہیں رہی۔ وہ جسمانی گناہوں سے محفوظ رہے، دربار کی رنگ رلیاں اور سرمستیاں شریعت کی ناپسندیدہ باتوں میں ضرور تھیں گر وہ ان کے دور کے محض تماشائی تھے۔ ان میں کبھی ملوث نہیں ہوئے، اپنے اوقات کی پوری نگہبانی کی، چاہے وہ اپنے مرشد کے حضور میں ہوتے یا دربار شاہی میں حاضر رہتے، ان کی عمر عزیز میں ہر قسم کی مرادیں حاصل ہوتی رہیں، ان کو وہ غنیمت اس لحاظ سے سمجھتے رہے کہ اگر یہ مرادیں دولت کی شکل میں ہوتیں تو ان کو اپنے خاندان، اعزہ، اقربا، غربا اور مرشد کی خانقاہ میں صرف کردیتے؛ اسی لئے انھوں نے اپنے پیچھے کوئی بڑی دولت نہیں چھوڑی، وہ چاہتے تو امیر کبیر بن سکتے تھے، لیکن درویشانہ زندگی ہی بسر کی، انھوں نے درباری داری ضرور کی لیکن اس کو ان کی زندگی کے بیکار کاموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، دربار داری کے سلسلہ میں انھوں نے جو قصائد کہے یا مثنویاں لکھیں وہ شعر و ادب کے شاہکار ہیں، بقول مولانا ضیاء الدین برنی انھوں نے اپنے پیچھے علم و فن کا ایک کتب خانہ چھوڑا، اگر وہ دربار سے وابستہ نہ ہوتے تو یہ کتب خانہ ان کی بعد کی نسلوں کو حاصل نہ ہوتا، آخر میں مذکورہ بالا تحریر میں حضرت خواجہؒ نے جو یہ نصیحت کی تھی کہ انشراح قلبی

کی پیروی کی جائے تو امیر خسرو اپنی نجی، روحانی، ادبی اور درباری زندگی میں اسی انشراحِ قلبی کے پیکر تھے اور تمام امور میں طلب خیر کو مقدم رکھتے۔

امیر خسروؒ کی وفات جس انداز میں ہوئی وہ بھی ان کے مرشد سے عشق کے انتہائی کمال کا ثبوت ہے، بقول مولانا شبلی خسرو اپنے مرشد کا جمال دیکھ کر جیتے رہے، جب ان کے مرشد کی وفات ہوئی تو خود ان کی بھی موت آگئی، وہ اپنے مرشد کی وفات کے وقت دہلی سے دور سلطان محمد تغلق کے ساتھ بنگالہ کی مہم پر تھے، وہاں یکایک ان کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، سلطان سے اجازت لے کر چل کھڑے ہوئے۔ دہلی پہونچ کر معلوم ہوا کہ محبوب الٰہی اپنے محبوب سے جا ملے۔ یہ سن کر بے تاب ہو گئے، اپنا منھ سیاہ کیا، کپڑے پھاڑ ڈالے، خاک میں لت پت حجرہ میں پہونچے

جامہ دراں، چشم چکاں، خون دل رواں

بولے اے مسلمان میں کون ہوں کہ ایسے بادشاہ کے لئے روؤں، میں تو اپنے لئے روتا ہوں کہ سلطان المشائخ کے بعد میری زندگی کی بقا زیادہ نہیں، اس کے بعد چھ مہینے اور زندہ رہے، پھر اپنے محبوب سے جا ملے، سلطان المشائخ کے روضہ کے پاس ہی دفن ہوئے۔

(سیر الاولیا ص ۳۰۵)

سیر الاولیا میں تو نہیں مگر اور تذکروں میں یہ روایت بھی ہے کہ دہلی پہنچ کر جب ان کو اپنے مرشد کی وفات کی خبر ملی تو اپنی ساری ملکیت مرشد کے ایصال ثواب کے لئے فقیروں اور مسکینوں میں لٹادی، ماتمی لباس پہن کر مرشد کے مزار پر پہونچے۔ اس سے ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ سبحان اللہ آفتاب تو زمین کے اندر ہے اور خسرو ابھی زندہ ہے، پھر یہ ہندی شعر پڑھا:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس　　چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہوں دیس

یہ پڑھ کر بے ہوش ہو گئے اور اسی اندوہ و غم میں چھ مہینے کے بعد عالم بقا کو سدھارے۔

(سفینۃ الاولیاء ص ۷۷، خسرو کی ہندی کویتا، بنارس ایڈیشن ص ۴، وحید مرزا)

سیرالاولیا کے مصنف ہی کا بیان ہے کہ امیر خسرو نے اپنے مرشد کی وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا تھا، جس میں وفات کی یہ تاریخ کہی :

ربیع دوم و ہژدہ زمہ در ابر رفت آں مہ

زمانہ چو شمار بیست داد و پنج و ہفصد را

(سیرالاولیا ۱۵۵)

یہ بات ذہن میں ضرور آنی چاہئے کہ اگر امیر خسرو مستقیم احوال صوفی تھے تو تصوف میں اپنے پیچھے کون سا سرمایہ چھوڑا۔ اس راقم کا جواب یہ ہے کہ افضل الفوائد اور اپنی شاعری۔

یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ امیر خسرو پر اب تک ڈاکٹر وحید مرزا سے زیادہ کوئی اور محقق مستند قرار نہیں دیا گیا ہے۔ وہ افضل الفوائد کو امیر خسرو کی زندگی کا پھل بتا کر لکھتے ہیں :

یہ کتاب بظاہر میر حسن کی عظیم تصنیف فوائد الفواد کی تقلید میں لکھی گئی، اس لئے یہ اعجاز خسروی یا خزائن الفتوح سے بالکل مختلف ہے، اس کی زبان بہت ہی سادہ، سلیس اور لفظی صنائع سے بالکل پاک ہے، اس زمانہ میں جو فارسی زبان بولی جاتی تھی، یہ اس کا عمدہ نمونہ ہے۔

(ص ۲۲۵)

مگر کچھ ایسے محققین بھی ہیں جو اس خیال کے ہیں کہ افضل الفوائد کو امیر خسرو نے خود مرتب نہیں کیا بلکہ ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، اس پر برابر بحث جاری ہے، اس میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ملیں گی، سنین و اسمار کے ذکر اور واقعات کی ترتیب میں بھی خامیاں ہیں، لیکن اگر مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کو محنت سے ایڈٹ کیا جائے تو اس کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دور ہو سکتے ہیں جیسا کہ آئندہ بحث سے ظاہر ہوگا۔ (باقی)

مولانا شاہ بدر الدینؒ

از

جناب مولوی محمد عاصم صاحب قادری ندوی

(۳)

ذوق طاعت و مجاہدہ | کسب سلوک، عبادت و ریاضت، طاعت و مجاہدہ کا ذوق موروثی تھا، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین اپنی "یادداشت" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"درعمر ہفت سالگی بحمد اللہ از ضروری مسائل وضو و نماز واقف گردید، نماز برخود لازم گرفت و بہر پنج وقت در جماعت شریک می شود"۔

جب آپ نے مشق سلوک شروع کی تو آپ کی حرارت ذکر و فکر سے خانقاہ کا ماحول منور ہوگیا، اس تاثیر کو ارباب ادراک نے نمایاں طور پر محسوس کیا، حالانکہ اس وقت آپ کی عمر زیادہ نہ تھی۔ مولوی شاہ محمد یحییٰ نے ایک بار فرمایا کہ میں آج کل خانقاہ میں ایسی روحانی تاثیر محسوس کررہا ہوں جیسی شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ کے زمانہ میں تھی۔

اس طبعی رجحان اور تسلسل اذکار کی وجہ سے معارف و اسرار اور احوال و مقامات سے بہت جلد آشنا ہوگئے، آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جب اذکار کی مشق شروع کی تو پیرومرشد نے حضرت رسول کے ملفوظات کا درس شروع کردیا، اس کے فوائد بہت جلد شروع ہوگئے، مجھے حیرت ہوئی کہ اس قدر جلد فائدہ کا پیدا ہونا ہماری حیثیت سے بالاتر ہے، جو کچھ بھی میں محسوس کررہا ہوں وہ ہمارے پیرومرشد کی

قوت تصرف ہے، اس وقت میری عمر سترہ، اٹھارہ برس کی تھی اور ملفوظات کے مضامین تمام ترحالات دواردات پر مشتمل ہیں، جس کی تفہیم ان ہی لوگوں کو ہو سکتی تھی جن پر اذکار و اشغال کی مشق کے بعد یہ حالات گذرتے یا گذر چکے ہوں مگر اللہ رے ہمارے پیر و مرشد کی قوت تفہیم اور زور تصرف کہ مجھے ان مضامین کے سمجھنے میں کبھی الجھن نہ پیدا ہوئی، جیسے آئینہ کے اندر صورت نمایاں ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کا مطلب ہم پر منکشف کر دیا جاتا تھا۔

سات برس کے مجاہدہ و ریاضت کے بعد ۱۲۸۹ھ میں آپ کے عم محترم نے خرقہ پوشی کی، یہ محض رسم نہ تھی، بلکہ تمام مقامات سلوک طے کر کے آپ عرفان کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچ چکے تھے، حضرت نصر قدس سرہٗ کے جملہ مسترشدین اور خلفاء و نیز دیگر مشائخ ہند آپ کی عظمت کے معترف تھے ہی، چالیس برس کی عمر میں جب آپ نے سفر حج فرمایا تو شیوخ حرمین شریفین نے بھی آپ کے عرفانی مرتبہ کا اعتراف کیا، ان سے افاضہ اور استفاضہ کے تعلقات ہوئے، وہاں آپ جس ذوق و شوق اور لذت و کیف کے ساتھ مجاہدات میں مشغول ہوئے، احاطۂ بیان سے باہر ہے۔

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہہ سائی کی

روحانی رفعت اور باطنی فیوض و برکات کے لحاظ سے یہ مقدس سفر آپ کی مبارک سیرت کا ممتاز ترین باب ہے، حج و زیارت کے علاوہ مشاہیر علماء و مشائخ سے ملاقات ہوئی، شیخ عبد الرحمٰن ابو حضیر مدنی اور شیخ عبد اللہ سناری سے حدیث مسلسل بالاولیہ کی اجازت حاصل کی اور طریقۂ شاذلیہ احمدیہ کے اذکار و اشغال کی اجازت ان طریقوں کے نامور مشائخ سے حاصل کی اور اپنے طریقۂ قادریہ کی اجازت ان کو دی، شیخ الدلائل شیخ عبد الحق مہاجر قدس سرہٗ سے دلائل الخیرات، حزب البحر اور اولیات محمد سنبل کی سند حاصل کی، اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی بھی حیات تھے، ان سے بھی ملاقات کی اور اجازت حاصل کی، اس اجازت نامہ میں حضرت حاجی صاحب نے آپ کے بارہ میں بڑے

بلند الفاظ میں آپ کا ذکر کیا ہے، اجازت نامہ کی عبارت طویل ہے، اس کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

المقبول بین السموٰت والارضین — آسمان وزمین کے درمیان مقبول (جناب شاہ)

اللوذعی الالمعی بدرالدین متع اللّٰہ بہ — بدرالدین، اللہ مسلمانوں کو ان سے مستفید کرے،

المسلمین ظہرانوار الذکر علیٰ ظاہرہ وسریٰ — ان مشائخ میں سے ہیں، جن کا ظاہر و باطن (دونوں)

اثرہ فی باطنہ بل تشرف بالفناء — تجلیات ذکر الٰہی سے منور ہے، آپ فنا و بقاء کے

والبقاء [1] . — اعلیٰ ترین مقامات سے بھی مشرف ہو چکے ہیں:

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لطف کا سلسلہ صرف اجازت ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ غایت تکریم کے ساتھ پیش آئے اور رخصت کے وقت بہت دور تک مشایعت کی اور جب تک آپ مقیم رہے، حد درجہ قرب و اختصاص کے ساتھ پیش آتے رہے۔

دعا حزب البحر کا فیضان آپ کی ذات سے اتنا عام ہوا کہ بیشمار حضرات نے اس کی اجازت آپ سے حاصل کی، آپ کے آستانہ پر نصاب و اعتکاف کے لئے طالبین کا ایک ہجوم رہتا تھا، اپنی وفات سے چند روز پہلے حضرت مولانا سید محمد فاخر صاحب (دائرہ شاہ اجمل، الٰہ آباد) کو ان کی طلب پر آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، شاہ صاحب موصوف کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"احقر کو حضرت عارف باللہ الحاج شاہ امداد اللہ قدس سرہٗ نے جس طرح اس دعا حزب البحر کی اجازت دی ہے، میں نے آپ کو اور آپ کے دونوں فرزندان حافظ سید شاہد اور حافظ سید قدسی سلمہا اللہ تعالیٰ کو اجازت دی، اللہ تعالیٰ اس کے برکات سے متمتع فرمائے۔"

آپ کے سلاسل روحانی کی فہرست طویل ہے، ان چند سلاسل کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو آپ کو شیوخ حرمین سے پہونچے، سلسلۂ قادریہ بواسطۂ شیوخ شاذلیہ، سلسلۂ چشتیہ صابریہ، سلسلۂ نقشبندیہ

---

[1] ماخوذ از اجازت نامہ حضرت عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ، کتب خانہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ، سلسلۂ خضریہ، سلسلۂ رفاعیہ، سلسلۂ قشیریہ، سلسلہ احمدیدیہ، سلسلۂ مدنیہ مغربیہ، سلسلۂ زنیہ، سلسلۂ عیدروسیہ، سلسلۂ شاذلیہ، سلسلۂ قادریہ بواسطہ حضرت علامہ ابو عبداللہ محمد بن سلیمان جزولی مصنف دلائل الخیرات۔

معمولات شب و روز | ارشاد و تلقین، تصنیف و تالیف، عبادت و ریاضت، تدریس اور اشغال و اوراد کے اوقات مقرر تھے اور آپ اپنے تمام معمولات کے ہمیشہ پابند رہے۔ مشغولیت کے اس تسلسل میں استراحت کا وقت شب و روز میں شاید گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہ تھا۔

صبح کی نماز کے بعد سے اشراق تک آپ مشغول رہتے۔ اس کے بعد اوراد و وظائف سے فارغ ہوکر مختصر ناشتہ کے بعد چائے نوش فرماتے، دس بجے آپ کی خلوت کا دروازہ کھول دیا جاتا اور طالبین و زائرین باریاب ہوتے، اپنی اپنی حاجتیں پیش کرتے اور کامیاب واپس جاتے، کبھی کبھی بعض حضرات سے علمی، عرفانی اور دیگر موضوعات پر بھی نہایت مفید اور پُر مغز گفتگو ہوتی اور یہ سلسلہ دن کے ۱۲ بجے تک جاری رہتا۔ پھر دن کا کھانا تناول فرماتے اور کتابوں کا مطالعہ فرماتے، کبھی کبھی نیند آجاتی تو تھوڑی دیر قیلولہ فرما لیتے، ظہر کی اذان کے بعد ضروریات سے فارغ ہوکر جماعت کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے سات برس کی عمر سے اخیر ساعت تک نماز باجماعت کا اہتمام تھا، شاید ہی چند نمازیں تنہا پڑھی ہوں، نماز ظہر کے بعد اپنی خلوت میں تشریف لاتے اور اوراد معمولہ سے فرصت کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے خطوط کے جوابات اپنے دست مبارک سے تحریر فرماتے، پھر عصر کی اذان کے بعد جماعت کے لئے مسجد تشریف لاتے، نماز کے بعد اکابر کے مزار پر فاتحہ کے لئے جاتے، واپسی میں مسجد کے سائبان میں ایک خاص اور معین مقام پر تشریف فرما ہوتے، نماز عصر کے بعد کے معمولات ادا فرمانے کے بعد لوگ اگر کچھ پوچھتے تو ان کو جواب سے سرفراز فرماتے، اس وقت کی مجلس بھی نہایت بابرکت اور پر از معلومات ہوتی، نماز مغرب کے بعد مسجد ہی میں عشاء تک آپ مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد خلوت میں تشریف لیجاتے، تھوڑی دیر کے لئے

اس وقت بھی خلوت کھول دی جاتی، لوگ باریاب ہوتے، مختصر وقفہ کے بعد خلوت بند کردی جاتی، اس وقت سے آپ کتابوں کے مطالعہ، استفتوں کے جوابات اور زیر تصنیف کتابوں کے لکھنے میں ۱۲ بجے تک مصروف رہتے، پھر بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ استراحت فرماکر رات کے ڈیڑھ بجے سے تہجد اور اذکار واشغال میں صبح تک مصروف رہتے، اخبارات اور ماہنامے عموماً دن کا کھانا کھانے کے وقت ملاحظہ فرماتے۔

ایام علالت میں جب ضعف و نقاہت زیادہ ہوگئی تو بعض معمولات بالواسطہ ادا ہوئے، وفات سے چند روز پہلے نقل و حرکت سے بھی معذوری ہوئی تو اپنے خلف اصغر مولانا حافظ شہاب الدین صاحب مدظلہ کو حکم دیا کہ جمعہ کے معمولات قرآنی پڑھ کر سنائیں، چنانچہ انھوں نے سورۂ بقرہ رکوع اول، سورۂ بقرہ رکوع آخر آیۃ الکرسی، سورۂ حدید، سورۂ دخان، سورۂ یٰسین، سورۂ واقعہ، سورۂ جمعہ، سورۂ منافقون، سورۂ کہف سورۂ مزمل، سورۂ ملک، سورۂ نبأ، سورۂ نازعات، سورۂ اعلیٰ، سورۂ قدر، سورۂ والتین، سورۂ کوثر، سورۂ کافرون، سورۂ اخلاص اور معوذتین کی تلاوت کی۔

وفات سے دو دن پہلے جب غلبۂ نقاہت کی وجہ سے گفتگو محال تھی، اس حالت میں بھی نماز کا اہتمام تھا، حکیم شعیب صاحب کا بیان ہے: ۴۵ منٹ تک جس وقت سے میں حاضر ہوا تھا پھر دیر تک معمولات پڑھتے رہے، اس کے بعد زانو بدلا اور لیٹنے کا ارادہ کر کے بیٹھ گئے مگر لیٹے نہیں، میں یہ سمجھ کر کہ شاید آپ لیٹنا چاہتے ہیں، قریب پہونچا، عرض کیا کہ لٹادوں، بے حس و حرکت خموش بیٹھے رہے، مجھے یہ کیفیت دیکھ کر بہت تردد ہوا، میں نے پھر باصرار پوچھا تو آپ کو اس قدر ضعف ہوگیا تھا کہ آپ بول نہیں سکتے تھے بڑی مشکل سے نہایت دھیمی آواز میں فرمایا: ہاں لٹادو۔

درس قرآن اور درس ملفوظات کی مصروفیت بھی وفات سے چند ماہ پہلے تک پورے انہماک کے ساتھ جاری رہی، ۱۴۰۲ھ کے رمضان شریف کی آمد پر آپ کے فرزند گرامی مولانا قمر الدین صاحب نے درخواست کی کہ گذشتہ برسوں کے رمضان شریف میں ملفوظات مولانا کا درس ہوا کرتا تھا، تمنا ہے کہ

ہم لوگوں کو فہرست ا! کا رمرتبہ حضرت نقشر قدس سرہٗ پڑھا دی جائے، وقت مرحمت فرمایا گیا اور
یکم رمضان سے باقاعدہ تدریس شروع ہوئی۔

شاعری | ان مختلف و متنوع مصروفیات کے باوجود آپ سخن سنج بھی تھے، باطنی محسوسات اور واردات وکیفیات کے وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے شاعری کو صوفیہ و مشائخ کی بزم میں جگہ ملتی رہی ہے، اس کی رمزی وایمائی خصوصیت نے احوال و مقامات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی تربیت وتطہیر بھی کی ہے۔ اس لئے خانقاہوں کا ماحول طاعت و مجاہدہ اور ذکر و مراقبہ کی وجہ سے جہاں عارفانہ ہوتا ہے وہاں تجلیات حسن و حقیقت کے ادراک کی وجہ سے شاعرانہ بھی ہوتا ہے۔

خانقاہ مجیبی کی بھی صدیوں سے یہ روایت رہی ہے کہ اس کے اکثر سجادہ نشین علم وعرفان کے تبحر کے ساتھ ساتھ ارباب سخن بھی رہے ہیں، حضرت تاج العارفین کے پوتے حضرت فرد الاولیاء فرد فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے، آپ کے کلام کی دو جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، خسرو اور حافظ کی خصوصیات سخن کا امتزاجی نمونہ جس طرح حضرت فرد کی شاعری میں ہے ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتا حضرت فرد کے علاوہ متعدد صاحب دیوان شعراء ایسے گذرے ہیں جن کی عظمت کا اعتراف زمانہ نے کیا ہے۔ حضرت شاہ بدرالدین کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین خود صاحب دیوان شاعر تھے اور آپ کے پیر و مرشد شیخ الاسلام حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصر بھی فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ اس لئے مولانا کو دوسری خصوصیات کی طرح شاعری کا ذوق بھی وراثۃً ملا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مذاق سخن کی تربیت کی سلسلہ میں خانقاہ مجیبی کے شاعرانہ ماحول کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:

> "یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و شاعری کا خاصا چرچا تھا، اسی فضا میں میں نے سانس لی" (۱)

مشاغل کی کثرت کی وجہ سے آپ کو اس جانب توجہ کا موقع نہ ملتا، لیکن کبھی کبھی باطنی تحریک کی

(۱) حیات سلیمان: ص ۸

بنا پر جو کچھ آپ ارشاد فرماتے تھے وہ ایک مختصر مجموعۂ کلام کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، اپنے والد کے خالہ زاد بھائی شاہ وصی احمد مجیبی کو اپنا کلام دکھاتے تھے، علم عروض اور دوسرے نکات فن کی باقاعدہ تحصیل ان ہی سے کی، آپ فارسی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے، اردو کے اشعار تو دو ہی چار محفوظ رہ گئے ہیں، عربی کی بھی صرف ایک مناجات جو آپ نے راجگیر پہاڑ پر کہی تھی محفوظ رہ گئی ہے، بقیہ سارا کلام فارسی میں ہے، جس میں کچھ نعتیں، چند قطعات تاریخ، بعض قصائد منقبت اور کچھ غزلیں ہیں۔

گو آپ کا کلام زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ سراپا انتخاب ہے، نعتوں میں احوال ومقامات کی طرف اشارات اور غزلوں میں فارسی شاعری کی دلکش خصوصیات موجود ہیں، عشق حقیقی کا سوز و گداز حسن کی رنگا رنگ تجلیاں، ذوق و شوق کی وارفتگی، نگاہ و دل کی سرشاری، جذب وکیف کی بے ساختگی اور برجستگی ہر ہر شعر سے نمایاں ہے، اظہار جذبات میں صداقت کی جلوہ گری نے کلام کو بہت پُراثر بنا دیا ہے، لب و لہجہ کی پُرکارانہ سادگی اور مترنم الفاظ کی وجہ سے آپ کی غزلوں میں ایک خاص موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔

غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جاں را کمند زلف بہ سوئے تو می کشد
ویں استخوانِ ما سگِ کوئے تو می کشد

امروز بیقراریٔ دل شد فزوں چناں
شوقِ تو بار بار بہ سوئے تو می کشد

از بوئے گل نہ تازہ شود ایں مشامِ ما
لیکن بہ باغِ نفحۂ بوئے تو می کشد

بہ سودائے زلفِ تو سرمی فروشم
دل وجاں بہ تیر نظر می فروشم

چوں بے پردہ روزے تجلی نماید
بہ نورِ تجلی نظر می فروشم

درون ہر بن مویم شود برق اگر چشمے
نیاسایم ز دیدارت اگر بینم بہ ہر چشمے

بہ دیدار تجلیہائے بوقلمون تو دارم — بہ ہر صبحے دگر چشمے، بہ ہر شامے دگر چشمے
نگنجد شادمانیہائے عالم در دلش لیکن — کسے کز بہر تو دارد دل پُر درد و تر چشمے
بہ عالم ہر کہ باشد ہر چہ باشد جلوۂ تست — توئی ناظر ز ہر دیدہ توئی در پیش ہر چشمے

آں جفا پیشہ کہ نقد دل و ایماں زد و برد — غارتے بہ سرایں بے سر و ساماں زد و برد
نفسے چند کہ می داشت تن زارم بدرؔ — نشترے بر رگ جانم سر مژگاں زد و برد

بہ یاد چشم تو نرگس بہ باغ حیران ست — فدائے پیچ و خم زلف سنبلستان ست
چوں نیست آں گل خوبی بہ من درین گلگشت — بہ چشم من ہمگی خار ایں گلستان ست
فدائے چہرۂ تابان تست بدرؔ حزیں — فدائے کاکل تو ہندو و مسلمان ست

آپ کی نعتوں میں بھی یہی وارفتگیٔ شوق، گہری معنویت اور احتیاط ہوش و نظر کے ساتھ نمایاں ہے

ز عمرے بس ہمیں دارم تمنا — کہ پیشت جاں سپارم یا محمدؐ
بجز گردیدن گرد سرایت — چہ خیزد از غبارم یا محمدؐ
شفیقے مہربانے غمزدائے — کسے جز تو ندارم یا محمدؐ
ز عکس مہر رویت بدرؔ گردم — ہمیں امید دارم یا محمدؐ

در سر من سودائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم — در دل و دیدہ جائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بخت رسا کو تا کہ قدسا زد بہ قدومش بارِ خدایا — جان و تنم برپائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نہ تنہا من تمنائے تو دارم — خدا وصل تو خواہان است امشب
بیا بنگر نثار مقدمت را — دو چشم گوہر افشان است امشب

حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں یہ منقبت ملاحظہ ہو۔

محمد شد چو جسم و جانِ صدیقؓ — چہ می جوئی حد و پایانِ صدیق

نہ بینی جز محمد ہیچ در وے　　محمد ظاہر و پنہانِ صدیق

ز احسانش بہ عالم کیست خالی　　محمد داشت چوں احسان صدیق

اپنے پیر و مرشد حضرت نصر قدس سرہٗ کی وفات پر آپ نے جو قطعۂ تاریخ فرمایا، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

چوں ایں کمتر و کہتریں مریداں　　بہ ادراک حالش ز دل یافت ایمار

بجستم بہ ہر چرخ و ہم عرش و کرسی　　بہ عدن جناں ہم بہ فردوسِ اعلیٰ

بخلد بریں یافتم با محمدؐ　　بہ دیدارِ حق فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

۱۲۹۵ھ

علالت | مسلسل اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے آرام کے لمحات بہت کم میسر آتے تھے، ہرچند کہ آپ جسمانی طور پر تنومند نہ تھے لیکن عرصہ تک صحت خراب نہیں ہوئی، مگر ۱۳۱۷ھ کے بعد جب عمر پچاس سے متجاوز ہونے لگی تو صحت میں گاہے گاہے اختلال رونما ہونے لگا۔ مگر آپ مجاہدانہ عزیمت کی بنا پر جانگسل اور زہرہ گداز مصائب و شدائد کا تحمل اس استقامت کے ساتھ کرتے کہ معمولات میں ادنیٰ تغیر بھی نہ ہوتا، ضبط و تحمل کا یہ حال تھا کہ کبھی اپنی زبان سے جسمانی تکالیف کا اظہار نہ فرماتے۔

ایک مرتبہ رات کے پچھلے حصہ میں آپ کے سینہ میں درد شروع ہوا اور آہستہ آہستہ بڑھتا رہا، مگر آپ نے کسی پر ظاہر نہ فرمایا، صبح کی اذان کے بعد نماز باجماعت کے لئے مسجد تشریف لے گئے، واپس آکر معمولات اور وظائف میں مشغول ہو گئے، تکلیف کی شدت سے چہرہ کا رنگ متغیر ہونے لگا، اسی اثنا میں مولوی عبد الغفور صاحب عیسیٰ پوری نے خیریت پوچھی تو ارشاد ہوا کہ سینہ میں کچھ درد ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد شدید ہے، چہرۂ مبارک کو کئی رنگ بدلتے دیکھا ہے، فرمایا ہاں درد بہت ہے، سانس لینا دشوار ہے۔

۱۳۲۹ھ میں جناب شاہ محمد حیات صاحب سجادہ نشین حضرت مخدوم الملک بہاری کی خانقاہ میں

مہمان ہوئے، مشائخ کرام کے یہاں یہ دستور چلا آتا ہے کہ کسی صاحب کرامت کی آمد پر بطور اعزاز و اکرام مجلس سماع منعقد ہوتی ہے، حضرت کے ایماء پر اس مجلس کا اہتمام ہوا، لیکن آپ کو شدید تپ تھی رات کے نو بج گئے تھے اور آپ شدت تپ کی وجہ سے غشی کی حالت میں تھے لیکن اس کے باوجود تیمم فرمایا اور مسجد تشریف لائے، جماعت کے بعد اتفاقاً مجلس میں تشریف فرما ہوئے، قبی خاں قوال یہ شعر گا رہے تھے

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن

خیزم چوں گرد انتم چوں اشک آیم بہر غلطم بتن

تو حضرت نصر رحمۃ اللہ علیہ کے مسترشدین میں ایک صاحب حالت وجد میں مسجد سے باہر آگئے، سب لوگ کھڑے ہوگئے، حضرت بھی اپنی معذوریوں کے باوجود کھڑے ہوگئے، جب قبی خاں اس شعر پر پہونچے:

دارم امید مغفرت از دولت نعت شما

بایں گنہ بایں عمل بایں خطائے ذوالمنن

تو آپ بائیں طرف جھکے، خدام نے آگے بڑھ کر آپ کے دونوں شانوں کو پکڑ لیا، آپکا نصف جسم مبارک ان کے سینے پر آگیا اور غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، پھر دو آدمیوں کے سہارے ہوش آنے کے بعد آپ خلوت میں تشریف لے گئے، ساری رات مزاج متاثر رہا مگر معمولات میں کوئی فرق نہ آیا، اس طرح وقتاً فوقتاً امراض ہوتے رہے، لیکن پھر طبیعت ٹھیک ہوجاتی اور مزاج میں بدستور بشاشت اور تازگی آجاتی، عموماً صحت کے بعد لوگوں کو علم ہوتا کہ طبیعت متاثر ہوگئی یا اس درجہ اضمحلال تھا.

وفات سے کچھ پہلے نزلہ و تبخیر کی شکایت اکثر رہنے لگی تھی، آپ اسپرٹ کی وجہ سے ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک علاج سے احتراز کرتے تھے، اس لئے یونانی دوائیں تیار کی جاتیں۔

۴ر صفر ۱۳۳۲ھ کو کچھ تبخیری کیفیت شروع ہوئی، مگر کمزوری کچھ زیادہ رہی، جب ظہر کے لئے [illegible] ۲۹ [illegible] خانقاہ میں حاضر ہوئے، شام تک آپ سب سے [illegible] کر

سنتے رہے اور اجازت عطا فرماتے رہے، نماز عصر کے بعد بخار بہت بڑھ گیا، مغرب کے بعد جب مسجد سے باہر تشریف لے جانے لگے تو قدم اٹھانا دشوار تھا، مزاج کی ناسازی تحمل سے باہر ہوگئی، مگر اصرار کے باوجود آپ نے بایوکیک کے سوا کسی اور دوا کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور انتہائی ضعف کے باوجود سارے معمولات ادا فرماتے رہے، ۹ر صفر کو ڈاکٹر ایس پرشاد جب خلوت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ حضور کو ملیریا ہے، لیکن دشواری یہ تھی کہ ان کی مجوزہ دوا ہومیوپیتھک تھی، اسلئے اس اثنا میں یا تو بایوکیک دوا استعمال فرمائی یا پھر خیساندہ، بخار اور بخار کے ساتھ ضعف بڑھتا گیا اسی درمیان میں کچھ استغراقی کیفیت بھی پیدا ہوئی، پھر صفر کی گیارہ تاریخ آگئی، اس دن زیارت موئے مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خانقاہ میں اجتماع عظیم ہوتا ہے، صاحب سجادہ آثار شریف کی زیارت کراتے ہیں، مگر یہ پہلا اتفاق تھا کہ آپ اپنی سخت علالت کی وجہ سے تشریف نہ لیجا سکے آپ کے ایمار پر نیابۃً زیارت اور آثار نمائی کے فرائض آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے انجام دئے، گیارہ کے بعد بخار اور دست وپا کی سوزش اور بڑھ گئی، ۱۲ر صفر کو بخار نہ تھا، خیریت پوچھنے پر فرمایا کہ الحمدللہ طبیعت اچھی ہے، مسواک اہتمام کے ساتھ فرمائی، مولانا شاہ قمر الدینؒ کو طلب فرمایا اور معارف کے تازہ شمارہ کے شذرات پڑھواکر سنے، پھر جامع صغیر نکلواکر حاشیہ پر ایک حدیث کے اندراج کا حکم صادر فرمایا، تھوڑی دیر کے بعد کچھ سر گرانی شروع ہوئی، پھر بخار آیا ضعف بڑھ گیا اور نبض غیر منتظم ہوگئی، ۱۳ر صفر کو مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے مشورہ سے پٹنہ سے کچھ اور ڈاکٹر بلوائے گئے، یہ وہ دن تھا جب کہ آپ نے دوا اور پانی بھی قبول کرنے سے انکار فرمایا تھا، ڈاکٹر صاحبان نے انجکشن دیا، بخار تو کم ہوا مگر استغراقی کیفیت بڑھ گئی اور غایت ضعف کی وجہ سے قوت نے بھی اپنا کام کرنا چھوڑ دیا، ۱۴ر صفر کو بخار جاتا رہا، ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب نے اطمینان ظاہر کیا، مولانا شاہ سلیمان صاحب اور دیگر

حاضرین سے کچھ آپ نے گفتگو بھی فرمائی، تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی استغراقی کیفیت ہوگئی اگر کسی کی آواز سنتے تو آنکھیں کھول دیتے، دریافت مزاج پر ارشاد فرماتے، الحمد للہ! پندرھویں شب کو تمام اعزہ و خدام حاضر خدمت رہے اور ختم دلائل الخیرات، باقیات الصالحات وغیرہ کرتے رہے، لیکن اب خود سے آپ کروٹ بدلنے سے بھی معذور ہو گئے تھے، ۱۵ صفر کو اکثر خدام کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ استغراق نہیں بلکہ سفر آخرت ہے۔ سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی گئی اور درود شریف، نیز دیگر اوراد شروع کردیے گئے، خلوت کھول دی گئی، تمام مشتاقان زیارت نے شرف دیدار حاصل کیا اور آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے خواہشمندوں کی بیعت نیابۃً لی۔

وفات | انجکشن دیا گیا تھا مگر تمام حاضرین اور معالجین اب مایوس ہو چکے تھے، آخر وقت موعود آپہونچا اور صفر کی سولھویں شب کو سوا سات بجے وفات پائی، دن کو ساڑھے دس بجے نماز جنازہ ہوئی اور آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے پڑھائی، تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قدس سرہٗ کے مزار سے متصل مدفون ہوئے، آپ کی وفات پر سارے ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا اور اخبارات و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے، ذیل میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تاثرات درج کئے جا رہے ہیں۔

ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کے معارف میں لکھتے ہیں:

"ابھی گذشتہ مہینہ کے معارف میں ہم نے حضرت امیر شریعت صوبۂ بہار اور امارت شرعیہ صوبۂ بہار کا تذکرہ کیا تھا، خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے ایک ہی مہینے کے بعد ہم کو حضرت ممدوح کی دائمی مفارقت کا ماتم کرنا پڑے گا، حضرت مولانا شاہ بدر الدین سجادہ نشین پھلواری اس عہد کے جنیدؒ و شبلیؒ تھے، ان کا زہد و ورع، نزاہت و اتقاء، علم و عمل، صورت و سیرت، ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبۂ بہار میں روشن رہی اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں

کم تر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس عہد میں یہی ایک ہستی تھی، جو ظاہر و باطن، علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں، علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے تھے، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب اب ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

اولاد | آپ کے چار صاحبزادے تھے، جن میں مولانا شاہ محی الدین اور شاہ قمر الدین وفات پا چکے ہیں، اور مولانا شاہ نظام الدین اور شاہ شہاب الدین اس وقت موجود ہیں، آپ کی وفات کے بعد بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدینؒ خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد اب ان کے صاحبزادہ شاہ امان اللہ ان کے جانشین ہیں۔

خلفاء و مجازین | آپ کے خلفاء و مجازین کی فہرست طویل ہے، چند بزرگوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں، راس المتقین حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین قدس سرہٗ خلف و خلیفہ و جانشین، حضرت مولانا شاہ محمد قمر الدین قدس سرہٗ، مجاز جملہ سلاسل و مرویات، حضرت مولانا شاہ محمد نظام الدین صاحب مظلہٗ مجاز جملہ سلاسل و مرویات، حضرت مولانا شاہ و حافظ محمد شہاب الدین صاحب مدظلہٗ مجاز جملہ سلاسل و مرویات، مولانا حکیم سید محمد شعیب نیر پھلواروی مجاز جملہ سلاسل و مرویات، مولانا حکیم سید شاہ زبیر حسن صاحب ہلسوی مجاز جملہ سلاسل، خواجہ حسن نظامی مجاز جملہ سلاسل (علامہ شیخ ابو حضیر مدنی شیخ الحدیث حضرت فیاض المسلمین) مجاز طریقہ قادریہ وارثیہ و ذکر قدوسیہ، (مدینہ طیبہ) مولانا سید شاہ عبد اللہ قادری مجاز جملہ سلاسل سرینگر کشمیر، مولانا حکیم ابو الحسن صاحب دیسنوی والد ماجد علامہ سید سلیمان ندوی مجاز جملہ سلاسل۔

تصنیفات و تالیفات | بیان المعانی تفسیر اردو ناتمام غیر مطبوعہ، الوسیلہ، رویت ہلال مطبوعہ نایاب، تذکرۂ انساب خاندان امیر عطاء اللہ قلمی، سد اعتراض، عمدۃ المطالب فی انساب آل ابی طالب غیر مطبوعہ، مجموعہ کلام فارسی مطبوعہ، ان کے علاوہ بیش بہا مکاتیب ہیں جو مکاتیب بدریہ کے نام سے چار حصوں میں شائع ہو چکے ہیں اور بھی بہت سی قدر قلمی شکل میں موجود ہیں۔

اقبال بحیثیت غزل گو

از

جناب محمد ہاشم صاحب شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاعر یا ادیب انسانوں کی اسی دنیا میں رہتا اور بستا ہے اور زمانہ سے متاثر بھی ہوتا ہے، جس کا اظہار وہ کسی نہ کسی طرح کرتا رہتا ہے، ہر کام کی طرح شاعری کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، کسی شاعر کے یہاں اس کے مقصد اور فن کو علیحدہ علیحدہ کرکے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے اور کسی کے یہاں نہیں، اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کے فن کو ان کے مقصد سے جدا کرنا گویا جسم اور روح علیحدہ علیحدہ کرتے کا مترادف ہے، وہ مقصد کو مقدم رکھتے ہیں اور شاعری کو اس کے پیش کرنے کا آلہ سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ اپنا شمار شاعروں اور غزل گویوں میں نہیں کرتے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اقبال نظم گو کی حیثیت سے مشہور ہیں، مگر ان کو ایک غزل گو کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ان کے پیغام، ان کی فکر، ان کے تصورات، ان کے مقصد اور نقطۂ نظر، ان کے فلسفہ اور ان کی نظم گوئی پر کافی لکھا جا چکا ہے، اگر نہیں لکھا گیا یا بہت ہی کم لکھا گیا ہے تو اقبال کی غزل گوئی پر۔

فارسی اور اردو شعرا نے غزل کو عشق و محبت کے معاملات کے لئے مخصوص کر لیا تھا، غالب نے ان حدود کو توڑا، اس میں نئے نئے مضامین داخل کرکے غزل کے دائرے کو وسیع کیا، اس لحاظ سے اگر غالب کو جدید غزل کا امام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اقبال نے غزل کے دائرے کو اور بھی وسیع

کر دیا ہے، انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کے حسن و عشق کے تصوں ہی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہی سب چیزیں زندگی کی بڑی سے بڑی علامت بن کر ہمارے سامنے آسکتی ہیں، اس میں ہر قسم کا مضمون جذب ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ خالص علمی اور سائنسی نظریے بھی غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں، غزل کا دامن کائنات ہی کی طرح وسیع ہے اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ کائنات کے کسی بھی موضوع کو غزل اپنے اندر سمونے سے قاصر ہو، میر جو غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں، وہ ایک بات یا ایک واقعہ کو غزل میں باندھ دیتے ہیں، اقبال بھی ایک ہی شعر میں ایک پورا افسانہ بیان کر دیتے ہیں۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں کیا نہیں، ابتدا نہیں، عروج نہیں، خاتمہ نہیں، سب کچھ ہے، پورا افسانہ ہے، بس یہی اقبال کا کمال ہے، چاہے وہ مذکورہ بالا غزل کے شعر کی شکل میں ہو یا نظم کے اس شعر کی طرح ہو

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

ان کی غزلوں میں واقعیت کی آویزش ہے، نئی ذہنیت اور نئے وجدان کے نقوش سے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے اوراق بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری کے ہر دور میں غزلیں کہی ہیں لیکن تغزل کا وہ رچاؤ شروع کی غزلوں میں نہیں ہے جس میں بال جبریل کی ہر غزل ڈوبی ہوئی ہے، تغزل اور شعریت اقبال کے مزاج کی ایک فطری کیفیت ہے، اس لئے تغزل ان کے ابتدائی کلام میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں اپنی جھلک دکھائی دیتا ہے، انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ غزل کو حدود سے نکال کر لامحدود بنانے کی کوشش کی، غزل کی وسعتوں کو آفاق گیر اور اس کی رفعتوں کو بیکراں بنایا، انھوں نے غزل کو قومیات میں داخل کر کے اس سے نظم کا کام بھی لیا

ان کے اس اجتہاد سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

لاہور کے ادبی مشاعروں سے ہی اقبال کی غزل گوئی کا آغاز ہوتا ہے، انھوں نے داغ کو ایک مراسلے کے ذریعہ اپنا استاد بنا لیا تھا، وہ ان سے اصلاح لیتے تھے، انھوں نے داغ کے انداز میں متعدد غزلیں بھی کہی ہیں، ان پر ابتدا میں امیر و داغ کا کافی اثر رہا۔ ان کی ابتدائی غزلوں کو بنانے، ان کی زبان درست کرنے اور ان میں شوخی پیدا کرنے میں داغ کا بڑا ہاتھ ہے، ان میں داغ کی سلاست، اسلوب کی ندرت اور شوخی پائی جاتی ہے، مثال کے لئے دو غزلوں کے چند مشہور اشعار درج ذیل ہیں :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی	مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا	خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد	مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

یا

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہدی	بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

یہ یا اس طرح کی چند اور غزلیں سہل ممتنع کی اچھی مثالیں ہیں، ان میں جذبات کی سادگی، بیان کی شوخی اور اظہار کے تیکھے پن میں داغ کا اثر نمایاں ہے، اسی وجہ سے اقبال کے یہاں غزل اپنے روایتی رنگ میں بھی ملتی ہے، وہی حسن و عشق، تصوف و اخلاق کے موضوعات، وہی روایتی مضامین یعنی وعدۂ محبوب، واعظ پر طنز کے نشتر، برق و خرمن کی چشمک، موسیٰ، طور، لیلیٰ اور مجنوں کی تلمیحیں، دنیا کی بے ثباتی، عاشق مہجور کا الم، سبھی کچھ ان کے یہاں بھی ملتا ہے :

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں	اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

غزل میں تصوف کی روایت شروع سے ہی بہت اہم رہی ہے، یہ روایت بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے، اس کے ساتھ عقل و ہوش کی معرکہ آرائی ان کی شاعری کا اہم جزو ہے جو بعد کی شاعری میں تند تر ہوگئی ہے۔ ان کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے لبریز ہے، کہا جاتا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس تصوف کے خلاف تھے جسے انھوں نے غیر اسلامی تصوف سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وضاحت ان کے ایک خط سے ہوتی ہے:

"میرے نزدیک 'گوسفندی' مین اسلام ہے اور 'پیوستی' رہبانیت یا ایرانی (غیر اسلامی) تصوف ہے اور میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔"

ان کے صوفیانہ ذہن کی اس سے بہتر اور کون سی دلیل ہوسکتی ہے کہ بہت بڑے صوفی رومی ان کے مرشد ہیں:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، شرارے میں

یہاں اقبال کے تصوف پر بحث کرنا مقصود نہیں، کیونکہ نہ تو یہ اس کا موقع ہے، دوسرے یہ کہ وہ بجائے خود ایک مقالہ ہو جائے گا، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی روایت ان کے یہاں کبھی [illegible] کسی نہ کسی طرح جلوہ افروز ضرور ہو جاتی ہے اور یہ فنی پختگی

آگے چل کر ان کا مقصد غالب ہوتے ہوئے بھی فن کو کہیں مغلوب نہیں ہونے دیتی، وہ غزل کے تمام مروجہ اسالیب و موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں، لیکن داغ و امیر کی معاملہ بندی اور حسن پرستی ان سے جلد ہی چھوٹ گئی اور وہ سوز دل اور معرفت نفس کی منزل میں داخل ہوگئے، داغ کے یہاں زبان کی چاشنی اور مضامین کی تکرار اقبال پر دائمی اثر نہ چھوڑ سکی، اقبال فکر کے پیکر تھے، داغ کی صناعی، تکلف اور ان کی غیر دائمی حلاوت سے سیری ہو جانے کے بعد فطری طور پر ان کی طبیعت کو کلام غالب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اقبال اور غالب دونوں کی ذہنی بلندی کا معیار تقریباً ایک ہی تھا۔ اقبال کے یہاں وہی گہرائی ہے جو غالب کے یہاں ہے، اقبال نے غالب سے معنوی فیض حاصل کیا اور بہت سی غزلیں غالب کے رنگ میں کہیں، نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں غالب کا عکس نظر آتا ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

نظارے کو تو جنبش مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میری ہر رگ و پے میں ۞ یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے گمرہی رستہ نہ ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

دہ مے کش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں ۞ ہوائے گل فراق ساقیٔ نامہرباں تک ہے

اقبال نے غالب سے معنوی فیض حاصل کیا، جس کا اثر ان پر دیرپا ہوا، اسی لئے شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اقبال اور غالب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ غالب نے دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

کسی بھی شاعر کی بلندی کو پرکھنے کے لئے مستند اور کلاسیکی شعراء سے اس کا موازنہ کیا جاتا ہے، اقبال اس حیثیت سے بھی بہت بڑے غزل گو ہیں کہ غالب کے علاوہ ان کے یہاں بادشاہ غزل

میر تقی میر کا خاص رنگ بھی ملتا ہے، بہت سے درد و اثر والے اشعار ان کے یہاں مل جاتے ہیں:

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

میر کے شرارے اقبال کے خیال میں حل ہو کر اپنی رعنائی اور دلفریبی سے انسانی ذہن کو مسحور

کرتے ہیں، اسی لئے اقبال کو میر اور غالب کا مرکب کہا جائے تو نامناسب نہیں ہے۔

اقبال نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں ایک معرکۃ الآرا غزل لکھی تھی جو ان کی شاعری میں

اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، یہیں سے ان کا انقلابی رجحان واضح ہونے لگتا ہے اور ان کی مینائے سخن

میں صہبائے ملت کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اس غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے

بنے گا سارا جہاں میخانہ کہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

اسی میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ انقلابی رجحانات مزید ترقی کرتے ہیں اور یہیں سے ان کی غزل کا تابناک دور شروع ہوتا ہے،

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

یہ طرز اور یہ پیغام اقبال کو روایتی غزل سے بہت بلندی پر پہنچا دیتا ہے اور پھر یوں کہتا ہے:

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

قیام یورپ میں اقبال نے مہ جبینانِ یورپ کا مطالعہ بھی کیا، انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فروغ مے سے ان کے چہرے گلستاں تو ہو سکتے ہیں لیکن وہ فطری ملاحت اور پرخلوص محبت، جو نازنینانِ ہند کا طرۂ امتیاز ہیں، ان میں قطعی طور پر مفقود ہیں، وہ کشش و رعنائی جو محبوب غزل کے ایک بار دیکھنے سے ہی اپنا اسیر بنا لیتی ہے، ہزاروں خوبرویانِ یورپ کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد بھی اقبال کو کہیں نظر نہ آئی، بلکہ ان کے دیدار نے اقبال پر منفی اثر ڈالا:

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا

الٰہی تیرا جہان کیا ہے، نگار خانہ ہے آرزو کا

اقبال اس جذبہ کا اظہار کرنا چاہتے تھے جو یورپ میں رہ کر وہاں کے تمدن اور کلچر کے خلاف شدت سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا، لیکن کر نہیں سکتے تھے، جس کا اشارہ اس شعر میں ملتا ہے:

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا

مری خموشی نہیں ہے گویا، مزار ہے حرف آرزو کا

غزل میں اپنی بات رمزیہ انداز میں کہنا زیادہ پسند کیا جاتا ہے، اردو و فارسی شاعری رمز نگاری کی دولت سے مالا مال ہیں، اقبال کے یہاں زندگی کا مفہوم بہت وسیع ہے، اقبال نے زندگی کو متعلق بیحد تشبیہیں و استعارے استعمال کئے ہیں، زندگی کا مفہوم وسیع ہونے کی وجہ سے ان کے رمز و کنایہ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے اور رمز نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں، اقبال کو اپنے تغزل کے جمالیاتی محاسن کا احساس تھا اس لئے انھیں یہ کہنا پڑا:

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی شیخ کہتا ہے کہ وہ بھی حرام اے ساقی

رمزیت، جوشِ بیان، نیز اس کی ایمائی قوت اقبال کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ حسنِ ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر لیتا ہے، غزل کا حقیقی سرمایہ شاعرانہ رمز و کنایہ میں پوشیدہ ہے، ان کا رمز و کنایہ تازہ ہے اور مردہ نہیں ہے، وہ ان کے ذریعہ بڑی خوبی سے نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں۔

اقبال کے یہاں مستقل اجتماعی پیغامِ حیات ہے، انھوں نے اس بات پر زیادہ زور پہلی بار دیا کہ غزل کو دل کے اسرارِ پنہاں کے اظہار کا وسیلہ بنانے سے بہتر یہ ہے کہ ذہنی قوتیں اس پر صرف ہوں اور ذہن و غزل میں باہمی طور پر ہم آہنگی پیدا ہو جائے اسی لئے ان کے یہاں فکر و احساس ہر جگہ نمایاں ہے

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

اقبال کی غزلوں میں الفاظ و معانی کی موزونیت، مضمون کی بلندی، طرزِ ادا کی شوخی، جدت، ترکیبوں کی نزاکت اور تقابل و تناسب، بلاغتِ کلام اور ذوقِ لطافت کے اعلیٰ نمونوں کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں غنائی عنصر کا بھی اظہار ہے، ان کی بحریں مترنم اور موزوں ہوتی ہیں، نیز زمین شگفتہ اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے کا خاص خیال رکھتے ہیں، ان کے یہاں موضوع بدلتا ہے تو لب و لہجہ میں بھی تبدیلی آجاتی ہے، الفاظ کے استعمال کا معیار بھی بدل جاتا ہے، در اصل الفاظ خود بخود اچھے یا برے، دلکش یا بے کیف نہیں ہوتے، ان کا استعمال ہی ان کا معیار متعین کرتا ہے۔

اقبال، جہاں جیسا بیان ہوتا ہے اسی کے مناسب الفاظ لاتے ہیں، انھوں نے غزل میں لہجے کے جوش اور زور سے شکوہ پیدا کیا، انقلابی رجحان دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ پُرشکوہ لہجہ اختیار کر کے کلام میں وہی لطافت اور گھلاوٹ پیدا ہو سکتی ہے جو سادے الفاظ تک ہی محدود سمجھی جاتی ہے، غزل کی مروجہ بلند آہنگی، شیریں، لطیف اور خوش گوار تھی، اقبال نے اپنے خیالات کے سانچے میں استعمال کیا، اپنے موضوع کا آہنگ بیدار کیا اور ساتھ ہی اپنی شاعری پر تصوف کو...

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی — کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو — نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

بال جبریل کا یہ خاص لب ولہجہ ان کی فلسفیانہ اور دردمندانہ شخصیت کی تشکیل کا سبب ہوا۔ اقبال ہمارے سامنے کبھی فلسفی، کبھی واعظ و مصلح اور کبھی ایک دردمند انسان بن کر آتے ہیں اور موضوع کی عین مناسبت سے ان کا لب ولہجہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی ان کے یہاں سوز و گداز کا دریا بہتا ہے، مثلاً

متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اس شعر میں یوں تو انھوں نے فقط سوز و گداز سے محبت کا اظہار کیا ہے لیکن یہاں خود ان کا سوز و گداز نمایاں ہو رہا ہے:

اقبال نے غزل کو تو غزل ہی رہنے دیا لیکن اس میں اتنے اور ایسے موضوعات داخل کیے کہ غزل کی دنیا میں غالب کے علاوہ کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ انھوں نے غزل کے روایتی مزاج میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کر کے مسلسل غزلیں بھی اپنی انفرادی شان کے ساتھ لکھیں، جن میں غزل و نظم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان میں کہیں تکلف اور تصنع سے نہیں بلکہ برجستگی اور بے تکلفی کی وجہ سے بڑی ۔۔۔ تاثیر پیدا ہو گئی ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال کی ایک مسلسل غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں — کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اس غزل کے ہر شعر میں شوخی بھری ہوئی ہے، ہر لفظ سے ناز و نیاز نمایاں ہو رہے ہیں، اس سے شاعر کے تخیل کی بلندی، احساس کی شدت اور گہرائی اور پیرایۂ بیان کی بے تکلفی ظاہر ہو رہی ہے، خدا سے کہتے ہیں کہ تو نے حضرت آدمؑ کو دنیا میں بھیج دیا اور اب بلانا چاہتا ہے، تو ہم بھی یوں ہی نہ آجائیں گے، ہمیں اس وسیع دنیا میں بہت سے کام کرنا ہیں، اب تجھے انتظار کرنا ہوگا اور اگر روز محشر میں میری رسوائی ہوگی تو وہ تیری بھی رسوائی ہے۔ اگر انسان پر زوال آتا ہے تو وہ زوال خود تیرا زوال ہے، کیونکہ انسان کی تابانی سے تیرا جہان روشن ہے:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اسی طرح اور جگہ بھی معاملات شوق کا روئے سخن خدا کی طرف ہے، جو شوخی و بیباکی سے لبریز ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

اقبال کی غزلوں کی زبان شیریں، مضمون بلند اور خیالات میں حکیمانہ گہرائی ہے، تہ سیر دریا کی طرح ان کی غزلوں میں لطیف روانی ہوتی ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اسی شب و روز میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اقبال ایک فکر خاص کے شاعر اور بلند اخلاقی قوت حیات کے قدر داں ہیں، اسی لئے ان کے یہاں بلبل اور قمری کی مروجہ تشبیہ پر باز اور شاہین کو ترجیح دی گئی ہے، 'چیونٹی اور عقاب' میں اور 'شاہین' میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی شاعر اگر زندگی کو فروغ اور فراوانی نہ بخش سکے، اس کے آرٹ سے مسرت اور بصیرت میں اضافہ نہ ہو سکے، اگر اس سے حقائق کے الجھے ہوئے تار سلجھ نہ سکیں تو وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے، اسی لئے ان کی غزلوں میں فن کیساتھ مقصد بھی، پیام بھی، حرکت بھی، کیفیت بھی، سرشاری بھی، تاثیر بھی، جوش بھی، جذبہ بھی، بصیرت بھی، قلندری بھی، درد بھی اور تڑپ بھی ہے، وہ بہت بڑے غزل گو ہیں اور اس حقیقت سے واقف بھی ہیں:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ ہنر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

غالب پر مولانا حالی کی بے مثل کتاب 'یادگار غالب' سے لے کر غالب صدی تک بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے جا کر شائع ہو چکے ہیں اور غالبیات اردو کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے جس پر لوگ داد تحقیق دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے مصنف کی کتاب مدح و قدح کی روشنی میں اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے جس میں مرزا غالب کی [illegible] ان کی [illegible]

[illegible]

امیر فتح اللہ شیرازی

از

جناب سبط محمد نقوی صاحب اکبر پور فیض آباد

"...... درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہیں یہ سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے"...[1]

یہ وہ الفاظ ہیں جن میں علامہ شبلی نعمانی نے درس نظامی کے ہندوستان میں وسیع و ہمہ گیر اثر کا ذکر فرمایا ہے، حق یہ ہے کہ آج اس برکوچک میں جہاں بھی مشرقیات کا کچھ حصہ ہے وہ اسی درسِ نظامی کا فیضان ہے،

یہ نصاب درس خانوادۂ فرنگی محل کے بانی و موسس ملا نظام الدین سہالوی (۱۰۸۸-۱۱۶۱) کی نسبت سے درسِ نظامی یا درسِ نظامیہ کہلاتا ہے،...[2] البتہ اس کا سراغ لگانا آسان نہیں کہ سب سے پہلے کس نے اُسے ملا نظام الدین کی طرف منسوب کیا، علامہ شبلی نعمانی کا ارشاد ہے:-

---

[1] مقالات شبلی ج ۳ ص ۵۔ [2] بانی درس نظامی مصنفہ مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی ص ۲۵۹

"درس نظامی اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا۔"[۵۱]

بہرکیف اس نصابِ درس کی تاسیس چاہے نامور فرزند کے ہاتھوں ہوئی ہو، یا باکمال والد کے جس ہندوستانی عالم پر ان حضرات کا شجرۂ تلمذ تمام ہوتا ہے وہ مولانا عبدالسلام لاہوری کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس علمی شجرے پر تقریباً سبھی علماے سیر و سوانح متفق ہیں۔

ملا عبدالسلام لاہوری
|
ملا عبدالسلام دیوئی
|
ملا دانیال چوراسی
|
ملا قطب الدین شہید

قطب الدین شمس آبادی — امان اللہ بنارسی

ملا نظام الدین صاحبِ درسِ نظامیہ

لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ ملا نظام الدین نے ہر چند تکمیلِ تحصیل اپنے پدر عالی قدر کے تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، ورملا امان اللہ بنارسی کے حضور میں کی لیکن وہ اپنے والد بزرگوار کے بلاواسطہ شاگرد بھی تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں، کہ "ملا نظام الدین صاحبِ نصابِ نظامیہ کو خود اپنے والد ملا قطب الدین سہالی سے استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہئے تھا، نہ مل سکا"[۵۲] یعنی مولانا، ملا صاحب کے اپنے والد سے براہِ راست استفادے کی مطلق نفی نہیں کرتے، بلکہ

۵۱؎ مقالاتِ شبلی (تعلیمی) ص ۱۰۲، ۵۲؎ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت ج۱ ص ۲۰۱

استفادہ کی حقہ نہیں ہو سکا، تقریباً یہی خیال ملا صاحب کے سوانح نگار مولانا محمد رضا انصاری کا بھی ہے، لکھتے ہیں کہ اساتذہ میں سب سے پہلے خود والد ماجد ملا قطب الدین تھے، جن کی حیات میں شرح ملا جامی تک اُن کی تعلیم ہو چکی تھی، گو پوری قطعیت کے ساتھ سند اور ثبوت کے بغیر یہ کہنا ممکن نہیں کہ ملا شہید کی حیات میں جس قدر تعلیم ہوئی، وہ سب ان ہی سے حاصل کی، لیکن قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے، کہ فاضل اور معلم باپ نے ہونہار فرزند کی تعلیم کی طرف بذاتِ خود توجہ کی[1]،

اس لئے یہ تسلیم کر لینا حق بجانب ہے کہ قطب الدین شمس آبادی اور امان اللہ بنارسی کے واسطے کے بغیر بھی ملا نظام الدین کو اپنے پدرِ بزرگوار سے شرفِ تلمذ میسر تھا، اور اس طرح بھی اُن کا سلسلۂ تلمذ ملا عبد السلام لاہوری تک پہنچتا ہے، ان ملا لاہوری کا استادانہ مرتبہ کیا تھا، اس پر تفصیلی گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے، ربطِ کلام کے لئے محض اشارات سے کام لینا ہے، اسلئے آپ مولانا گیلانی کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں :-

"..... مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا عبد السلام کے متعلق "معدن عقلیات و نقلیات بود" لکھ کر اُن کے اساتذہ میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کا ذکر کیا ہے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ملا عبد السلام کے ممتاز استادوں میں میر فتح اللہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے، اور یہ کہ وہ براہِ راست میر فتح اللہ ہی کے ساختہ پرداختہ ہیں، ملا عبد السلام کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

قریب شصت سال درس گفت — تقریباً ساٹھ سال درس و تدریس
و جمع کثیر را بہ پایۂ فضیلت رسانید — کا کام کیا اور بہتوں کو فاضل

---

[1] بانیٔ درسِ نظامی ص ۱۶،

... نو سال عمر یافت، بنایا، نوے سال عمر پائی،،[1]

(مآثر ص ۲۳۶)

اس طرح سے میر فتح اللہ شیرازی کو درس نظامی کے استاذ الاساتذہ اور معلم اول کی حیثیت حاصل ہے بعض ارباب علم کا — جن میں مولانا مناظر احسن گیلانی سر خیل کی حیثیت رکھتے ہیں یہ خیال ہے کہ درس نظامی میں عقلیات کی جو گراں باری ہے، وہ میر فتح اللہ شیرازی کے عقلیاتی رجحان کا ثمرہ ہے لیکن بانی درس نظامی کے مصنف محترم کو اس نظریے سے اتفاق نہیں مگر اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ مناسب محل ہے، اور نہ ان سطور کا کم سواد راقم اس کا اہل ہی ہے۔

اس بات کا شکوہ کرنے کی تو گنجایش نہیں ہے، کہ میر صاحب کے حالات کی طرف ہمارے ارباب سیر و سوانح کو التفات نہیں ہوا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میر صاحب کے حالات میں جس تحقیق و تدقیق کی ضرورت تھی، اُسے بروے کار نہیں لایا گیا، آج ہمیں اُن کے ابتدائی حالات، یہاں تک کہ اُن کے والد ماجد تک کا نام صحیح طور سے معلوم نہیں جن مصنفات کو میر صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اس کا سبب بھی غلط فہمی ہی معلوم ہوتی ہے، ہوا یہ کہ دربار اکبری میں مولوی محمد حسین آزاد نے اس بنا پر کہ شیخ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے کہ علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں، اور ایک تفسیر بھی لکھی تھی[2] تفسیر منہج الصادقین کو میر صاحب کے خزینۂ خدمات میں جمع کر دیا، اگرچہ خلاصۃ المنہج کے بارے میں مذبذب معلوم ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ " ملا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے"[3] پھر اس کے بعد مولانا حکیم سید عبد الحئی اور مولانا سید محمد حسین نوگانوی کے علاوہ زمانۂ حال کے بعض ایرانی مصنفین بھی سب اسی راہ پر چلے جا رہے ہیں، بلکہ تنبیہ الغافلین (شرح نہج البلاغہ) بھی کسی وقت میر صاحب کے نام لکھ دی گئی لیکن معارف کے فاضل مضمون نگار

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ص ۲۹۹ [2] دربار اکبری طبع لاہور ۱۹۳۹ء ص ۶۰۱

[3] ایضاً ص ۶۰۰

جناب معین الدین رہبر فاروقی صاحب نے میر صاحب پر ایک مفصل و معلوماتی مضمون لکھتے ہوئے جس میں اُن کی موجدانہ حیثیت کو بڑی لیاقت سے اجاگر کیا گیا ہے، شاید پہلی مرتبہ اس شک کا اظہار کیا، کہ منہج الصادقین ان کی تصنیف ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"ہم جن فتح اللہ کا حال لکھ رہے ہیں وہ شیراز کے رہنے والے ہیں لیکن اس تفسیر میں کاشانی نے لکھا ہے، یہ تحقیق طلب ہے کہ دونوں میں کون سا بیان صحیح ہے"[۵]

مدیر معارف مولنا سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی گراں قدر تصنیف بزم تیموریہ میں اس مسئلہ کی زیادہ تنقیح کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، رہبر صاحب کی نظر سے تفسیر منہج الصادقین طبع سنہ ۱۳۱۱ھ گذری تھی لیکن شاید اس اشاعت میں ترجمۃ المصنف شامل نہیں تھا، اس لئے وہ ملا فتح اللہ کاشانی کے حالات سے آگاہ نہیں ہو سکے، چونکہ تفسیر مذکور کی بعد کی اشاعتوں میں مصنف کے حالات شامل کئے گئے ہیں، جن کا مطالعہ اس رجحان کو بے حد تقویت پہونچاتا ہے کہ ملا فتح اللہ کاشانی صاحب تفسیر اکبری دربار کے امیر فتح اللہ شیرازی معقولی سے مختلف بزرگ ہیں، ملاحظہ ہو :۔

"..... المولیٰ المعظم ملا فتح اللہ بن ملا شکر اللہ بن لطف اللہ کاشانی، عالمے است ...... از فحول علمائے امامیہ اواخر قرن دہم ہجرت و در تمامی علوم دینیہ طولیٰ الباع	بزرگ عالم ملا فتح اللہ بن شکر اللہ ابن لطف اللہ کاشانی دسویں صدی ہجری کے فحول علمائے شیعہ میں تھے، تمام علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے اور بجید باخبر تھے، خصوصاً علم تفسیر

[۵] رسالہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ، بابت جون ۱۹۳۳ء ص ۴۶۲ حاشیہ نمبر ۲،

وسیع الاطلاع و بالخصوص در علم
شریف تفسیر..... و وے از تلامذۂ
یگانۂ مفسر مشہور امامی علی بن حسن
زواری بودہ و بواسطۂ او از شیخ
اجل محقق ثانی علی بن عبد العالی
کرکی روایت می نماید و تالیفات
طریفہ متنوعۂ وے بہترین معرف
تبحر و تمہر علمی و کمال او بودہ.....
(۱) ترجمۂ فارسی احتجاج طبرسی
..... و آن را برائے شاہ طہماسپ
صفوی (۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ) تالیف
دادہ، ....
(۵) زبدۃ التفاسیر قرآن مجید و
آن را بعد از دو تفسیر دیگرش
منہج الصادقین و خلاصۃ المنہج
تالیف دادہ ـ او در نیمۂ ذی قعدۂ
سال (۹۷۷) بہ پایانش رسانیدہ
...... وفات وے در سال نہصد
و ہشتاد و ہشتم ہجری قمری واقع

ہیں اور وہ مشہور شیعہ مفسر علی بن
حسن زواری کے ممتاز شاگردوں
میں تھے، اور ان ہی کے واسطے سے
شیخ اجل محقق ثانی علی بن عبد العالی
کرکی سے روایت کرتے تھے، اور
اُن کی تازہ اور متنوع تالیفیں
اُن کے علمی تبحر و مہارت کی
معرف ہیں،
(۱) ترجمۂ فارسی احتجاج
طبرسی اور اسے شاہ طہماسپ
صفوی (۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ) کے لئے
تالیف کیا،
(۵) قرآن مجید کی زبدۃ التفاسیر
نامی تفسیر جسے اپنی اور دو تفسیروں
منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج
کے بعد تالیف کیا، اور وسط ذی
قعدہ ۹۷۷ھ میں مکمل کیا، اُن کی
وفات ۹۸۸ھ میں واقع ہوئی
اور جملہ ملاذ الفقہا سے مادۂ تاریخ

وجلد (ملا ذو الفقار) مادۂ تاریخ او وفات برآمد ہوتا ہے“

می باشد“[1]

ان حالات میں اگر فکر و تدبر سے کام لیا جائے، تو جو نتیجے مستفاد ہوتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں

(۱) ملا فتح اللہ کاشانی صاحب تفسیر کے استاذ علی بن حسن زواری ہیں، جب کہ امیر فتح اللہ شیرازی کے اساتذہ میں ان بزرگ کا نام نظر قاصر سے نہیں گزرا، امیر شیرازی کے مشہور و معروف اساتذہ ہیں خواجہ جمال الدین محمود، غیاث الدین منصور شیرازی، کمال الدین شیرازی اور احمد کرد،

(۲) امیر فتح اللہ شیرازی ۹۶۵ھ سے قبل ہی بیجاپور تشریف لا چکے تھے، اور ۹۹۱ھ سے ۹۹۷ھ میں اپنی رحلت تک ہندوستان ہی میں رہے، اس لئے ۹۷۷ھ میں شاہ طہماسپ صفوی کے لئے تفسیر کی تالیف ممکن نہیں،

(۳) ملا کاشانی فقیہ تھے، اور حدیث میں بھی اجازۂ روایت رکھتے تھے، آپ کے لئے معقولات سے شغف کی روایت نہیں ملتی، اسی طرح فقہ و حدیث میں ملا شیرازی کی دلچسپی کا کوئی ثبوت نہیں ہے، مغل اعظم اکبر کے دربار میں ان کی جو سرگرمیاں ذکر کی جاتی ہیں اون کو محدث و فقیہ کے تقدس سے کوئی ربط بھی نہیں،

(۴) امیر شیرازی کی تاریخ وفات "فرشتہ بود" سے ۹۹۷ھ برآمد ہوتی ہے، اگر یہی ایک مادہ تاریخ ہوتا تو غلطی یا غلط فہمی کا قیاس بھی ہو سکتا تھا، مگر مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ

---

[1] یہ حالات منہج الصادقین طبع چاپ خانہ محمد حسن علی طہران ۱۳۳۳ھ سے جناب مولانا الحاج سید ظفر الحسن صاحب پرنسپل جامع العلوم جوادیہ کالج بنارس نے ازراہ کرم نقل فرما کر روانہ فرمائے ہیں صفحہ کا نمبر معلوم نہیں ہو سکا،

"میرنی ساوجی نے اُن کے رنج کو حکیم ابو الفتح کے غم سے ترکیب دے کر عمدہ مادۂ تاریخ نکالا ہے،

اُمروز دو علامہ ز عالم رفتند رفتند و موخر و مقدم رفتند

چوں ہر دو موافقت نمودند بہم تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند"[۱]

اس کے علاوہ اعیان الشیعہ میں السید تقی الدین شیرازی کے حالات کے ضمن میں ایک نام اس طرح آیا ہے" السید شاہ فتح اللہ الکبیر بن حبیب اللہ الحسینی الشیرازی"[۲] اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ باخبر مصنفین امیر فتح اللہ شیرازی کو ملا فتح اللہ کاشانی سے ممتاز کرنے کے لئے الکبیر کی صفت سے متصف کرتے تھے، یہ معلوم نہیں کہ یہ کبر سن کی وجہ سے تھا، یا کسی اور سبب سے اسی اقتباس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے، کہ امیر فتح اللہ شیرازی کے والد ماجد کا اسم گرامی حبیب اللہ تھا لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ابن حبیب اللہ الحسینی الشیرازی کا جملہ سید تقی الدین کیلئے ہو لیکن یہ نہایت نادر و شاذ اتفاق ہوگا، کہ دو معاصر مشاہیر ایسے ہوں کہ جن کا نام اور ولدیت دونوں ایک ہوں،

ایک تیسری بات بھی ہے جو ملا فتح اللہ شیرازی اور ملا فتح اللہ کاشانی کو الگ الگ شخصیت قرار دینے کے حق میں دلیل قوی کی حیثیت رکھتی ہے، موخر الذکر کی نسبت ایک نادر الوقوع واقعے کی شہرت ہے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ ایک بار آپ سکتے میں مبتلا ہوگئے اور مردہ سمجھ کر سپرد خاک کر دیئے گئے، جب قبر کے اندر سکتہ دفع ہوا تو آپ کو ہوش آیا تو یہ نذر کی کہ اگر میں اس ہلاکت سے نجات پا سکوں گا تو قرآن مجید کی تفسیر تحریر کروں گا، بہرحال آپ قبر کن کے یا کسی اور وسیلے سے قبر سے باہر نکلے، اور شکرانہ نعمت و ایفاے نذر کے طور پر اپنی حیات ثانی میں یہ خدمت انجام دی،

---

[۱] دربار اکبری ص ۵۷، ۷۵۲، [۲] اعیان الشیعہ ج ۱۴، ص ۱۸۹،

اگر یہ افادہ امیر فتح اللہ شیرازی کی ہوتی، تو ناممکن تھا کہ ایسے عجوبۂ روزگار واقعے کے ذکر سے معاصر مورخ باز رہتے، بہرکیف راقم السطور یہ گزارش اہل علم و نظر کے ملاحظہ کے لئے بغرض استصواب پیش کرتا ہے، جن حضرات کو استدلال سے اتفاق نہ ہو یا مسئلۂ زیر بحث میں کوئی اور نقطۂ نظر یا خاص معلومات رکھتے ہوں، اوسے منظر عام پر لانے کی زحمت کرکے اس حیرانی کو دور فرمائیں، تاکہ برصغیر کے اس استاذ الاساتذہ کے صحیح حالات کی تدوین ہو سکے،

یہ گذارش بھی ضروری ہے کہ کیا زبدۃ التفاسیر، منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج کے علاوہ کسی ایسی تفسیر کا پتہ چلتا ہے، جو فتح اللہ شیرازی کی طرف منسوب ہو، شیخ ابو الفضل کو ملا فتح اللہ شیرازی سے جو تعلق تھا، اس کی بنا پر ان کا بیان نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، یا اور بات ہے کہ نقل میں کسی سے غلطی ہوگئی ہو، بہر حال مسئلہ تحقیق طلب ہے،

مقالات شبلی جلد سوم

سلسلۂ مقالات شبلی فن اور موضوع کے اعتبار سے نو جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی تیسری جلد میں مولانا کے وہ تعلیمی مضامین ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں الندوہ اور دکن ریویو میں لکھے، ان میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (قدیم تعلیم) ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ، درس نظامیہ وغیرہ بڑے اہم مضامین ہیں، قیمت:- ۰۰-۵

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کے اسلامی دور میں مسلمانوں نے مختلف مقامات میں جو درسگاہیں قائم کیں معاصر تاریخوں کی مدد سے انہی پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے،

مرتبہ مولانا ابو الحسنات ندوی، قیمت:- ۰۰-۴ "منیجر"

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت ندوہ میں پڑھتا تھا، درس کے دوران اور بحث و تحقیق کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا تھا، ہمارے استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب شاہ صاحب سے بخوبی واقف تھے، اُن کی مجلس میں شاہ صاحب مرحوم کی وسعت علم، بے نظیر حافظہ، ندرتِ فکر، اور دقتِ نظر کا ذکر آتا تھا، شاہ صاحب کے بعض شاگرد بھی کبھی کبھی آجاتے اور اپنے استاد کے علم و کمال کا والہانہ ذکر کرتے، گرمیوں کی چھٹی میں مولانا سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور لکھنؤ آتے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم اُن کے شفیق استاد تھے، ٹونک اُن کا وطن تھا، اس طرح تلمذ کے ساتھ وطن کی مشارکت بھی اُن کو ندوہ لاتی، اور بعض اوقات کئی کئی دن مولانا حیدر حسن خاں کے ہاں ان کا قیام رہتا، مولانا طلحہ کی عقیدت اور مولانا حیدر حسن خاں کی شفقت قابل دید ہوتی،

مولانا سید طلحہ صاحب نے مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو قریب سے دیکھا تھا، اور ان کے حلقۂ درس میں کئی بار بیٹھے تھے، اُن کی مخصوص صحبتوں میں بھی شریک ہوئے تھے علوم اسلامیہ پر خود اُن کی اچھی نظر تھی، خصوصاً تفسیر حدیث، اور رجال کا بہت اچھا مطالعہ تھا، حافظہ بھی

غضب کا پایا تھا لیکن با ایں ہمہ وہ شاہ صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے، اور اُن کی وسعت نظر، حفظ و اتقان، مہارتِ علوم، اور مجتہدانہ صلاحیت کے بیحد معترف تھے، اُن کا تذکرہ بڑے وجد و کیفیت کے ساتھ کرتے، کہا کرتے تھے، کہ اگر میں نے مولانا انور شاہ صاحب کو نہ دیکھا ہوتا، اور اُن کے حافظے کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا، تو مجھے ان روایتوں کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا، جو کتابوں میں سلف کے حافظے کے بارے میں درج ہیں، لیکن شاہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ جس امت کے پچھلوں کا یہ حال ہے، اس کے اگلوں کی کیا کیفیت ہو گی،

یہ باتیں سُن کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی، دیکھنے کا اتفاق تو اس کے کئی برس بعد ہوا لیکن دل پر اُن کی عظمت کا نقش اسی وقت سے قائم ہو گیا تھا، شاہ صاحب کے شاگردوں کے نام بھی کبھی کبھی کان میں پڑتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احمد رضا کے نام بار بار سننے میں آئے، پھر جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی، اور مولانا انور شاہ صاحب مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ متعدد بزرگوں نے استعفا دیکر دارالعلوم سے علٰحدگی اختیار کی، تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا، بعض اخبارات تو محض انھیں مسائل پر بحث کے لئے نکالے گئے تھے، یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی، اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے، لیکن اللہ نے اس کے نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا، اور دوسری طرف بعض اہل خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحب اُن کے رفقا، اور شاگردوں کو بلا کر

ایک نئے علمی مرکز کی بنیاد رکھدی، اساتذہ کی علمی شہرت، کارکنوں کی دل سوزی، اور
سب سے زیادہ مسلمانوں کی دریا دلی نے سارے ملک میں اس درسگاہ کا ایسا سکہ جمادیا، کہ تشنگان علم دور دور
سے کھنچ کر اس چشمۂ صافی کے گرد جمع ہوگئے، اور ڈابھیل کے گلی کوچوں میں قال اللہ اور
قال الرسول کے ترانے گونجنے لگے، شاہ صاحب کی صحت پہلے ہی اچھی نہ تھی، ڈابھیل کی
مرطوب آب و ہوا اور مضر ثابت ہوئی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں لگے رہے
اور جب تک صحت کی خرابی نے بالکل مجبور نہیں کر دیا، وہ یہاں سے نہیں ہٹے، ان کا قیام
اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکا، مگر اس کے باوجود ڈابھیل دیوبند کا ثانی سمجھا جانے لگا، شاہ
صاحب کے بعد ان کے مشن کو ان کے شاگردوں نے نہ صرف جاری رکھا، بلکہ اس میں چار
چاند لگا دیئے، ان اصحاب میں مولانا محمد یوسف بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے
درس و تدریس کے علاوہ ڈابھیل میں نشر و اشاعت کی غرض سے ایک علمی مجلس بھی قائم کی،
جس کی طرف سے بہت سی بیش قیمت کتابیں شائع ہوئیں، شاہ صاحب کی سوانح عمری کے
علاوہ ان کے افاداتِ درس بھی کئی ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع کئے گئے، ان میں
بخاری کی شرح فیض الباری خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، قدما کی کتابوں میں ہدایہ کی
تخریج نصب الرایہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن پہلے یہ بہت ہی معمولی کاغذ پر چھپی تھی، اور
اس کے نسخے بھی بہت کمیاب تھے، مولانا بنوری کا حدیث و فقہ کے طلبہ پر بڑا
احسان ہے کہ انھوں نے مصری ٹائپ میں بہت اچھے کاغذ پر اس کتاب کی طباعت کا انتظام
کیا، اور اس کے ساتھ بڑے عالمانہ حواشی تحریر کئے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ
بہت بڑھ گیا حضرت شاہ ولی اللہ کی بعض نایاب کتابیں بھی اُن کی توجہ سے شائع
ہوئیں، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں بھی پاکستان جانا پڑا، لیکن ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں

وہاں بھی جاری رہیں، بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں انھوں نے علم و دین کی خدمت کی، کراچی میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جس نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مرکزیت حاصل کرلی، اس درسگاہ کے ساتھ ایک ماہنامہ بینات بھی جاری کیا، جو اپنے وقیع علمی و دینی مضامین کی وجہ سے بہت ممتاز ہے، ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی مدارس کے درمیان کوئی رشتہ ارتباط نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور ان مدارس کو سرکاری سرپرستی میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنا دینے کی کوشش کی، لیکن مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنا دیا، جو بہت مفید ثابت ہوا، جو حضرات عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا، اس کامیابی سے ایک طرف اُن کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں دینی اور علمی حلقوں میں کتنا اعتماد حاصل تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ انھوں نے وہاں لا مذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض اوقات انھیں حکومت سے بھی ٹکر لینی پڑی، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اُن کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر بعض دوستوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ کسی بنوری ہی کا دل و گردہ تھا، ورنہ جنرل ایوب کے فوجی اقتدار کے زمانہ میں ایسی جرأت کی توقع کسی سے مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی، وہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نامور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی اولاد میں تھے، اور اُن کے اندر دینی حمیت تجدیدی روح اور استقامت و ثبات قدم انھیں کی وراثت کی بنا پر آئی تھی، جو شاہجہاں کے شان و شکوہ اور اسکے صاحب اثر وزیر سعد اللہ خاں کے جاہ و جلال کو خاطر میں نہیں لایا، اس کا نام لیوا ایوبی حکومت کی کیا

پرواہ کرتا، اُن کی ہمت و استقامت نے بہت سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحاد وبے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے، اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی، مسلم ممالک میں بھی ان کا بڑا اثر تھا، اور اکثر اسلامی اور دینی کانفرنسوں میں انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اور اُن کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، میرا ان سے ملنا جلنا زیادہ نہیں ہوتا تھا، مگر جب مل جاتے تو بڑی محبت سے پیش آتے ۶۶ء کے موسم حج میں اُن کے والد صاحب بھی ساتھ تھے، مجھے اُن سے خاص اہتمام سے ملایا، اور میرا تعارف بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ اُن سے کرایا، جب بھی ملاقات ہوتی، بڑی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ ملتے، آخری بار ۷۳ء میں مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی، اس وقت کمزور بہت تھے، پیدل چلنا دشوار تھا، اس لئے سعی گاڑی پر کر رہے تھے، آخری ملاقات وہیں مسعیٰ میں ہوئی، پھر اس کے بعد ملنے کا موقع نہیں ملا، کئی مہینہ سے اُن کی بیماری، اور کمزوری کی خبریں آرہی تھیں، بالآخر وقت موعود آپہنچا، اور ۱۵ر اکتوبر ۷۷ء کو جان جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور اُن کے جانشینوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے،

انھوں نے علم دین کی خدمت کے لئے جو ادارے قائم کئے تھے، امید ہے کہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں گے، اور اُن کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوتی رہے گی، تصانیف کے جو مسودے مکمل ہو چکے ہیں، اُن کی طباعت کا انتظام جلد ہونا چاہئے، اور جو ابھی نا مکمل ہیں، اُن کی تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے، اس بارہ میں جامع ترمذی کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے، امید ہے کہ اُن کے لائق جانشین اس کی تکمیل اور اشاعت کی خاص فکر کریں گے،

باب التقریظ والانتقاد

حیاتِ کلیم

مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین، ضخامت ۱۹۴ صفحات، کتابت وطباعت عمدہ،

ملنے کا پتہ :۔ شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، گیا۔

(ایک مبصر کے قلم سے)

حیات کلیم بہار کے نامور فرزند جناب کلیم الدین احمد کی کوئی سوانح عمری نہیں بلکہ یہ ان مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو ۱۹۷۵ء میں ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے ایک جشن کے موقع پر مرتب ہوا، اس میں بہار کے مشہور اہل قلم جناب قاضی عبدالودود، جناب عبدالمنان بیدل، جناب مسلم عظیم آبادی، پروفیسر سید حسن عسکری، پروفیسر سید حسن سرمد، جناب عطا کاکوی، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر عطا کریم برق اور جناب سہیل عظیم آبادی کے علاوہ باہر کے مشاہیر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر گیان چند کے بھی مضامین ہیں، بہار کے اور دوسرے مضمون نگاروں کی تحریریں بھی ہیں جن کے انداز بیان میں خوش سلیقگی ہے، اگر انھوں نے اپنے اس وصف کے اظہار کا سلسلہ جاری رکھا تو امید ہے کہ وہ ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کریں گے، اس کے مرتب ڈاکٹر محمد حسنین (صدر شعبۂ اردو گیا یونیورسٹی) کی یہ خوش مذاقی ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے ممدوح کلیم الدین احمد صاحب کی مدح وقدح دونوں پہلوؤں پر مضامین جمع کر دیئے ہیں، جن سے ان کی ادبی اور تنقیدی سرگرمیوں اور کاوشوں کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے، لائق مرتب نے اس مجموعہ کا حرف آغاز ایک پرزور اور جاندار انداز میں لکھا ہے، اس سے بھی ان کے ذوق کی ستھرائی ظاہر ہے۔

کلیم الدین احمد صاحب اردو ادب کے میدان میں بظاہر یکہ تاز بن کر اس رجز کے ساتھ اترے کہ محمد حسین آزاد اپنی رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیتے تھے۔ ان کے ذہن میں اردو زبان کی پیدائش اور ترقی کے اسباب کی صحیح تصویر نہیں تھی، انھوں نے جو ساری باتیں لکھی ہیں، وہ سست بنیاد پر ہیں، انگریزی لالٹینوں کی روشنی ان کے دماغ تک نہیں پہونچی، ان کی رائے اکثر گول ہوتی تھی (اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۵۳ - ۴۹) شعر و شاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں، ان کی نظر سطحی تھی اور یہ سطحیت ہر جگہ ملتی ہے، وہ خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں لیکن ان پر کافی غور و فکر نہیں کرتے، ان کی جانچ پڑتال نہیں کرتے، وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ بعض باتوں میں تضاد ہے، خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کائنات، وہ بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کو صاف سلجھا کر بیان بھی نہیں کر پاتے، یہ خیال کہ مقدمہ شعر و شاعری اردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے (ایضاً ص ۱۱ — ۸۸) مولانا شبلی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں کوئی جدت، تازگی اور باریکی نہیں (ایضاً ص ۱۱۸ - ۱۱۲) مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے، مصنف شعر الہند تنقید کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے اگر وہ یہ محنت کسی ایسے کام میں صرف کرتے جس سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی تو شاید ان کی محنت مشکور ہوتی، ان کی طبیعت میں کچھ ایسی پراگندگی ہے کہ صفائی، ترتیب اور تناسب کسی شے کا پتہ نہیں اس کتاب کو پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے، لیکن اس جہاد سے کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہیں، ان کا اسلوب بھدا ہے، دلچسپی سے معرا اور ساری باتیں سطحی ہیں، ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے، خشکی اور بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے، سخن فہمی، احساس طبیعت مذاق صحیح، تیز و تند ادراک، ان اوصاف سے عبد السلام مبرا ہیں (ایضاً ص ۹۶) ڈاکٹر عبدالحق

شاعری کے اوصاف اور نظم کی خوبیوں کی ٹھیک خبر نہیں، خیالات محض عصری خیالات کے بین فرق بھی وہ آگاہ نہیں ہیں۔ رشید احمد صدیقی اکثر بہک جاتے ہیں، اس بہکنے کا سبب ان کی کج روی کے سوا کچھ نہیں، مطمح نظر کی تنگی اور صحیح معیار کی کمی سے اکثر نتائج ظہور میں آتے ہیں (ایضاً ص ۳۲۸)

کلیم صاحب کی ان تنقیدوں کو پڑھ کر کچھ لوگ تو یہ سمجھے کہ ان کا قلم ایک ناسمجھ چھوٹے بچے کے ہاتھ کی چھری ہے، کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ انھوں نے اردو ادب کے دریا کی پرسکون سطح پر پتھر پھینکنے کی مشق کی ہے جس سے کچھ لہریں اٹھیں گی، مگر پھیل کر نظروں سے غائب ہو جائیں گی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہار کے علاوہ ہندوستان کے بعض ادبی حلقوں کی نظر ان کی طرف اٹھی کہ ان کی تنقیدی نظر کی وسعت اور گہرائی سے اردو ادب کو تنقید نگاری کو ایک نیا زاویۂ نگاہ ملیگا، بہار والوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ اردو ادب کی تنقید نگاری کی امامت اب ان کے یہاں منتقل ہو گئی ہے مگر جب کلیم صاحب پر خود تنقیدیں ہونے لگیں تو اب ان کے مخلص پرستاروں اور غالی معتقدوں کو بھی یہ کہنا پڑا کہ وہ متنازعہ فیہ بن گئے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ میں ان کی تعریف تو یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ وہ اہم نقادوں میں ہیں، وہ اردو تنقید میں ایک خاص نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور تنقیدی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا (حیات کلیم، پیش لفظ) انھوں نے اپنی تنقید میں طنز و ہجو سے وہ مصرف لیا ہے جو قدرت نے قوم نوح کے لئے ابرباراں سے..... ان کے اسلوب میں سرسید کی گرم عقلیت اور حالی کی پرخلوص سادگی ہوتی ہے، ان کی زبان اور انداز بیان سائنسی کھرا اور کھرا ہے (ایضاً ص ۱۲) حالی کے بعد اگر کوئی نقاد اس کثرت سے پڑھا اور لکھا گیا ہے تو وہ کلیم الدین ہیں (ایضاً ص ۱۴) وہ جو کچھ کہتے ہیں کھلم کھلا کہتے ہیں اور طنز سے خواہ خفی ہو یا جلی بہت کم کام لیتے ہیں (ایضاً ص ۶۵) ان کے معاصرین میں کوئی نقاد ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے (ص ۶۸) انھوں نے اردو انداز فکر میں

حاکمیت لانے اور اس کو مستحکم بنانے میں بلا شرکت غیرے ایک ایسا اہم رول ادا کیا ہے کہ آنے والی نسلیں ان کی باج گذار رہیں گی (ایضاً ص ۱۰۰) وہ اردو تنقید کو اتنا آگے بڑھاتے ہیں جتنا اب تک کوئی نہ بڑھا سکا ...... وہ اس تاریکی میں ایک مشعل لئے ہوئے صحیح راستے کو دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں (ایضاً ص ۱۴۹) انھوں نے اردو تنقید کے راستے میں ایک ایسا چراغ جلا دیا ہے جس کی روشنی میں نقد ادب کی منزل صاف و واضح دکھائی دینے لگی ہے (ایضاً ۲۰۲ وغیرہ وغیرہ)

لیکن اسی مجموعہ کے اور دوسرے مضامین میں ان پر سخت تنقیدیں بھی کی گئی ہیں' ان کی تنقید نگاری کے فن پر یہ لکھ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ وہ تنقید میں غلو کی سرحد تک پہونچ جاتے ہیں (ص ۲۲۱) ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں. ایک طرف تو ان کا رجحان خالص ہندیت کی طرف ہے' دوسری طرف وہ نہ تنہا اپنی تنقید میں بال کی کھال کھینچتے ہیں' بلکہ وہ ہمیشہ مشرق کی ہر چیز کو مغرب کی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں (ص ۲۲۵) ان کی تنقید میں تعمیری پہلو کے مقابلہ میں ملامت تخریبی پہلو زیادہ ہے (ص ۲۳۵)

یہ ضرب لگانے میں ان کے بعض ناقدوں کا لب و لہجہ اس سے بھی زیادہ تیز ہو گیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ وہ سکون اور ٹھہراؤ جو برسوں کے غور و فکر اور ریاضت کا ثمرہ ہوتا ہے ۔ اس سے ان کی طبیعت کا کوئی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا ، وہ انتہا پسند ہیں ، اپنی عقل اور ادراک پر انھیں اس قدر اعتماد ہے کہ دوسروں کی فکر و نظر انھیں ہیچ نظر آتی ہے ، ان کے فیصلوں میں بڑی عجلت اور قطعیت ملتی ہے ، کسی کا جائزہ لینے سے پیشتر انھیں اپنا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی ، وہ جب کسی پر حملہ کرتے ہیں تو اس شدومد کے ساتھ کہ ان کے ترکش میں ایک بھی تیر باقی نہیں رہتا (ص ۲۵۲)

بعض ناقد تو اشتعال اور غصہ میں یہ لکھ گئے ہیں کہ ان کی بعض رایوں پر غور کیجئے تو یہ باور کرنا مشکل ہو جائے گا کہ انھوں نے ان آراء کا اظہار بقید ہوش و حواس کیا ہے (ص ۲۵۶) ایک نقاد نے ان سے اپنی برہمی کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ انھوں نے حالی اور ان کے مقدمے پر جو تنقید فرمائی ہے اسے

پڑھ کر ان کے ابتدائی جملوں کی حیثیت بس یہ متعین ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی کے سر پر جوتیاں لگاتا جائے اور کہتا جائے کہ برا نہ مانو اس سے تمہاری تحقیر مقصود نہیں، یہ تو میری جوتیاں ہیں اور میری جوتیوں سے تنقیص و تحقیر نہیں ہوتی (ص ۲۶۷)

اردو کے ایک نامور نقاد نے ان سے چڑھ کر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جس کی کسوٹی پر میر، غالب، سودا، مومن، جوش، فیض، فراق، آزاد، حالی، شبلی، مجنوں اور سرور سب ہی ناقص ٹھہرتے ہیں، ممکن ہے کہ اس کی کسوٹی ہی میں کوئی خرابی ہو، اس نے لکھنے والے کے مافی الضمیر کو ہی سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو، یا نفسیاتی طور پر وہ ایک ایسی شخصیت رکھتا ہو جو متوازن اور صحت مند نہیں بلکہ احساس برتری یا کہتری نے اسے مریض بنا دیا ہے (ایضاً ص ۳۵۲)

کلیم الدین احمد کے مداح ان کا بڑا وصف یہ بتاتے ہیں کہ ان کی نظر انگریزی اور فرانسیسی ادب پر بڑی گہری ہے اس لئے یوروپی طرز تنقید کو اردو میں روشناس کر کے اس کو باوزن بنایا، مگر ان کے ناقدین نے یہ لکھ کر ان کو مجروح کیا ہے کہ وہ اردو ادب کے ایوان میں مغربی چور دروازہ سے داخل ہوئے (ص ۳۱۶) یورپ والوں کا ہر پیغام ہمارے یہاں وحی کا درجہ رکھتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو کافر، ہمارے اور بزرگوں کے ساتھ کلیم صاحب بھی اسی غلامی کی زنجیر میں مقید نظر آتے ہیں (ص ۲۱۹) ان کے یہاں رچرڈز کی سائنسی نظر سے زیادہ لیوس کی بت شکنی ہے، ان کے یہاں عالمی معیار و فن کا زور صحیح ہے، فارم کا احساس بھی مناسب ہے مگر ہندوستانی ادبیات کا گہرا مطالعہ اور ہندوستانی تہذیب کا عرفان نہیں، ایک کٹر حقیقت پسند ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کے دوسرے نظریوں کا بے لاگ اور بے تعصبانہ مطالعہ نہیں کر پاتے، ان کے یہاں ذوق سلیم کے بجائے ایک سرد علمیت ہے (ص ۲۱۱) ان کا آرٹ بے مقصد اور مہمل ہے، وہ فن کار کو زندگی سے مقابلہ کرتے نہیں دیکھ سکتے، ان کے خیالات غیر افادی اور غیر سماجی ہیں، سمندر پار سے آئے ہوئے آقاؤں نے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں

ان میں روشن اور تاریک پہلو موجود ہیں، کلیم الدین کا دامن اس تاریک پہلو میں الجھ کر رہ گیا ہے،
ان کی تنقید کے انداز کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ایک بورڈ والی دوسرے بورڈ والی کے سامنے تقریر کر رہا ہے،
(ص ۳ ۔ ۲۷۲) انھوں نے غالب، مومن، ذوق، آتش اور ناسخ کے بتوں کو مغربی آلۂ تنقید کی
مسلسل ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اس سے ان کو لذت ضرورت حاصل ہوئی مگر وہ خود معتوب
ہوگئے' (ص ۳۱۲)

کلیم الدین احمد کی یہ دو باتیں بہت عام ہوئیں، غزل نیم وحشی صنف سخن ہے، اردو میں تنقید کا
وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر، ان چونکا دینے والے جملوں سے
ان کی شہرت میں اضافہ ہوا، مگر ان کے بعض نقادوں نے ان کے ان خیالات پر بھی اپنی خفگی کا اظہار
یہ لکھ کر کیا ہے، اگر اردو میں تنقید کا وجود اسی طرح کی تنقیدوں سے ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے
کیا ہے تو اس کا فرضی وجود ہی خوب تھا (ص ۲۸۰) انھوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا،
قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہر صنف شاعری کو غیر معیاری بتایا اور ہر شاعر کسی نہ کسی شکل میں معتوب ہوا،
(سوائے عظیم الدین احمد کے) نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شدید متعصب اور جذباتی تصانیف کے نتائج ہر
نقاد کی نظر میں مایوسانہ اور غیر معتدل قرار پائے (ص ۳۶۵) کلیم الدین احمد بعض جگہ اپنی تنقید میں
عجب عجب باتیں کرتے ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آجاتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ غزل نیم وحشی
صنف ادب ہے۔ یا یہ کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق
کی موہوم کمر ہے، اس سے ان کی سطحیت اور جذباتیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کو تنقید نہیں کہا جا سکتا
ان میں تنقید کی بڑی صلاحیت تھی لیکن ان کی جذباتیت اور ان کی بدگمانی ان کو لے ڈوبی جس سے
وہ کہیں کے نہیں رہے (ص ۳۷۷)

کلیم صاحب کے طرز انشا اور انداز بیان کو بھی ان کے ناقدوں نے گھائل کیا ہے، مثلاً

ایک ناقد کا خیال ہے کہ ان کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ اردو پر انھیں عبور حاصل نہیں اردو ان کے لئے بدیسی زبان کا حکم رکھتی ہے، ان کی زبان میں ایک عجیب اکھڑا اکھڑا پن محسوس ہوتا ہے، ان کی بعض عبارتیں پڑھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اولاً وہ انگریزی میں سوچتے ہیں اور بعد میں لکھتے وقت اردو میں منتقل کر دیتے ہیں، زبان کی لطافت اور پاکیزگی تو بڑی چیز ہے، بعض دفعہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتے (ص ۲۶۳)

کلیم صاحب کا عمل اپنی تحریروں اور تنقیدوں میں اس پر رہا کہ دوسروں پر اعتراض کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے، اختلافات کے اظہار کرتے وقت کسی اعتذار یا نرم گوئی کی ضرورت نہیں (ص ۲۸۸) اسی لئے انھوں نے دوسروں کو خوب جلی کٹی سنائی۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ناقدوں نے بھی ان کو جلی کٹی خوب سنائی ہے، کلیم صاحب نے مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے لئے جتنے ناخوش گوار الفاظ استعمال کئے تھے وہ سب ان کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

اب ایک شخص اپنے ذوق سلیم ہی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ کلیم صاحب اپنے نقادوں کے درمیان محبوب ہیں یا معتوب، ان کے مداح زیادہ ہیں یا ان کے نکتہ چیں، انھوں نے ناموری پیدا کی یا بدنامی، یا وہ محبوب بھی ہیں، معتوب بھی، نیکونام بھی ہیں اور بدنام بھی، ان کے پرستاروں اور معتقدوں کو یہ حق ہے کہ وہ اس رائے پر پہونچیں کہ کلیم صاحب کے الفاظ نقد میں ریند کی تیز اور گہری کاٹ ہے، ان کی تنقیدوں میں وسعت نظری، استدلال کی پائداری اور ادبی اقدار کی پاسداری ہے، ان کی کتابیں اردو ادب میں کلاسیکی بن گئی ہیں، وہ اردو کے بہت بڑے محسن ہیں، اگر اردو کے پرستار ان کی خدمات کی طرف سے چشم پوشی کریں تو یہ احسان ناشناسی ہوگی، ان کی تنقید یں عہد ساز ہیں اردو شاعری اور تنقید پر ضرب کلیمی بروقت پڑی اور خس و خاشاک کو بہالے گئی، انھوں نے

اردو تنقید کے سفینہ کو اس وقت جب کہ یہ بحرانی حالات سے ہولناک بھنور میں پھنس چکا تھا، ڈوبنے سے بچالیا ہے، ان کی تنقیدی خدمات اردو کے سارے نقادوں سے دقیع ہیں، کلیم صاحب کے مداحوں کو مداحی کے حق سے جس طرح کوئی محروم نہیں کرسکتا، اسی طرح ان کے ناقدوں کو بھی یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ کلیم صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں عجلت سے کام لیتے ہیں، ان کے ذہن میں اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کی خوبیوں کی صحیح تصویر نہیں، انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں ان کی بنیاد بہت ہی کمزور ہے، انھوں نے انگریزی لالٹینوں کی روشنی میں اردو کے شعر و ادب کو سمجھنے کی کوشش کی جو ان کے بس کی بات نہ تھی، اسی لئے ان کے یہاں ہر جگہ سطحیت ملتی ہے، وہ خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں لیکن ان پر غور و فکر نہیں کرتے، ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے ان کی کل کائنات، یہ خیال کہ ان کی تنقید نگاری اردو میں بہترین کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے، ان کی تنقیدوں کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے، ان کی کتابوں کا پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے لیکن اس جہاد سے کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہیں، ان کا اسلوب بھدا ہے، دلچسپی سے معرا، ان کی طبیعت خشک اور بے رنگ ہے، خشکی اور بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے، وہ اپنی تنقیدوں میں اکثر بہک جاتے ہیں، اس بہکنے کی وجہ ان کی کج روی کے سوا کچھ نہیں، مطمح نظر کی تنگی اور صحیح معیار کی کمی سے ان کے اکثر نتائج غلط ہوتے ہیں الخ الخ

ممکن ہے کہ کلیم صاحب کے ناقدوں کی اس قسم کی تنقیدوں کو واسوخت سمجھا جائے، مگر اردو کی تنقید نگاری میں واسوخت کی ابتدا، کلیم احمد صاحب ہی نے کی ہے، واسوخت کے ذریعہ سے ایک نامراد عاشق اپنی زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کو بھول جانا چاہتا ہے، کلیم صاحب کے اس نفسیاتی تجزیہ کی شدید ضرورت ہے کہ

آخر ان کی زندگی میں کون سی محرومیاں تھیں جن سے انھوں نے اپنی تنقیدوں میں واسوخت کا رنگ اختیار کیا

اس مجموعہ کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس واسوخت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آدمی کی حیثیت سے نارمل نہیں، کیونکہ اسی مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ان سے کسی کتاب کے متعلق سوال کیا جاتا تو جواب دینا تو درکنار ٹالنے کی بھی کوشش نہیں کرتے (ص ۶۴) وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کسی ہم جماعت سے بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۶۵) وہ ضروری سوالات کا اب بھی بعض اوقات جواب نہیں دیتے (ایضاً ص ۶۰) ان کے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ کلیم الدین احمد نہ آدمی ہیں اور نہ حیوان، آپ جب پہلی بار ان کے روبرو ہوں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک بے جان پتلا ہے آپ کے مقابل کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے جس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے کام کر رہے ہیں کہ اس کے سر میں تھوڑی دیر کے اتفاقی انداز سے جنبش ہو جاتی ہے اور لبوں پر ایسی شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں جن سے مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے (ایضاً ص ۱۹۳) جب ان کی شادی ہوئی تو ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین کے بے تکلف دوست نے ان سے سوال کیا کہ کلیم الدین نے دلہن کی طرف التفات کیا یا نہیں، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شادی کے دوسرے دن دلہن کو بخار آ گیا، اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، تھرمامیٹر کلیم الدین کے حوالہ کر کے انھیں تاکید کی کہ ہر چار گھنٹوں پر دلہن کا ٹمپریچر لے کر اس کی نقل رکھیں تاکہ ڈاکٹر کو مرض کی تشخیص میں سہولت ہو (ص ۱۹۰)

یہ تصویر کسی نارمل آدمی کی نہیں، پھر ظاہر ہے کہ ان کی تنقیدیں نارمل کیسے ہو سکتی تھیں، وہ ابھی زندہ ہیں، ان کو کسی نفسیاتی دار العمل میں لے جا کر ان کا یہ جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ نارمل کیوں نہیں ہیں پھر اس کا فیصلہ خود بخود ہو جائے گا کہ ان کی تنقیدیں نارمل کیوں نہیں ہو سکیں۔

کلیم الدین صاحب نے محمد حسین آزاد کو یہ لکھ کر گھائل کیا تھا کہ آب حیات کا اہم ترین عیب اس کی انشا ہے (اردو تنقید پر ایک نظر ص ۴۹) یہ کوئی تنقید نہیں ہے بلکہ یہ اڈیننس ہے، اب یہی اڈیننس

ان پر بھی نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بعض ناقد لکھتے ہیں جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ان کا اہم نقص یہ ہے کہ اردو پر انھیں عبور نہیں، ان کی زبان میں ایک عجیب اکھڑا اکھڑا پن محسوس ہوتا ہے، زبان کی لطافت اور پاکیزگی تو بڑی چیز ہے بعض دفعہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتے، یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کر پاتے۔ ان کا بڑا وصف تو یہی ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، پوری طاقت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں، البتہ ان کے کہنے کے انداز میں لطافت نہیں ہوتی، اکھڑا اکھڑا پن ہوتا ہے۔ مگر ان کے مداح ان کی اسی زبان اور انداز بیان کو سائنسی کہتے ہیں، کھرا اور اکھرا (ص ۱۲) ان کی زبان اور انداز بیان کو عقیدت اور عجت میں سائنسی کہہ لیا جائے مگر ان کی غلطیاں نکالی جائیں تو ان کی ناموری میں بدنامی کی لہر اتنی تیز ہو جائے کہ کلیم الدین احمد صاحب ہی کی طرح بعض دل کے پھپھولے توڑنے والے اور دل جلے ناقد کہہ اٹھیں گے کہ جو صحیح اردو لکھنے کے مذاق سے عاری ہو اس کو اردو کے شعر و ادب میں تنقید کرنے کا کیا حق تھا، زیر نظر کتاب میں کلیم الدین احمد صاحب نے "اپنی تلاش" میں جو کچھ لکھا ہے وہ دلچسپی سے ضرور پڑھا جائے گا۔ لیکن عقیدت یا تعصب کی عینک اتار کر ناقدانہ مطالعہ کیا جائے تو اس کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں زبان اور انداز بیان کی خامیاں نظر نہیں آئیں گی۔ اس مجموعہ کے مرتب ڈاکٹر سید محمد حسنین اردو کے بڑے اچھے معلم ہیں، انھوں نے جو حرف آغاز لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو لکھنے کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، وہ سرخ روشنائی سے کلیم الدین احمد صاحب کی اس تحریر کو صحیح کرنے بیٹھیں تو اس کے سارے صفحات ان کی اصلاحات سے رنگے نظر آئیں گے۔ کلیم الدین احمد صاحب کا لب و لہجہ تھوڑی دیر کے لئے مستعار لیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی بعض عبارتیں تو اسکول کے نیچے درجے کے لڑکوں کی ایسی ہیں، بعض ایسی ہیں جیسی امتحان کے کمرے میں للبہ وقت کی کمی کی وجہ سے آخر وقت میں کچھ نہ کچھ گھسیٹ کر لکھ دیتے ہیں، وہ روزمرہ اور محاوروں کی تو پرواہ ہی نہیں کرتے، ان کے نزدیک فاعل، فعل اور مفعول کے استعمال میں تقدم و تاخر کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ جملوں کی ساخت اچھی ہو یا بری

اس کا بھی لحاظ نہیں کرتے، "تھے" لکھنے پر آتے ہیں تو اس کے لکھنے میں مطلق تکان محسوس نہیں کرتے، ان کے مضمون کے ص ۱۹ کی نو سطروں میں سترہ دفعہ "تھے" کا استعمال ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشو زوائد، غرابت، تنافر اور فصاحت وغیرہ کی تعریف سے بالکل ہی واقف نہیں، بعض الفاظ کے صحیح استعمال کی عدم واقفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے، اپنی ان خامیوں کے باوجود ان کو یہ لکھنے میں تامل نہ ہوا کہ آب حیات کا اہم ترین عیب اس کی انتشار ہے، مولانا عبدالسلام ندوی کا اسلوب بھدا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے سابق اساتذہ جناب عطا کاکوی اور جناب سید حسن سرمد اور خود اس مجموعہ کے مرتب ڈاکٹر محمد حسنین حسب ذیل جملوں کو سامنے رکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ وہ ان کو لکھتے تو کس طرح لکھتے

یہ کہنا مشکل تھا کہ میں آگے چل کر کیا کروں گا، عربی لوں گا، سائنس لوں گا، تاریخ لوں گا، یا انگریزی لوں گا (ص ۲۰) پٹنہ کالج دیکھا تھا، لیکن دیکھنے سے زیادہ اس کا شہرہ سنا تھا اور پٹنہ کالج سے زیادہ اس کے پرنسپل مسٹر جیکسن کا شہرہ سنا تھا.... ان کی قابلیت کا شہرہ نہ تھا (ص ۲۱) کہتے تھے کہ ایسا کوئی دوسرا اکنومکس کا پروفیسر انھوں نے نہیں دیکھا (ص ۲۱) ہملٹن چالیس پینتالیس منٹ میں اتنا پڑھا لیتے تھے کہ دوسرے پروفیسران دو گھنٹوں میں نہیں بتا سکتے تھے..... ہملٹن نے استعفیٰ دے دیا، اور انگلینڈ واپس چلا گیا جہاں اسے بہت اچھا پوسٹ مل گیا (ص ۲۱) جیکسن تو بے صبر آدمی تھے، (ص ۲۲) وہ مجبوری پرنسپل کے اوفس میں گیا (ص ۲۲) میں پرنسپل پٹنہ کالج ہوں (ص ۲۳)، عربی میں آنرز نہیں لیا، فلسفے میں بھی آنرز نہیں لیا، یہ دو امکانات بھی تھے (ص ۲۴)، کچھ لڑکوں نے بھی نعرہ بازی شروع کی (ص ۲۵) قابلیت کا ان کی سب اعتراف کیا کرتے تھے (ص ۲۴)، بولتے تھے اس قدر صاف اور آہستہ اور آواز بھی ایسی بلند تھی کہ ہر لفظ سمجھ میں آجاتا تھا (ص ۲۵) کچھ دنوں کے بعد دربار ڈے کے روز چھٹی ہوئی لیکن کوئی تنگ نہیں ہوئی (ص ۲۶) ان کی بیوی اور بچی ہلاک ہو گئی تھیں (ص ۲۶) پست قد، موٹے اور چندے سے

آدمی تھے (ص ۲۷) ان کے کلاس بہت بورنگ ہوتے تھے (ص ۲۸) ان کی تقرری ہوئی تھی (ص ۳۰) کلاس ون کا پوسٹ خالی ہوا تو اُسے اشتہار کے ذریعہ بھر گیا (ص ۳۱) کام کی باتیں کسی نے کہیں تو نوٹ کرلی (ص ۳۴) انھوں نے مجھ سے کچھ باتیں کرنی چاہی (ص ۳۵) دوسرے بنچ پر چلے گئے (ص ۳۵) اباجان کی سب سے قریب رشتے کی بھی بہن تھیں (ص ۴۶) ہم دونوں چہرہ بہ چہرہ میں (ص ۴۸) وغیرہ وغیرہ۔

کلیم الدین احمد صاحب بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں، وہ زیادہ کتابوں کے لکھنے والوں کو اچھا مصنف نہیں سمجھتے۔ اس لئے اب وہ کوئی اور کتاب لکھنے کے بجائے اپنی ساری تصانیف کی زبان پر صرف نظرثانی کرتے رہیں اور اسی کو صحیح، فصیح اور سحل کردیں۔ تاکہ انھوں نے اپنی تنقید نگاری کا جو چراغ آیندہ نسلوں کے لئے روشن کیا ہے وہ زبان اور انداز بیان کی خامیوں کی وجہ سے بجھنے نہ پائے۔

انھوں نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان کا جب جنازہ اٹھے گا تو نہ عبرت سر جھکائے گی اور نہ حیرت آئینہ دیکھے گی۔ گر ہم ان کے پرستاروں ہی کی طرح ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے جنازے کے ساتھ لوگوں کی آنکھیں نم ہوں گی، ان کے سر غم کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہوں گے اور وہ مدت مدید تک یاد آئیں گے، کچھ لوگ تو ان کو اس حیثیت سے یاد کریں گے کہ وہ ایک مست ہاتھی کی طرح اردو کی تنقید نگاری کے شیش محل میں داخل ہوئے اور اس کے در و دیوار کو منہدم کرنے کی کوشش کی، کچھ لوگ ان کو یاد کرکے کہہ اٹھیں گے کہ اردو دنیا ان سے بڑا طنز نگار نقاد پیدا نہ کرسکی، کچھ لوگوں کے ذہن میں ان کی یادوں کا چراغ اس لحاظ سے بھی روشن رہے گا کہ بڑے بڑے علمی پیل تن اور ادبی تہمتن ان کو چھیڑنے کی فکر میں لگے گر انھوں نے چھیڑنا گوارا نہیں کیا، کچھ لوگوں کے دل میں ان کی یاد اس لحاظ کہ

ہے گی کہ انھوں نے اردو کے نقادوں کو اپنے سامنے جھکانے کی کوشش کی، مگر وہ جھکنے کے بجائے خود ان کو جھکانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کا یہ وصف بھی یاد آئے گا کہ انھوں نے دوسروں پر وار کیا اور دوسروں پر پتھر پھینکے تو خود اپنے اوپر وار کو سہنا اور دوسروں کے پتھروں کی چوٹ کو برداشت کرنا سیکھا، کچھ لوگ ان کو اس لحاظ سے بھی یاد کریں گے کہ وہ بدنام ہو کر بھی اپنے پیچھے اپنا نام چھوڑ گئے۔

ہماری ادبی کتابیں

مولانا شبلیؒ کے شاہکار سلسلۂ شعر العجم کے علاوہ جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور جن میں مشاہیر شعرائے فارسی کی شاعری کے محاسن بیان کئے گئے ہیں، ہماری بقیہ ادبی کتابیں حسب ذیل ہیں

شعر الہند اول: قدماء سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل

قیمت ۱۵ - ۰۰

شعر الہند حصہ دوم: اردو شاعری کے اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے مفید

قیمت ۱۲ - ۰۰

گل رعنا: عہد بعہد کے اردو شعراء کا پہلا مکمل اور مستند تذکرہ، ولی دکنی سے لے کر حالی و اکبر تک کے حالات

قیمت ۱۲ - ۲۰

کلیات شبلی اردو: مولانا شبلی تمام اردو نظموں کا مجموعہ

قیمت ۳ - ۷۵

مکاتیب شبلی اول و دوم: مولانا شبلی کے مکاتیب کا مجموعہ

قیمت ۱۵ - ۹۵

مقالات عبدالسلام: مولانا کے چند ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ

قیمت ۱۵ - ۶۵

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

ابن الفارض : مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، ٹائپ بہتر، صفحات ۲۲۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ : ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

شیخ ابن الفارض ساتویں صدی کے مشہور صوفی اور عربی کے نامور شاعر تھے، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب سابق ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی نے چند برس قبل ان پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف کے سات شماروں میں مسلسل شائع ہوا تھا، اب انھوں نے اس کو ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے دو باب شیخ کے حالات و اخلاق کے لئے مخصوص ہیں اور آخر کے چار ابواب میں شعر و تصوف میں ان کے کمال کا ذکر ہے، لائق مصنف نے شیخ کی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا ہے، ان کے دیوان میں جن اصناف و موضوعات سے تعرض کیا گیا ہے، ان کا تجزیہ کرکے کلام کی اہمیت، مقبولیت، خصوصیت اور محاسن دکھائے ہیں، شیخ اصلاً صوفی تھے، اس لئے تصوف کی اصل حقیقت اور اس کے ضروری اور اہم مسائل پر مختصر گفتگو کرکے ان کے بارہ میں شیخ کے افکار و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، آخر میں کئی انڈکس بھی ہیں، یہ کتاب تلاش و تفحص سے لکھی گئی ہے، اس سے شیخ کے دقیق صوفیانہ اشعار کی توضیح کا حق ادا ہو گیا ہے، فارسی کی صوفیانہ شاعری کے مقابلہ میں عربی کی صوفیانہ شاعری کا درجہ بلند نہیں اور اس پر اردو میں ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے جو علمی و ادبی حلقوں کے خیر مقدم کے لائق ہے، ص ۳۳ پر مصنف ابن الفارض کے ایک ہم عصر شیخ مدین کا ذکر ہے، اگر ان پر مختصر نوٹ دے دیا جاتا تو اچھا ہوتا، کیونکہ عموماً شیخ مدین کو

حضرت شعیبؑ کی جانب ذہن منتقل ہوتا ہے۔

نوح ناروی :۔ مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۷۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۷ روپے ؛ (۱) مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر، نئی دہلی (۲) مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نزد جے جے اسپتال، پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

یہ کتاب لائق مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بمبئی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے اس کے چھ ابواب میں نوح ناروی کے حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان کے حالات کے ضمن میں خاندان، تعلیم، بیوی بچوں، داغ سے تلمذ اور دوسرے معاصرین سے ان کے تعلقات اور مذہبی عقائد کا ذکر ہے، دوسرے باب میں حیدر آباد کے سفر اور داغ کی خدمت میں حاضری کا بیان ہے، تیسرے میں ان کی مقبولیت کے اسباب اور چوتھے میں تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، پانچویں باب میں تلامذہ کا تذکرہ، نوح کی اصلاح دینے کے طریقے اور جدید ادبی رجحانات سے ان کی واقفیت کا ذکر ہے، چھٹے باب میں ان کی شاعری پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں کلام کی نمایاں خصوصیات کے علاوہ زبان و بیان کی صحت کے معاملہ میں ان کی غیر معمولی توجہ، محاورات کی پابندی اور متروکات سے اجتناب وغیرہ پر مفصل بحث ہے، آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں، جن میں ان کی دو نثری تحریریں درج ہیں، چھٹا باب زیادہ اہم ہے، اس سے مصنف کی تلاش و محنت اور ادبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک جگہ انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی اس رائے کو غیر منصفانہ قرار دیا ہے کہ "داغ کے رنگ میں تو ترقی کی گنجائش ہی نہ تھی، اس لئے ان کے تلامذہ نے صرف اس کو قائم رکھا" (ص ۱۶۲) حالانکہ انھوں نے خود جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی بڑی حد تک اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، دوداویں (دیباچہ ص ۲) صحت (۱۴۳) اصلاحوں (۱۵۶) نازک مزاجی (ص ۱۶۸) کو مذکر، عبد (ص ۱۰) کو مونث اور خطوات (ص ۲۶)

دمضامین (ص ۱۳۵) کو واحد استعمال کیا ہے، ذکور (نرینہ اولاد) کا املا ذکور (ص ۵) صغرسنی کا صغیرسنی (ص ۹، ۹، ۲۲) بدلہ سخ کا بزلہ سنج (ص ۶۵) لکھا گیا ہے۔ مصنف نے نوح کے وطن کو کہیں نارہ، کہیں ناروا لکھا ہے، عبارت کے الجھاؤ اور حشو و زوائد کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں "نوح کی والدہ کے علاوہ شیخ علم الہدیٰ کو کوئی دوسری اولاد نہ تھی، حالانکہ شیخ صاحب کے بھائی اور خاندان کے بیشتر افراد موجود تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی اہلیہ یعنی نوح کی نانی اپنی لڑکی کے پاس چلی آئیں" (ص ۹) " ان سے کسب فیض کا بڑا ناز تھا (ص ۲۷)

.... مطالعہ کا نہایت صاف ستھرا اور مفاد آمیز ذوق رکھتے تھے (ص ۲)

زبان کی شاعری کے ذریعہ سے مرزا داغ اردو کی جو بیش بہا خدمت انجام دے رہے تھے (ص ۱۸)

ان کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا (ص ۱۳۹) کوئی خاص طریقہ شاگرد کرنے کا نہیں تھا" (ص ۱۵)

کتابت کی غلطیاں بھی متعدد ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود کتاب دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور مصنف نے اس کی تیاری میں خاصی محنت کی ہے، نوح ایک اہم غزل گو تھے اور اساتذہ سخن میں ان کا شمار ہوتا تھا اور داغ کے جانشین سمجھے جاتے تھے مگر ابھی تک ان پر تحقیقی کام نہیں ہوا تھا، اس کتاب سے اس کا آغاز ہو گیا ہے۔

عورت تہذیب کے دوراہے پر :۔ از مولانا محمد ایوب اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۱۰، قیمت عہ، پتہ :۔ اسلامک پبلشرز، رام پور (یو، پی)

اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی عظمت اور اصلاح معاشرت اور افراد کی سیرتوں کی تعمیر و تشکیل میں اس کی اہمیت اور ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور پردہ کی ضرورت، بے پردگی کے نقصانات اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے حصہ لینے کے جائز و ناجائز حدود بھی بتائے گئے ہیں، نیز اس کی تردید کی گئی ہے کہ "اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہے" اس سلسلہ میں طالبِ علموں کے لئے مفید

اور ضروری باتیں بھی درج ہیں، مگر کتاب کا نام غیر سنجیدہ اور اس کے مندرجات کے لحاظ سے بے جوڑ ہے۔

اچھے لوگ:۔ مرتبہ جناب عرفان خلیلی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۲/۵۰ پیسے پتہ: اسلامک پبلشرز، رام پور، یو، پی۔

یہ دراصل احادیث کا انتخاب ہے، اس میں مختلف عنوانات جیسے اچھا مسلمان، اچھا نمازی، اچھا شوہر، اچھا معلم اور اچھا تاجر وغیرہ کے تحت منتخب حدیثیں جمع کی گئی ہیں اور ان کی روشنی میں ان لوگوں کے مثبت و منفی اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس طرح کے مجموعے پہلے بھی اردو میں چھپے ہیں، تاہم یہ فائدہ سے خالی نہیں، زبان و طرز بیان آسان ہے۔

یہ ہندوستان:۔ مترجم جناب رام سرن چوپڑہ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۴، مجلد، قیمت ۵/۷ ناشر پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

اس کتاب میں بچوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ملک کا ایک جز بن کر اس کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوں اور مشترکہ خاندان کے ہر فرد کی طرح سب مل جل کر ملک کی ترقی، بھلائی اور خوش حالی کے لئے کام کریں، اس سلسلہ میں آزادی سے پہلے اور بعد کی حالت کا نمایاں فرق اور پچیس سال کے اندر قومی حکومت کے پنجسالہ منصوبوں کی بدولت ہونے والی غیر معمولی ترقی کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، بچوں کی دلچسپی کے لئے سہل پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور ہر مضمون کے ساتھ اس کے مناسب تصویریں بھی دی گئی ہیں، مصنف نے ملک کے کلچر کے ضمن میں جن متبرک چیزوں کا ذکر کیا ہے، ان کا صرف ایک ہی مذہب سے تعلق ہے، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کے متبرک مقامات کا ذکر بھی کر دیتے تاکہ ہندوستان کی صحیح تصویر

نگاہ کے سامنے آجاتی، یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے اس لئے اس کے اسلوب کا اثر اردو ترجمہ میں بھی آگیا ہے، زبان و بیان کی خامیوں کے علاوہ کہیں کہیں جملے بھی غیر مربوط اور غلط ہیں، مثلاً چونکہ ہم نے پہلے کام پہلے کرنے ہیں اس لئے سوچو کہ جب تک ہر ہندوستانی پوری طرح پنپ نہیں پاتا اور انسان کی زندگی بسر نہیں کرتا ہمیں قدم بہ قدم ابھی کتنا لمبا راستہ طے کرنا ہے (ص ۸۶) اگر سرکار ہر ایک کو اس کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کرنا چاہے اور اس کے لئے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے وہ صرف وہی کچھ دے سکتی ہے، جو اس کے پاس ہے (ص ۸۷) یاد رکھو کہ امیروں نے کتنی بھی دولت کیوں نہ جمع کر رکھی ہو تمھیں اس دولت کو ستاون کروڑ انسانوں میں بانٹنا ہوگا، تب کہیں جاکر تمھیں معلوم ہو سکے گا کہ ہر ہندوستانی کو کیا کچھ ملے گا، نہیں اس طرح سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا (ص ۸۷) تمھیں اور مجھے اور ہم سب کو ہر چیز کی پیداوار بڑھانے میں ملک کی جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے مدد کرنا چاہئے (ص ۸۷) چونکہ ہم ایک غریب ملک ہے (ص ۱۱۳) گاؤں کے آس پاس کوئی اسکول نہ تھے (ص ۱۳۶) یہ ایسے منظر ہیں (ص ۱۳۸) گھروں میں نئے کرسی میز (ص ۱۳۸) ایک بات پتہ چل جائے گی (ص ۱۴۴) ہم ایک غریب ملک سہی، ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کے دل اچاٹ ہو جاتے ہیں، کیونکہ انھیں ہر طرح کی تفریح اور کھیل تماشے میسر ہیں (ص ۱۵۶) کھیت میں تو اتنا ہی پیدا ہوتا ہے، چاہے وہ اس پر کام کریں یا نہ کریں، (ص ۱۶۶) یہ لوگ اس لئے ہندوستان آئے ہیں کیونکہ وہ کسی نئی چیز کی تلاش میں ہیں (ص ۱۶۷) یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر دنیا کے سبھی ملک اپنے آپسی مسئلوں کو دوستانہ طریقے پر سلجھانے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹائیں (ص ۱۸۴) اظہار تشکر میں جگہ جگہ ممنون لکھا ہے اور ہر جگہ غلط ہے جیسے ہم ممنون ہیں یونائیٹڈ سروس انسٹی ٹیوشن آف انڈیا نئی دلی کی لائبریری کے جنھوں نے مدد و اعانت کی، اس قسم کی اور بھی غلطیاں ہیں پبلیکیشنز ڈویژن ایک سرکاری ادارہ ہے، اس کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب میں زبان و بیان کی غلطیوں کا ہونا بہت افسوسناک ہے، اس کے لئے ایک اچھے مترجم کی خدمات حاصل کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔

ش ۔

...SAIN LI...
...A NAGAR
...DELHI

جلد ۱۲۱ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۷ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

مسلمانوں کا عرصۂ دراز سے یہ معمول ہوگیا ہے کہ ارباب حکومت کے سامنے اپنی شکایات پیش کرتے ہیں، اس کے ساتھ اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ان کے حال پر توجہ کی جائے، ان کی درخواست کو شرف قبول حاصل ہو اور ان کے مسائل و مشکلات کے حل کی فکر کی جائے، کانگریس کے دور اقتدار میں پورے تیس برس ان کا یہی رویہ رہا اور اب بھی یہی طرز عمل ہے، اپنی عرضداشت کو موثر و پرزور بنانے کے لئے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتے ہیں اور اگر بن پڑتا ہے تو جلسوں اور جلوسوں سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اتنی مدت دراز کی جد و جہد سے کچھ حاصل نہ ہوا اور ان کی ہر درخواست صدا بصحرا ثابت ہوئی، اس مسلسل بے التفاتی نے انھیں مایوس کر دیا۔

جب نئے الیکشن کا اعلان ہوا تو گزشتہ حکومت کے طرز عمل سے بیزار ہو کر انھوں نے اس کے حریفوں کا ساتھ دیا، انتخابی ضرورت سے جنتا پارٹی کے لیڈروں نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ اگر وہ برسر اقتدار آگئے تو مسلمانوں کے مطالبات کو اولین درجہ دیں گے، اپنے منشور میں بھی کسی قدر اس کا ذکر کیا، ان وعدوں پر اعتبار کر کے مسلمانوں نے دل کھول کر جنتا پارٹی کا ساتھ دیا اور امید کرنے لگے کہ ان کے ہاتھوں ان کی دیرینہ مشکلات حل ہوں گی اور مدت کے الجھے ہوئے مسائل سلجھ جائیں گے، لیکن کامیابی کے بعد اس پارٹی کے تغافل اور سرد مہری کا بھی وہی حال ہے، اسے برسر اقتدار آئے ہوئے نو دس مہینے ہو چکے ہیں مگر مسلمانوں کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی اب تک شرمندۂ عمل نہیں ہوا، اس بے رخی سے ان کے اندر ناگواری بڑھتی جا رہی ہے، لیکن اب بھی عرض معروض اور التجا و احتجاج ہی کی راہ پر گامزن ہیں۔

چاہئے تھا کہ تیس سال کے اس ناکام اور تلخ تجربہ کے بعد ہماری آنکھیں کھل جاتیں اور ہم یہ سمجھ لیتے کہ محض گزارشوں اور عرضداشتوں کے سہارے کوئی قوم عزت و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی ہے، ترقی و سربلندی کیلئے

صلاحیتِ کار، قوتِ عمل اور جراتِ کردار کی ضرورت ہے، کمزور کی آواز میں اثر نہیں ہوتا، نہ اس کی درخواست لائقِ
التفات سمجھی جاتی ہے اسکے موقع پر تسلی دلا کے دل خوش کر دیا جاتا ہے، لیکن جب تک قوم کے اندر اپنے مطالبات کو
تسلیم کرانے کی طاقت نہ ہوگی کوئی انھیں تسلیم کریگا، نہ ان کو عمل میں لانے کی فکر کریگا، اسی ہندوستان میں سکھ بھی
ہیں، ان کی تعداد کس قدر کم ہے، لیکن اپنی صلاحیتِ کار، قوتِ عمل، اور عزم و ہمت کی بنا پر انھوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ
ریاست بنوا لی، پنجابی صوبہ وجود میں آگیا، اور گورمکھی زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی، مگر مسلمان بدستور نالہ و فریاد
میں مصروف ہیں، نہ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال ہو سکا، نہ اردو کو ثانوی زبان کا درجہ ملا، نہ دینی تعلیم کے مستقبل کے بارہ میں
اطمینان حاصل ہوا، نہ پرسنل لا کے تحفظ کا یقین ہو سکا، حالانکہ ان مطالبات کے ان لینے سے نہ ملک کا کوئی نقصان تھا،
نہ اس سے حکمراں طبقہ کے لئے کسی قسم کا خطرہ تھا، مگر ایسی بے ضرر باتیں بھی آج تک لائق التفات نہ سمجھی گئیں،

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ حقوق محض مانگنے سے نہیں ملتے ہیں بلکہ اس کیلئے طالبِ حقوق کے اندر لیاقت و حسنِ عمل، عزم و ہمت
اور ولولۂ کار، جراتِ کردار کی ضرورت ہوتی ہے، اسے حصولِ مقصد کے لئے غیر معمولی محنت و جانفشانی سے کام لینا پڑتا ہے، قدم قدم
پر ایثار کی حاجت ہوتی ہے، شخصی اغراض و مقاصد کو مفادِ ملی کی خاطر قربان کرنا پڑتا ہے، اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے سعیٔ پیہم اور
جہدِ مسلسل کو وظیفۂ حیات بنانا پڑتا ہے، ع :- سعیٔ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن،

یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح حقوق کے حصول کے لئے جد و جہد ضروری ہے اسی طرح ان کی بقا کیلئے بھی بڑی محنت و
عرق ریزی کی حاجت ہے، وعدے کیسے ہی پکے ہوں بہرحال وعدے ہوتے ہیں، والیانِ ریاست نے اپنے تحفظ کیلئے کیسی محکم
دستاویزیں مرتب کرائی تھیں، سردار پٹیل جیسا صاحبِ اثر مدبر ان کی پشت پر تھا، پارلیمنٹ نے اسکی تصدیق کی تھی، اور پوری
حکمراں پارٹی نے یقین دلایا تھا کہ ریاستوں کے جمہوریۂ ہند میں انضمام کے بعد بھی سابق رئیسوں کا اعزاز و اکرام باقی رہے گا،
ان کے مصارف کے لئے گراں قدر وظیفے مقرر کئے گئے تھے، اور اقرار کیا گیا تھا کہ یہ رقم ان کو برابر ملتی رہے گی لیکن پھر نتیجہ
دیکھا کیا ہوا، دستاویزوں کی قانونی مضبوطی، سردار پٹیل جیسے عظیم المرتبت وزیر کی یقین دہانی، پارلیمنٹ کی تصدیق،
اور عدالتِ عالیہ کے فیصلے کے باوجود والیانِ ملک کے وظیفے بند کر دئے گئے، اور ان کا اعزاز و اکرام یک قلم سلب

ختم ہوگیا، دستورِ مملکت میں درج شدہ دفعات پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے لیکن ایمرجنسی کے زمانہ میں دستور کی جو گت بنی وہ سب کو معلوم ہے، غالب گروہ نے جس دفعہ کو چاہا اپنی منشا کے مطابق بدل دیا، اس تجربہ کے بعد عدول اور یقین دہانیوں کی کیا حیثیت ہے قوم کی بقا اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے خود اس کے اندر استعداد قابلیت اور سکت ہونی چاہئے، یہ صحیح ہے کہ قوم کو مضبوط، فعال اور صاحبِ صلاحیت بنانے کے لئے بڑا وقت درکار ہے لیکن اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے، عرضِ معروض لاحاصل ہے،

گزشتہ سال مولانا آزاد کے افکار و خیالات کی ترویج، اُن کے ادب و انشا کے تعارف، اُن کے تحقیقی مضامین کی اشاعت اور اُن کے سیاسی و اصلاحی نظریات کے فروغ کے لئے لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا، نومبر [illegible]ء میں اس کا ایک شاندار اجلاس بھی ہوا تھا اس موقع پر متعدد اہل علم نے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کئے، اور قابلِ قدر تقریریں کیں، اکیڈمی کے کارکنوں نے ان مقالات کو مرتب کیا، پھر مولانا کے دوسرے رفیقوں اور نیازمندوں سے کچھ مزید مضامین لکھوائے [illegible] نومبر [illegible]ء کو مولانا ابوالحسن علی کے ہاتھوں اس کتاب کی رسم اجرا عمل میں آئی، اس موقع پر معززین شہر کے علاوہ یوپی کے گورنر، وزیر اور مرکزی حکومت کے وزیر ہیم وتی نندن بہوگنا نے اپنی تقریروں میں مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا، اور اُن کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کی، ملک زادہ منظور احمد کی درخواست پر مولانا ابوالحسن علی نے بھی ایک موثر، پرزور اور ولولہ انگیز تقریر کی جس میں مولانا کی وسعتِ نظر کمالِ خطابت رعنائی ادب اور افکارِ عالیہ کے ساتھ ان کی خودداری و خود نگری اور جرأتِ بیباکی کی جانب بھی حاضرین کو توجہ دلائی

اقبال صدی کے سلسلہ میں دہلی کے بین الاقوامی جلسہ کی سرگزشت ان اوراق میں شائع ہو چکی، ۲ دسمبر سے ۷ دسمبر تک پاکستان میں بھی پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے ایک انٹرنیشنل کانگریس لاہور میں منعقد ہوئی قارئین معارف کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ دارالمصنفین کے ناظم صباح الدین عبدالرحمن صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہوئے، اور نہ صرف اپنا مقالہ پڑھا بلکہ ایک نشست کی صدارت بھی کی جنوری تک واپسی کی توقع ہے

مقالات

اقبال کا فکری ارتقاء

از مولانا عبدالسلام خاں رامپوری، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور

__ظروف اور شخصی تاثر اور فعالی__ | فکر ہو یا وجدان انسانی شعور کی تشکیل میں ماضی کے تجربے، مستقبل کے تصورات اور تقاضے، پھر موجودہ ظروف و احوال، سب کی اہمیت ہے، تاہم یہی سب کچھ نہیں ہیں شخص کی اپنی نوعیت تاثر اور اس کی ذاتی تاثیر اور فعالی بھی اس تشکیل میں ضروری عامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ارسطو اور افلاطون نہیں ہوسکا، ارسطو اور افلاطون ہونے کے لئے ارسطو اور افلاطون ہی ضروری تھے۔

اقبال کی متکلمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایانِ مغرب اور حکیمانِ مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے، اس میں مغرب کے مادی ارتقا کو بھی دخل ہے اور مشرق کی روبہ زوال ثقافت کو بھی، ان کی فکر پر اسلامی دنیا کے ہمہ جہتی انحطاط اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی دونوں کا اثر ہے، امت مسلمہ کی ہمہ جہتی رفعت کی آرزو خود بھی اہم محرک ہے، لیکن صرف ان سے اقبال کی فکر کی توجیہ نہیں ہوجاتی، نہ جانے کتنے افراد ہوں گے جن کے سامنے یہ سب کچھ ہوگا، لیکن وہ اقبال نہیں ہوئے، کیونکہ ان کا انداز تاثر اقبال کا سا نہ تھا، ان کی شخصی فعالی اور ذہنی تاثیر اقبال جیسی نہ تھی۔

__اقبال کی فکر کے ظروف__ | اقبال کے گھر کے صوفیانہ اور مذہبی ماحول، ان کی تربیت و تعلیم، مکتبی اور مدرسی مضامین اور اساتذہ کی صحبتوں سب نے مل کر ان کی فکر کو ایک خاص رخ دیا، ہندوستان کی مذہبی

ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا، پنجاب کی صحت بخش آب و ہوا، تربیت جسمانی، ورزشی کھیلوں کا ذوق، ان کے مقابلوں کا شوق اور اقبال کی ان سے عملی دلچسپی، ان سب باتوں کا اُن کے خیالات و میلانات پر اثر پڑا ہے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کی ہندوستان پر کامل فتح اور مغربی افکار و تصورات کی طاقت نے قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور دینی روایات کو زیر و زبر کر دیا تھا، سر سید مرحوم کے اعتذاری کلام اور قدیم روایتوں پر ان کے مجتہدانہ نقد نے نظری حد تک اس تزلزل پر قابو پانے کی کوشش کی، مذہبی مسائل کی تحقیق میں ایک مدت سے جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹا اور بحث و نظر کے نئے راستے کھلے، شبلی اسکول نے ان آزاد بحثوں سے فائدہ اٹھایا، اعتذاری لے کو ہلکا کیا اور آزاد اجتہاد، بے روک ٹوک انداز تحقیق پر بندشیں عائد کیں، مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو علمی حقیقتیں بنا کر پیش کیا، قدیم مسلم کرداروں کو جیتے جاگتے ماحول میں اچھوتے اور خطیبانہ انداز سے نکال کر لائے اور ان میں نئی زندگی بھر دی، یہ فضا تھی جس کی ایک اہم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

<u>اقبال کی انیسویں صدی کی شاعری</u> اقبال کو شاعری سے شروع سے لگاؤ تھا، شہر کے چھوٹے موٹے مشاعروں میں وہ طرحی غزلیں پڑھنے لگے تھے، ۱۸۹۳ء کے غالباً ستمبر اکتوبر کے کسی مشاعرے کی غزل کے شعر ہیں:

کیا مزہ بلبل کو آیا شکوۂ بیداد کا ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ کر جو گھر صیاد کا
کس بت پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا حسرت دل پیسے ہے برقع دامن فریاد کا
جب دعا بہر اثر مانگی تو یہ پایا جواب غیر دو کر لے گئے حصہ تری فریاد کا
سن کے اس کو بے رخی سے بھاگ جاتا ہے وہ بُت کیا اثر معشوق پر ہو لے دل تری فریاد کا

شرم آئی جب مری رگ میں لہو کا ناچا		آب میں ہے غرق گویا نیشترِ فصاد کا

۱۸۹۴ء کے مشاعرے کی ایک طرحی غزل کے شعر ہیں:

موت بولی جو ہوا کوچہ قاتل میں گذر		سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

ان کو بے تاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا		ہم دعائیں تجھے اے آہ رسا دیتے ہیں

۱۸۹۴ء کے ہی کسی دوسرے طرحی مشاعرے کی غزل کے شعر ہیں:

آمدِ خط سے ہوا پوشیدہ کب چاہ ذقن		خضر نے اک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرے نقاب		تو نے گر اس کو اٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا[1]

اس زمانے کی غزلوں میں نہ کسی داخلی کیفیت کا بیان ہے، نہ ان میں کوئی خاص فکر ہے، بت پردہ نشیں یا صنم سبزۂ نادمیدہ اور نو دمیدہ کا وہی روایتی عشق ہے، اصلیت اور واقعیت سے خالی، تاہم کہیں کہیں ماحول میں رچے ہوئے تصوف کی چاشنی ضرور آگئی ہے۔ آہِ رسا کی تاثیر غیر کا گھر ہی نہیں پھونکتی، بلکہ "ان کو" بھی بے قرار کر جاتی ہے۔ اس کو اقبال کی اپنی انانیت کا اظہار بھی کہا جا سکتا ہے، جو ایک طرح سے ان کی مستقبل کی 'خودی' کا تخم اور جرثومہ ہے۔

۱۸۹۵ء تک کا جو کلام سامنے ہے وہ یہی عشقیہ شاعری ہے۔ فکر و شعور سے تہی دامن محض روایتی، قومی میلان، مذہبی وابستگی اور خوش عقیدتی سے بالعموم عاری، شاذ ہی ایسے شعر ہو گئے ہیں جن سے اقبال کے مذہبی لگاؤ یا ان کی کسی فطری خصوصیت کا اظہار ہو۔

اقبال کشمیری برادری کے فرد تھے۔ یہ برادری نسبتہً خستہ حال تھی، اقتصادی طور پر کمزور اور تعلیم میں پس ماندہ۔ کشمیری مسلمانان لاہور نے برادری کی اصلاح و ترقی کے لئے ایک جلسہ بلایا تھا چنانچہ نوجوان اقبال نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برادری کا انحطاط انہیں دردمند کر کے

---

[1] نوادرِ اقبال ص ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰۔

بے چین رکھنے لگا اور وہ برادری کی اصلاح و ترقی کی فکر میں مبتلا ہو گئے۔ فروری ۱۸۹۶ء کی سب سے پہلی مجلس میں "ترقی تعلیم" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ اس نظم کے کچھ اشعار یہ ہیں:[1]

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں ۔۔۔ بدن میں جان تھی کہ جیسے قفس میں صید زبوں

زبسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے ۔۔۔ یہ فکر مجھ کو لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں

جو سامنے تھی مری قوم کی بری حالت ۔۔۔ امنڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں

ہزار شکر کہ اب انجمن ہوئی قائم ۔۔۔ یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالعِ واژوں

مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے ۔۔۔ جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں

بڑھے یہ بزمِ ترقی کی دوڑ میں یا رب ۔۔۔ کبھی نہ ہو قدم تیز آشنائے سکوں

دعا یہ تجھ سے ہے یا رب کہ تا قیامت ہو ۔۔۔ ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں[1]

غالباً برادری سے محبت کا یہی تنگ اور محدود جذبہ تھا جس نے وسعت پاکر وطنیت و قومیت کی شکل اختیار کر لی۔

۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں "نالۂ یتیم" کے عنوان سے اور ۱۹۰۰ء میں اسی انجمن کے سالانہ جلسہ میں "فریادِ امت" "ابرِ گہر بار" کے عنوان سے پُر اثر نظمیں پڑھیں[2]۔ یہ دونوں نظمیں اقبال کی مذہبیت اور خوش اعتقادی کی بھرپور عکاس ہیں۔ "نالۂ یتیم" میں اقبال کی مستقل فکر "تغیر" کی بنیاد پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تغیر کا بادل کائنات پر برابر منڈلاتا نظر آتا ہے:

زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا ۔۔۔ لے کے طوفانِ ستم، ابرِ تغیر آ گیا

روایتی صوفیانہ تعبیرات بھی نمایاں ہیں، نبی علیہ السلام سے خطاب ہے:

---

[1] نوادرِ اقبال ص ۷۹، ۸۳ [2] ذکرِ اقبال ص ۱۸، باقیاتِ اقبال ص ۳۲، نوادر ص ۸۳ حاشیہ۔

تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے   تو ظہور لن ترانی گوئے اوجِ طور ہے

'ابرِ گہربار' میں صوفیانہ خیالات پوری وضاحت سے موجود ہیں، توحید وجودی کا مشہود تصور فکر پر چھایا ہوا ہے۔

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ   پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیونکر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا   حق دکھایا مجھے اس نقطہ نے باطل ہوکر
خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل   دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہوکر
طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا   وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہوکر
پیرہن عشق کا جب حسن ازل نے پہنا   بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا[1]

__۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک__ | انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی زمانہ تھا کہ ہندوستانی قومیت اختلاف و انتشار کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی، جمہوری خطوط حقوق طلبی، عوامی رخ سے حکومت کے نظم و نسق پر تنقید یا اس کی حکمت عملی پر نکتہ چینی سربرآوردہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف پڑتی تھی۔ یو۔پی اور بہار کے مسلمان خاص طور سے وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے، جن صوبوں میں مسلمان معمولی اقلیت میں یا کسی قدر اکثریت میں تھے، انھیں اکثریت سے کوئی خطرہ نہ تھا اور وہ جمہوری جد و جہد کے حامی تھے۔ اپنے سربرآوردہ طبقے کو متضاد دھڑوں میں بٹا ہوا دیکھ کر عام مسلمان کشمکش میں تھے۔ کہیں جذبات کی رو میں قومی جد و جہد کے خلاف صف آرا ہو جاتے، کبھی برادران وطن کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو جاتے، کوئی مستقل، مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی۔ جن نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو علی گڑھ کی قیادت پہ بھروسہ

---

[1] نوادرِ اقبال ۱۹۱۱ء، ۱۱۴، ۸۴، ۹۰، ۹۳ سے اقتباس ہے۔

: تھا، وہ اس افتراق و انتشار سے سخت متنفر تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان آپس کے اختلاف مٹا کر ایک جان اور دو قالب ہو جائیں، آپس میں مل جل کر قومی اور وطنی بنیادوں پر سیاسی جد و جہد کو استوار کریں اور فرقہ پرورانہ اختلافات کو قومیت متحدہ کے وسیع تر مفاد میں محو کر دیں، ایک دوسرے سے نفرت آپس کی محبت میں بدل جائے، ان کا خیال تھا کہ مذہب کو بٹوارے کے بجائے میل کرانے میں کام آنا چاہیے۔

اقبال اس زمانہ میں کوئی لیڈر اور قائد نہ تھے مگر ان کا ذاتی رجحان یہی تھا، ہو سکتا ہے کہ اس میں پنجاب کی سیاسی فضا کو بھی دخل ہو۔ ان کا صوفیانہ اندازِ فکر بھی شامل ہو، بہرحال انھوں نے ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے کامل شیفتگی اور ملی کرداروں سے فرطِ عقیدت کے باوجود قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں، ان میں ملکی روایتوں، قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار تھا، وطنیت اور قومیت کو فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی دعوت تھی۔ 'آفتاب' 'ایک آرزو' 'ترانہ ہندی' 'نیا شوالہ'، 'ہندوستانی بچوں کا گیت' اور 'تصویر درد' جیسی نظمیں قومیت و وطنیت کے جذبات میں ڈوبے ہوئے دل کی پکار ہیں۔ 'ایک یتیم کا خطاب' 'خط منظوم' 'عرض بہ جناب حضرت نظام الدین اولیا' 'ہلال عید' اور 'سپاس جناب امیر' وغیرہ نظموں میں مذہبی تلمیحات کے ساتھ ملی روایات سے عشق اور اسلامی کرداروں سے جذباتی شیفتگی پوری شدت سے نمایاں ہے۔

اقبال کا تصورِ مذہب اور وطنیت | اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کو ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ جانتے تھے، مذہب سے انسانی جذبات میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے، ان میں پاکیزگی آجاتی ہے اور سارے عالم سے یگانگی اور

ے یہ سب عنوان اور اشعار "بانگ درا" اور "نوادر اقبال" سے لیے گئے ہیں۔

دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کا ذاتی اور نجی رابطہ ہے۔ عام خلوص، ہمدردی اور ہمہ گیر محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ سنجی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ 'التجائے مسافر' میں التجا ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھکو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ 'سپاس امیر' میں 'انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا' کے 'علم' کی تفسیر محبت سے کرتے ہیں:

اے باب مدینۂ محبت اے نوح سفینۂ محبت
اے مذہب عشق را نمازے اے سینۂ تو امین رازے

"فریاد امت" میں اسلام کی حقیقت بیان کرتے ہیں:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔ ان میں باطنی تضاد اور تصادم نہیں:

اصل محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی
آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لئے

اس صوفیانہ مذہبی تصور کا تقاضا ہے صلح کل اور دعوت اتحاد و اتفاق، اختلاف سے نفرت:

توڑ جدائی پہ جان دیتا ہے وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے اس عبادت کو کیا سراہوں میں

میں کسی کو برا کہوں، توبہ! ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

"فریادِ امت" میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفے اور باطنی رشتے کا کوئی خاص عملی تقاضا نہیں، اس کے ساتھ کوئی بندھی ٹکی ثقافت نہیں، یہ معین صورتوں اور محدود رسموں کا پابند نہیں، اس کے نیچے تلے مطالبے نہیں، اس لئے اس کا نہ کسی قومیت سے تصادم نہ کسی نظام سے تعارض:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جانِ انسان کی کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے

رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

'ترانۂ ہندی' میں اقبال اعلان کر دیتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

'نیا شوالہ' میں اختلاف کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زُنّار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو

یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو

آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں

اگنی ہے ایک نرگن، کہتے ہیں پیت جس کو

دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاقِ طبیعت کا

آئینہ دار ہے جو مذہب کے عملی تقاضوں اور اس کے شعائر و رسوم کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، اور ایک ہی مسالہ سمجھ کر اس کی روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے، مزید براں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دلآویز روحانی تصور پیدا ہوتا ہے، سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، جب ہر شے میں ایک ازلی و ابدی حسن کی جھلک ہے، بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی مہک ہے، غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسانی سخن ہے، جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوشنوا کا نغمہ ساز، انھیں کے اجتماع سے حسن وجمال کی صورت گری ہے[1]، تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہیں، اذان، ناقوس کی صدا کیسے نہیں۔ حقیقت کے اس شاعرانہ تخیل اور وجود کے اس جمالیاتی تصور میں تہذیبوں کے درمیان آویزش اور نصب العین کے مابین تصادم کی کہاں گنجائش ہے اور مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کا کیا میدان ہے، ایک حقیقت ہے اور سب الگ الگ رنگوں سے اسی کے پجاری۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اقبال اور جستجو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور بھی اقبال کو مطمئن نہ کر سکا، مابعد الطبیعیاتی حقائق کی مذہبی توجیہیں اس کے دل و دماغ کو تسکین نہ دے سکیں، آغوش مذہب میں پرورش

---

[1] حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ نظم "پرندے اور جگنو کا مکالمہ" ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک تجھ سے پائی آواز تجھ کو دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

پلا بڑھا، بزرگوں کی خوش اعتقادیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، وجدان کی وسعتوں سے آشنا، فکر کی حدود سے واقف اور مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا جستجو بن جاتی ہے، وہ سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ آیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت عناصر کی ترکیب و انتشار کا بے مقصد کھیل ہے؟ کبھی گل رنگیں سے سوال کرتا ہے کہ ؎

راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

کبھی ہمالہ سے پوچھنے لگتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے   دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے

اگر واقعی یہ عالم رنگ و بو کوئی بامقصد اور سوچی سمجھی آفرینش ہے تو پھر چیزوں میں ناہمآہنگی اور تضاد کیوں ہے، اس رزم گاہ خیر و شر اور کارزار اضداد کی کیا توجیہ ہے، اس عالم سے دوسرے بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا ہے، کیسا ہے، کیا وہ بھی ناہم آہنگی کا شکار اور تناقضات کی آماجگاہ ہے؟ "خفتگان خاک" سے استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم   کچھ کہو اس دیس کی آخر، جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی   اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا   اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا   اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا
رشتہ و پیوندیاں کے جان کا آزار ہیں   اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے   روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے   قافلے والے بھی ہیں، اندیشۂ رہزن بھی ہے

"آفتابِ صبح" میں نظمِ قدرت سے واقف ہو جانے کی تمنا کرتا ہے، تاکہ یہ تضاد اور ناآہنگی کی گرہیں کھل جائیں:

دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

کائنات کی سب سے دلچسپ اور دلآویز مخلوق، انسان کی ابتدا کیا ہے اور اس کی منزلِ مقصود کہاں ہے؟:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے قدرت کا شہکار ہے، کیا اس کی قسمت واقعی نیستی ہے؟:

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے ۔ موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

اگر موت عدمِ محض نہیں ہے، فقط انتقالِ مکانی ہے تو یہ انتقال تدریج کے بجائے دفعۃً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے
موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و جہنم کے حوالے کا کیا مطلب ہے، ان کی کیا حقیقت ہے اور ان کا مقصد کیا ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے

اگر یہاں ہمارے علم کی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد

اس بے کم وکیف عالم میں اس کی بے تابی اور محدودیت ختم ہو جائے گی؟ ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری ابدی قسمت ہے:

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے
دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی،
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا

اقبال کے یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی اور صرف وقتی احساسات نہیں جنھیں نظرانداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے منطقی فکر ہے۔ دل کی مستقل کرید ہے اور دماغ کی مسلسل الجھن ہے یہ تصوف اور فلسفے کی آویزش، عقیدے اور استدلال کی کشمکش، اور مادیت و روحانیت کا تصادم ہے، ان کے پورے کلام پر نظر ڈال جاؤ۔ ان کے عمر بھر کے فلسفہ کا جائزہ لے لو، وہ ان ہی سوالوں کے گرد گھومتے نظر آئیں گے، ان کی پختہ فکر اور فلسفیانہ شعور، مذہبی عقائد اور صوفیانہ وجدان کے سہارے چلے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب دیتے نظر آئیں گے۔ ایک خاص میدان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لئے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی میں ہی تشکیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، وسائل علم اور ذرائع معرفت کی تنقیح اور انتخاب کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

حقیقت تک رسائی کا ذریعہ | اقبال کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے کائنات کی حقیقت کی پردہ کشائی ابتداء ہی میں شروع کر دی تھی، کائنات کی آخری حقیقت کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی اصل علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب وعلل کی حیثیت تو اتنی ہے کہ نام نہاد

علت اپنے نام نہاد معلول کے ساتھ ہوتی ہے، یہ معیت اور رفاقت دائمی بھی لیکن کیوں ہے؟ عقل کے پاس ان کا جواب کہاں۔

عقل کا مال مسالہ محسوسات و مشاہدات ہیں، اس کا دائرۂ کار انھیں تک محدود ہے، ان محسوسات کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو وہ کیا ہے؟ اس کے لوازم و اوصاف کیا ہیں؟ وہ عقل کی گرفت میں کیسے آسکتے ہیں؟ عقل زمان و مکان کی حدود میں رہ کر ہی سوچ سمجھ سکتی ہے؛ جبکہ اصل حقائق زمان و مکان سے بلند ہیں۔ اس لئے عرفان حقیقت کا جہاں تک تعلق ہے، عقل ناکارہ ہے، ہر اثر کے لئے اثر آفریں کی ضرورت ہے، ہر موجود کے لئے سبب اور علت ناگزیر ہے؛ حسی موجودات اور خارجی مظاہر سے اخذ کیا ہوا یہ محدود کلیہ اگر صحیح اور عام بھی ہو تو اس کی روشنی میں عقل زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہونچا سکتی ہے، حقیقت کا شعور نہیں کرا سکتی۔

حقیقت کے شعور کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خود اس کو براہ راست محسوس کیا جائے، خود حقیقت محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات کے متعلق کیا ہے۔ کیوں ہے جیسے سوالات کا جواب واضح ہو سکیگا، لیکن کیا حقیقت یا حقائق کو براہ راست محسوس کرنا ممکن ہے؟ صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کا جواب ہے کہ ممکن ہے۔ بلکہ واقع ہے۔

اقبال اسی زمانہ میں یہ سمجھ چکے تھے کہ حقیقت کو براہ راست شعور کے لئے عقل کی نہیں، دل کی ضرورت ہے، فکر نہیں وجدان درکار ہے، چنانچہ عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق؛ عقل کے حدود و قیود اور دل کی آزادی و نامشروطیت کو بیان کرتے ہیں:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے	اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے	اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے	تو خدا جو، خدا نما ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی　　حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا　　طائر سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　عرش رب جلیل کا ہوں میں

عقل کی "مظاہر وابستگی" اور "زمان و مکان سے رشتہ بپائی" کا شعور اور دل کی "باطن بینی" اور سدرہ آشنائی کا انکشاف غالباً تمہید ہے "تکمیل ذوق استفہام" اقبال کے زخموں کے اندمال اور "دیدہ وری" کی منزل کی طرف گرم سیر ہونے کی۔ اب وہ "خداجوئی" کو پیچھے چھوڑ کر "خدانمائی" کے لئے "بزم حسن" کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

اقبال اور وحدت وجود | اقبال نے اسی دور میں جہاں دل کی باطن بینی اور سدرہ آشنائی پر زور دیا وہاں انفس اور آفاق کی اندرونی وحدت کی بھی حمایت کی اور متاخرین شعرائے ایران کے نہایت مرغوب تخیلی "وحدت وجود" کو اس باطن بینی اور براہ راست معرفت کی بنیاد بنایا۔

۱۹۰۵ء تک کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اقبال کے سامنے 'وحدت وجود' کا کوئی مستند نظریہ نہ تھا، ان کا 'وحدت وجود' غالباً ان منتشر معلومات پر مبنی تھا جو مختلف ماخذوں سے حاصل ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ اردو، فارسی اور ہندی شعراء کے متفرق صوفیانہ کلام نے ان کی رہنمائی کی ہو۔ بہرحال ان کے اس عہد کے تصور میں نہ فلسفیانہ گہرائی ہے اور نہ براہ راست صوفیانہ احساس تاہم انھوں نے اپنی 'امتیاز دیر و حرم' میں پھنسی ہوئی فکر کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے 'سیمابی اضطراب' کے قرار کی ایک راہ نکالی ہے۔[۱]

---

[۱] یوں تو حسی کثرت کی وحدت سے توجیہ مشرقی مفکرین سے خاص نہیں، نو فلاطونی فلسفی تو قائل تھے ہی، فلاسفۂ مغرب میں، قدیم یونانیوں میں سے بھی وحدت وجود کے حامی رہے ہیں اور یورپ کے جدید حکماء میں متعدد اہل فکر کا یہ میلان رہا ہے۔ میں یہاں شنکر اچاریہ اور ابن عربی کے نظریوں کی تلخیص پر اکتفا کرنا چاہوں 'آئینہ

اس زمانہ کی مشہور نظم "شمع" ہے، اس سے اور بعض دوسرے اسی زمانہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل حقیقت اور واقعیت صرف ایک ہے، جس میں خالق اور مخلوق یا علت اور معلول کا کوئی فرق نہیں، یہ جیسی تھی ویسی ہے، ایک تھی اور ایک ہے، یہ ظاہری کثرت جس کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۸) چل کر اقبال نے بھی انھیں کی طرف اشارے کئے ہیں، مشرق کے یہی مشہور نظریے ہیں جو خواص پر ہی نہیں، عوام پر بھی اثر انداز ہیں اور اقبال کے تصور میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی دونوں کا اثر ہے۔

شنکر اچاریہ کے نزدیک واقعی حقیقت صرف برہما ہے، اپنی ذات میں برہما ازلاً ابداً یکساں ہے، ہر قسم کی دوئی سے منزہ، صورتوں اور شکلوں سے ماورا، ہر قسم کے تعلق اور آمیزش سے بری، صرافت محض، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے برتر اور شعور خالص، سکون بحت۔ کائنات اپنی تمام جزئیات اور کل تفاصیل کے ساتھ برہما کی مظہری صورت ہے، اس ظہور کی علت اور اس کا محل اور ہیولیٰ خود برہما ہے، برہما سے الگ کسی کی ہستی نہیں، عالم یا یہ مظہری کثرت عملی اور کاروباری واقعیت ہے، ذہنی تخیلات اور خواب کے محسوسات سے بالکل مختلف اور جدا

برہما کی مظہری ہستی یا کثرت میں اور انسانی "انا" کی مظہری ہستی میں تلازم ہے، جب تک مظہری "انا" اپنی مظہری شخصیت قائم رکھے ہوئے ہے، اس کثرت کا واقعی فرد ہے اور اس کے لئے کثرت واقعی حقیقت ہے۔ اس کے سماجی تعلقات، مذہبی فرائض، اس کے اعمال اور ان کے اثرات کی واقعیت اس کی مظہری ہستی سے مشروط ہے۔

یہ کثرت حقیقی واقعیت نہیں، یہ محض بے علمی اور صرف جہالت ہے، جوں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہوا "تو وہی ہے" اور "انا خود برہما ہے" کہ کثرت غائب ہوئی، اب نہ اعمال نہ ان کے اثرات، نہ سماج نہ اس کے تعلقات، برہما ہی برہما ہے، ایک اور یکساں۔ جب تک جہالت ہے، حقیقت کا عرفان نہیں

کائنات یا عالم کہا جاتا ہے، ہمارے اپنے شعور اور اپنی آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ 'من' ہے نہ 'تو' نہ کوئی بلند، نہ پست، گل کی مہک اور مے کی مستی ہماری آگہی کے بنائے ہوئے ہیں، یہ آگہی کیا ہے؟ جہالت ہے!!

(بقیہ حاشیہ ۴۱۹) میں 'میں ہوں اور 'تو' تو'، حقیقت کا عرفان ہوا کہ نہ 'میں' میں اور نہ 'تو' تو۔ برہما ہی برہما، ایک بے صورت، بے قید، حقیقت صرف، سکون محض اور شعور مجرد، بے تعلق اور بے عمل، بے اثر اور بے تاثر یہ جہالت یا عدم عرفان شخصی ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی اور کائناتی بھی ہے، چونکہ یہ ساری مظہری کائنات حقیقت میں برہما ہی برہما ہے اس لئے اس جہالت اور عدم عرفان کی حقیقت بھی برہما کے علاوہ کچھ نہیں، مظہری کائنات کی طرح اس عالمی جہالت کی واقعیت بھی عملی اور کاروباری ہے جو عرفان کے ہوتے ہی فنا ہو جاتی ہے، اس لئے بے بود اور لاشے ہے، ہستی اور بودگی تو اسی کی ہے جو لازوال ہے' گویا یہ کائنات یا یہ ظاہری کثرت بے بود جہالت اور با بود برہما کا نام ہے۔

اقبال کے نزدیک اصل حقیقت اور واقعی ہستی صرف ایک ہے، اس کے سوا نہ کوئی حقیقت' نہ کوئی وجود، یہ حقیقت مجہول الکنہ، مبہم اور اطلاق ہی اطلاق ہے، ہر قسم کے قیود اور تعینات سے بالاتر' افعال وصفات سے برتر، ازلیت وابدیت سے بھی ماورا، اس کے لئے ہونا بھی ثابت نہیں، ناقابل تعبیر' بے عنوان، بے اسم، مکمل غیب، بے ظہور اور بے فعلیت۔

اپنے اترتے درجوں یا تنزلات سے گذر کر کائنات کی ہستی یا عالم کے ظہور کا سبب ہے، یہی تنزلات اس کے تعین اور اس کے تشخص ہیں، اس کا پہلا درجہ یا پہلا تعین اور تنزل ہستی اور وجود ہے، تمام دوسرے تعینات سے معرا اور بلند، یہ ذات کے لئے ہے اور صرف ذات کا ہے، ہمارے علم وادراک سے ورے۔ ذات کا یہ تنزل اور تعین یا اس کی یہ وجودی نوعیت اس کے علمی تعین کی نشا ہے، یعنی ہستی سے متشخص ہوکر یہی حقیقت جو اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور سارے امکانات پر مشتمل ہے معلوم اور

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے — گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علم ذات کا معروض ہے، ذات کا یہ علم اصلاً تو ذات کا علم ہے لیکن یہی علم ذات کی متعین اور مشخص حیثیت کا علم ہے جو اس کے کل متمیز و مشخص امکانات اور صلاحیتوں کے علم کو شامل ہے، یہ عملاً مشخص حقیقت ہی علت ہے اپنے تمام اثرات اور ظہورات کی۔

ذات کی یہ باطنی صلاحیتیں جن میں ظواہر عالم یا کائنات کی کل حقیقتیں شامل ہیں، یہ کیفی طور پر متعین اور مشخص امکانات جو ذات کے اپنے علم میں ازلاً و ابداً ثابت ہیں 'اعیان ثابتہ' کہلاتے ہیں، اپنے ان امکانات کے علم کے ساتھ ہی ذات حقہ ان کے حسی ظہور کی علت ہے، اسی حسی ظہور کا نام کائنات ہے، یہ ظہور ذات حقہ کا مظہری تنزل اور کائناتی تشخص ہے۔

یہ ظہور جس طرح ذات حقہ کا تقاضا ہے، ویسا ہی ان امکانات یا اعیان ثابتہ کا تقاضا ہے، ذات کے تقاضائے ظہور کا منشا محبت اور عشق ہے۔ اپنے اس عشق ظہور کا پہلا مطلوب ظرف ظہور کا حصول ہے، ظہور کا یہ ظرف جس میں مظاہر کائنات اپنی درجاتی یا مکانی ترتیب سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں، ظہور اشیا سے پہلے محض وہمی اور خیالی خلا ہے، جو 'عماء' کہلاتا ہے۔ اشیاء کے امکانات جن کو علم حق کے لحاظ سے اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے، علم حق سے صرف نظر کر کے غیر مشخص استعداد اور نامتمیز صلاحیت ہے، اور یہی کائنات کا ہیولیٰ اور مادہ ہے۔ ابن عربی اس کو 'ہبا' کہتے ہیں۔ 'ہبا' ذات حقہ کی استعداد ہے اور ذات کی ہی اس کی ہستی ہے۔ اس کے ظہور کے معنی ذات کی استعدادوں کا فعلی ظہور ہے، جو اصل میں ذات کا فعلی یا کائناتی ظہور ہے۔

ذات کے کائناتی ظہور کے معنی اس کا ایک خاص انداز پر نمودار ہونا ہے۔ مثلاً زید کی کسی استعداد

ہمارا یہ شعور اور ہماری یہ آگہی فنا ہو جائے تو یہ سارے تشخصات ختم ہو جائیں اور صرف ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جہاں نہ من ہے، نہ تو، جب شرر ہی نہیں تو آتشکدے کہاں، اور فنا و بقا کا یہ چکر کہاں؛

آنہ او دست برد، بقا و فنا ہوں میں　　کشتہ ہوں یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

کیونکہ اصل حقیقت ازلاً اور ابداً یکساں ہے، بے تغیر و بے تشخص۔

یہ مخفی حسن حقیقی اپنے ظہور اور بے پردگی کا مشتاق ہوا، خواہش اظہار نے شوق اظہار کو مہمیز کیا، یہی ذات کا تقاضائے نمود اور حقیقت کا شوق تعرف ظہور کائنات اور نمودِ کثرت کی علت ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق　　آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

تعینات اور تشخصات نمایاں ہونے لگے، وحدت کثرت کا روپ اختیار کرنے لگی اور پردگی حسن بے پردہ ہونے لگی، چشم شعور عطا ہوئی، اب ــــ

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ　　ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ور سکت، جیسے اس کی قیام کی سکت یا چلنے پھرنے کی سکت کے حساً ظاہر ہو جانے اور خارجی واقعیت اختیار ر لینے کے معنی اتنے ہی تو ہیں کہ زید اپنی ایک خاص وضع میں موجود ہے جس کی اس وضع میں موجودگی کو اسکا ھڑا ہونا اور چلنا پھرنا کہتے ہیں، زید کی ہستی سے الگ نہ کھڑے ہونے کی کوئی ہستی ہے، نہ چلنے پھرنے کی، چنانچہ ئنات بھی اسی طرح ذات حقہ کا ایک خاص انداز اور اسکی ایک مشخص شان ہے، اپنی نوعی حیثیت میں قدیم ہے، یونکہ ذات حق ازلاً اور ابداً موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لئے کوئی نہ کوئی مشخص انداز وجود ضروری ہے س کی ہستی کا یہی مشخص انداز کائنات ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اگرچہ کائنات کی اپنی الگ اور مستقل حقیقت نہیں اور نہ اس کی الگ اور مستقل ہستی ور بود ہے تاہم وہ حقیقی اور مکمل واقعیت ہے، نہ کوئی دھوکا نہ فریب اور جہالت، ذات باری سے بھی ممتاز ور الگ، اور وہ جن افراد اور جزئیات پر شامل ہے وہ بھی باہم ممتاز اور الگ الگ۔

اس آنکھ نے گلشن کن کی بہار ہی نہیں دیکھی، اس کو بہاروں سے کہیں زیادہ خواب پریشاں دیکھنے پڑے۔ حسن اپنے اطلاق وابہام کے پردوں میں وجود سے برتر ہے، شعور وآگہی سے بہت دور۔ وجود مشخص ہوا اور تعینات و امتیازات پیدا ہوئے، تعلقات کی نمود ہوئی، ہستی کی قیدیں پاؤں میں پڑیں، شعور وآگہی کی آنکھیں کھلیں، اب من وتو ہے اور ایں وآں کا قفس، یہی چمن ہے اور یہی وطن، اب کون سمجھائے کہ غربت کدے کے قفس میں قید ہیں اور یہ شبِ وصل نہیں، شامِ فراق ہے، یہ وجود پردہ ہے، بے حجابی نہیں:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی — شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

ہستی کا جستجو ہونا، رازِ حقیقت کو بے نقاب کرنے کی خواہش اور پھر سنجیدہ طلب حقیقت سے غیر شعوری تعلق کے غماز نہیں؟ اپنا اصلی وطن اور حقیقی مقام پھر اپنی واقعی حیثیت کا مبہم خیال دل کو کیوں گدگداتا ہے؟

یاد وطن فسردگی بے سبب بنی — شوق نظر کبھی، کبھی ذوق طلب بنی

"من" و "تو" کا یہ فرق، گل وبلبل کا یہ امتیاز، شمع وپروانہ کا یہ اختلاف، بلکہ گلشن کن کی یہ ساری بہار کیا سچ مچ واقعی ہے؟ حسن وعشق حقیقۃً الگ الگ ہیں، اور عالم کی یہ ہستی کثرت، حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو ذوقِ شعور نے اپنے اظہار کے لئے گڑھ لیا ہے:

چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے — عالم ظہور جلوۂ ذوقِ شعور ہے

ورنہ یہاں تو صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماوراء فقط وجود ہی وجود ہے، دوئی تو جہالت کا افتراض ہے، حسن ہی حسن ہے، عشق تو بس تہمت ہی

تہمت ہے :

محمود اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے　　　کیا غفلت آفریں یہ مے خانہ ساز ہے

شعور غفلت آفریں اور چشم غلط نگر کا یہ کونیاتی سلسلہ زماں بر دوش اور مکاں در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا ہے اور بے قید آزاد واقعیت صید و صیاد، حلقۂ دام، طائر حرم، اور بام حرم کے جدا جدا حصنوں میں محصور ہو گئی، ورنہ واقع میں نہ کوئی یہاں ہے نہ وہاں، نہ ابھی نہ جب اور نہ یہ ہے نہ وہ، ایک حقیقت ہے، چاہو اسے ناز کہو چاہے نیاز، صیاد کہو یا طائر حرم، حلقۂ دام کہو یا بام حرم :

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　　طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں　　　اے شمع! میں اسیر فریبِ نگاہ ہوں

صیاد آپ، حلقۂ دام ستم بھی آپ　　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں! آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں　　　پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اقبال کی اس شاعرانہ توحید وجودی کا حاصل یہ ہے کہ واقع میں حقیقت ایک ہے، بے قید اور بے تشخص، یہ حقیقت شوقِ تعریف کی خاطر نمود کی خواہاں ہوئی، یہ کثرت یا کائنات حقیقت کی اسی خواہش نمود کا جواب ہے اور اسی کی اپنی مظہری کثرت ہے، وحدت کی کثرت میں جلوہ گری بیرونی اور ظاہری ہے اور حسی وجود یا خارجی ہستی کا تقاضا ہے، یہ فکر و شعور یا چشم تماشا خود بھی مظہری ہیں، ان کا ادراک مظاہر تک محدود ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ کثرت سے آگے نہیں جا سکتے، اس مظہری ہستی کو مٹا دیا جائے تو یہ مظہری فکر و آگہی خود بخود ختم ہو جاتے ہیں اور "میں تو ہوں اور تو میں ہے" اور "ہم سب وہی وہ ہیں" والا حسین منصور کا افسانہ تازہ ہو جاتا ہے، ہم نے جس کا

نام علم و آگہی رکھ لیا ہے، یہ دراصل حقیقت سے بے خبری اور جہالت ہے، میں تو ـــ

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ

میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

وحدت وجود اور زندگی سے فرار | اقبال پر ان کے اس خیالی وحدتِ وجود کا کوئی خاص اثر نہ تھا، نہ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے، نہ معاشرتی تعلقات سے گریز کرنا، ان کے کلام سے کسی ہمہ گیر انفعالیت کا احساس نہیں ہوتا، بے شبہہ 'ایک آرزو' میں زندگی سے فرار، عزلت گزینی کی خواہش اور مظاہر قدرت سے انفعالی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے:

شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا

ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گذاروں

دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں

چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا

ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو

مگر یہ صرف جھنجلاہٹ ہے، مایوسی کا وقتی ردعمل ہے' ناکامی کا غصہ اور اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے، سنجیدہ طلب اور سچی تڑپ نہیں ہے، اسی نظم کے دوسرے بند کے شعر ہیں:

شمشاد گل کا بیری ، گل یاسمن کا دشمن

جو آشیاں کے قابل ، یہ وہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر

میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے

وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت

ساقی نہیں وہ باقی ، وہ انجمن نہیں ہے

اہل وطن کا یہی اختلاف اور آپس کا کینہ و عناد تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں ، شاعر اقبال کا دل بجھ گیا ، وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا کر چیخ اٹھا کہ ــــــ

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب ، کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دلچسپی نہیں رہی :

پچھلے پہر کی کوئل ، وہ صبح کی مؤذن　　میں اس کا ہمنوا ہوں ، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں　　روزن ہی جھونپڑے کا مجھکو سحر نما ہو

لیکن ان کے دردمند دل کی سچی تمنا یہی ہے کہ ــــــ

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے

بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کی طبیعت کا رجحان | اس شروع دور میں اقبال کے خاص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری ، عالی حوصلگی اور احساس ذات کی مثالیں ان کے کلام سے انتخاب کر لینی مشکل نہیں ، ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے فیض پاکر ان کے مستقبل کے فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا

ہم صفیرو! تم مری عالی نگاہی دیکھنا　　شاخ گل طور تازگی آشیانے کے لئے

ایک دانے پہ ہے نظر تیری اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن

دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

شاعرانہ واردات کی صورت میں سہی، لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر فکری شکل میں ان کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

کلام اقبال میں انسان کی اہمیت | اقبال نے گوناگوں طریقوں اور طرح طرح کے اسلوبوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار ہے اور وہی کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے

پریشاں ہوں میں مشت خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا

سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں، یا گرد کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا

سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں

کائنات کی آرایش و پیرایش اس کے دم سے ہے، کائنات کی ساخت میں جو خرابیاں مضمر ہیں اور جو ناآہنگیاں اور فساد اس میں چھپے ہوئے ہیں، ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اس کا منصبی فرض ہے۔ 'انسان اور بزم قدرت' میں قدرت کی زبان سے اس کے منصب اور اس کی ذمہ داریوں کا دوسرے مظاہر سے مقابلہ کیا گیا ہے:

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود باغباں! ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تحریر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

انسان کی اس عظمت کا راز اس کا شعور اور اس کی آگہی ہے۔ 'چاند' سے خطاب کرتے ہوئے

کہتے ہیں:

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو

سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے، مجھے معلوم ہے

یہ چمک وہ ہے، جبیں جس سے تری محروم ہے

شعور ہی نہیں بلکہ شعورِ ذات، احساسِ نفس اور اپنی اہمیت کا پورا پورا عرفان انسانی فضیلت کے خاص اسباب ہیں، "آفتاب صبح" سے خطاب ہے:

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ہم شریک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

آرزو | حیات انسانی کی کائناتی اہمیت، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں مضمر ہے، خوب سے خوب تر تک اس کی آرزو ہی پہونچاتی ہے، فساد میں صلاح کے خواب دکھاتی ہے، ناآہنگیوں میں آہنگ کی نقاب کشائی کرتی ہے اور مظاہر سے اسباب و علل کی دریافت پر اکساتی ہے:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغِ آرزو رہنا

علاج زخم ہے آزاد احسانِ رفو رہنا

"گل رنگیں" سے مخاطب ہیں:

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو

اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

عمل | آرزوؤں اور تمناؤں میں کھیلتے رہنا اور ان سے دل بہلانا انسانیت کا جوہر نہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے پرورش کرنے کا مقصد ان کو عملی حقیقت بنانا ہے۔ آدم کے فرزند کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسباب و علل کو سمجھے اور خوب سے خوب تر پیدا کرے، فساد کے

سرچشموں کا پتہ چلائے اور اصلاح کے دیرپا مسالے سے انھیں بند کرے، اس کے لئے محض زیب محفل ہونا کافی نہیں، شریک شورش ہونا ضروری ہے، دور سے ہنگامۂ عالم کا تماشا دیکھنا فضول ہے اس میں حصہ لینے کی اہمیت ہے؛

تو اگر زحمت کش ہنگامۂ عالم نہیں ۔۔۔ یہ فضیلت کا نشاں اے نیر اعظم نہیں

سر سید کی لوح تربت پر اقبال جو وصیت پڑھتے ہیں، وہ یہ ہے؛

"ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں"

تصویر درد' میں اہل وطن کو یہ درس دیتے ہیں؛

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو

تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے

جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے

عمل کے لئے بے خوفی، دلیری اور خلوص ضروری ہیں، وہ اس کو مومن کی شان سمجھتے ہیں؛

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے

قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

انسان کی شخصی بقا: انسان سلسلۂ ارتقار کا آخری حلقہ ہے، اس کی حیاتیاتی قدر و قیمت اسی تک محدود نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور اس کی ارتقار کے لئے اس کے وجود کی اہمیت ہے۔ اقبال کے لئے انسان کی یہ حیثیت ابتدا ہی سے دلچسپی کا موضوع رہی ہے، انسان کی شخصی حیات کا اتنا مختصر وقفہ اور اس تھوڑے سے وقفے کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا کے بے پایاں سمندر میں ڈوب جانا ان کی فلسفیانہ طبیعت کیلئے کبھی طمانیت بخش ثابت نہیں ہوا، ان کا تخیل فنا کو زندگی کی غایت اور منتہیٰ ماننے کو کبھی آمادہ نہ تھا، ان کے

نزدیک زندگی ہے ہی وہی جو فنا سے دوچار نہیں ہوتی، وہ جینا جینا نہیں جس کے ساتھ فنا کا کھٹکا لگا ہو۔ "صبح کے ستارے" کی زبان سے کہتے ہیں:

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

لیکن زندگی کے مختصر سے وقفے کے بعد فنا روزمرہ کا ایسا مشاہدہ ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "کنار راوی" پر کشتی کو دور افق میں غائب ہوتے دیکھ کر اقبال کا شاعرانہ تخیل فنائے حیات کی بقا سے توجیہ کر لیتا ہے:

جہاز زندگیٔ آدمی رواں ہے یوں ہی ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی، نہاں ہے یوں ہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

چنانچہ موت، زندگی کی فنا نہیں بلکہ خود ایک خاص طرح کی زندگی ہے جس کو عام نظریں محسوس نہیں کر پاتیں:

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شراب زندگی مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن تنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۸ء تک کا فکری تجزیہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کی مختصر مدت کے کلام کے سابقہ تجزیے سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ اس زمانے میں اقبال کے سامنے قریب قریب وہ سب سوال آ چکے تھے جو آخر تک ان کی فکر کا محور رہے۔ ان سوالوں کے حل کا جہاں تک تعلق ہے ان کے کلام میں اس کی کوششیں صاف نمایاں ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان میں فکر کی پختگی سے کہیں زیادہ شاعرانہ تخیل ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اسی زمانہ میں ان کی فکر کا رخ پوری طرح نہ سہی مگر بڑی حد تک مشخص اور متعین ہو چکا تھا۔ ملیت، خودی اور بے خودی جیسے افکار بعد کے نتائج ہیں، اگرچہ خودی اور بے خودی کے متعلق نہایت دھندلا سا تخیل اس عہد میں بھی موجود ہے لیکن کائنات کی حرکت سے توجیہ کے لئے محض شاعرانہ تخیل کافی نہیں تھا۔

(باقی)

سیبویہ کی الکتاب

اور

اس کی شرحین

ڈاکٹر محمد ظہور الحق، ایم۔اے، پی ایچ ڈی۔ لکچرر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

آغاز اسلام ہی سے دین اور ریاست کی زبان عربی رہی ہے، فتوحات کی کثرت سے اسلامی مملکت کے حدود میں جتنا اضافہ ہوتا گیا اسی قدر عربی کا دائرۂ اثر بڑھتا گیا ممالک متفرقہ میں بعض بہت متمدن تھے ادنکی زبانیں بھی . . . ترقی یافتہ تھیں، لیکن سب نے عربی زبان کا والہانہ خیر مقدم کیا، اور اپنی زبان سے زیادہ اس کی طرف توجہ کی تھوڑے ہی عرصہ میں عراق سے مراکو تک اسی کا دور دورہ ہوگیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یورپ میں بھی اس نے قدم رکھ دیا، اور اسپین میں اس کا رواج عام ہوگیا، ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں مقامی زبانیں اگرچہ باقی رہیں لیکن دینی ضرورت سے عربی کا مطالعہ ناگزیر تھا، اس لیے اس کی جانب خاص توجہ رہی علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی اسے خاص اہمیت حاصل تھی ان وجوہ سے عربی زبان کو بڑا فروغ ہوا . . . لیکن جس قدر اس کی وسعت بڑھتی گئی اسی قدر اس کی دیکھ بھال کی فکر بڑھتی گئی، عربوں کے علاوہ لاکھوں عجمی بھی عربی بولتے اور لکھتے تھے، اور ان کے اختلاط سے زبان کا متاثر ہونا ضروری تھا، یہ بڑا سخت وقت تھا زبان کی حلاوت، سلاست اور عذوبت میں

طرح طرح کے لسانی نقائص کی آمیزش شروع ہوگئی تھی، عجمیوں کے لہجہ کے فرق اور حرکات و اعراب کی صحیح ادائیگی میں ان کی لاپرواہی کی وجہ سے دوسرے عیوب کے ساتھ ایک بڑا عیب "لحن" کا پیدا ہوگیا تھا، اس کی وجہ سے قرآن پاک کی صحیح قرأت میں بھی دقت ہونے لگی تھی، عجمیوں نے ارادۃً ایسا نہیں کیا تھا، بلکہ مادری زبان کو چھوڑ کر جب انھوں نے عربی زبان میں لکھنا اور بولنا شروع کیا تو ان کی اپنی زبان کے مانوس اور مستعمل انداز و اطوار اور طرز تکلم کا آہستہ آہستہ اثر پڑنے لگا، اس طرح وہ اپنے اصلی خد و خال سے ہٹ کر مسخ شدہ شکل میں تبدیل ہونے کے خطرے سے دوچار ہوگئی، لیکن علمائے عربیت نے تاثر و تاثیر کے ان مضر اثرات کو فوراً پہچان لیا، اور عربی زبان کے اصول و قواعد اور صرف و نحو کے ضوابط کی تشکیل میں لگ گئے، اس وقت ان کے سامنے اس کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ عجمیوں کو عربی زبان کے سمجھنے اور بولنے میں غیر معمولی زحمتوں سے بچایا جائے، دوسرے یہ کہ لحن اور اعرابی اغلاط کی روک تھام کی جائے، عراق کے دو اہم شہروں کوفہ اور بصرہ میں عربی زبان کی قواعد سازی کا کام زیادہ ہوا، اور یہاں بڑے بڑے علمائے لسان اور ماہرین صرف و نحو پیدا ہوئے، اس بارہ میں ان دونوں شہروں کو بڑی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، لیکن غرض اور مقصد میں اتحاد کے باوجود دونوں کے مرتب کردہ اصول و قواعد میں خاصا فرق ہے، علمائے بصرہ کا زیادہ میلان قیاس کی طرف تھا، جب کہ اہل کوفہ سماع پر زیادہ زور دیتے تھے،

قواعد کے دو الگ الگ دبستانوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے دونوں کے متبعین میں بحث و مباحثہ اس حد تک پہنچا کہ کبھی کبھی یہ بحث مناظرہ سے آگے

بڑھ کر مجادلہ کی حدود میں داخل ہو جاتی۔ دونوں دبستانوں کے پیروؤں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں طریقوں سے اپنے مرتب کردہ قواعد صرف و نحو کی اشاعت کی ...... اپنے موقف کی اصابت یا برتری ثابت کرنے کے لیے بصرہ اور کوفہ کے علما نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا، ان دونوں شہروں کی حدود سے باہر علمائے ادب کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی، ان میں سے جو کسی نہ کسی حلقہ کی پیرو تھی، اور اس میں وہ اتنی سخت تھی کہ اپنے دبستان سے سرمو تجاوز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی، کوفی و بصری دونوں اپنے اصول و قواعد پر اس طرح جمے ہوئے تھے کہ بعض اوقات تو مذہبی عصبیت کی جھلک نظر آتی تھی،

ان دو دبستانوں کے وجود میں آنے کے بعد تیسری صدی ہجری میں زبان اور قواعد زبان کا ایک نیا مرکز بغداد میں وجود میں آیا، چوتھی صدی ہجری میں اس کا بڑا زور رہا، بغداد کے اس دبستاں میں بظاہر "خذ ما صفا و دع ما کدر" کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے، لیکن پورے طور پر یہ غیر جانبداری قائم نہ رہ سکی، اہل بصرہ کو پہلے کوفیوں پر جو تفوق حاصل تھا، بغداد میں اس کو ٹھیس پہنچی یہاں سیاسی اور انتظامی مشینری پر اس وقت ایسے افراد کا غلبہ تھا جن کے اساتذہ اور اتالیق زیادہ تر کوفی علما تھے، مثلاً کوفی عالم مفضل الضبی متوفی ۱۷۰ھ مہدی کا معلم تھا، کسائی متوفی ۱۸۹ھ ہارون رشید کا معلم تھا، جو بعد میں اس کا مصاحب اور ندیم ہوا، اس کے دونوں لڑکوں امین اور مامون کا بھی یہی استاد تھا، فراء متوفی ۲۰۷ھ مامون رشید کا گہرا دوست اور اس کے بچوں کا معلم تھا، اسی طرح ابن السکیت نحوی کوفی متوفی ۲۴۴ھ خلیفہ متوکل کی اولاد کا معلم تھا۔

بہر حال دبستانِ بغداد اگرچہ ایک تیسرے مرکز کی حیثیت سے وجود میں آیا،

مگر اس پر کوفی علماء کا غلبہ رہا، تاہم اس دبستاں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اکابر کی تقلید کی جو دبا دونوں دبستانوں میں عام تھی، اب بعد میں آکر کھلے ذہن سے زبان کے مسائل پر غور و خوض شروع ہوا، نئے ماحول اور آزاد معاشرے کا زندگی کے ہر شعبہ پر گہرا اثر پڑا، اور مسائلِ زبان پر غور و فکر کا پرانا طریقہ بدل گیا۔ انداز فکر میں اعتدال اور خیالات میں توازن پیدا ہوا، کوفہ اور بصرہ کے علماء اور اساتذہ کے درمیان مباحثہ مجادلہ کی وہ مثالیں اب ناپید ہوگئیں، جنھوں نے سو سال قبل بصرہ اور کوفہ کی سرزمین میں ہلچل مچا رکھی تھی، تاریخ نحو میں اس طرح کی تلخی اور نوک جھونک کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں، خلیل بن احمد نحوی بصری متوفی ۱۷۵ھ اور رواسی کوفی متوفی ۱۹۰ھ کے درمیان اس وقت سخت تلخی پیدا ہوگئی تھی، جب آخر الذکر کی تالیف "الفیصل"۔ جو دبستان کوفہ کے نقطۂ نظر کی تائید میں نحو کی پہلی کتاب ہے، ــ وجود میں آئی، اسی طرح سیبویہ بصری متوفی ۱۸۰ھ اور الکسائی کوفی متوفی ۱۸۹ھ کے درمیان خوب بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ مبرد بصری متوفی ۲۸۵ھ و ثعلب کوفی متوفی ۲۹۱ھ کے درمیان تو یہ بحثیں بہت زیادہ شہرت اختیار کر گئی تھیں، مگر دبستان بغداد کے وجود میں آنے کے بعد مباحثات اور علمی اختلافات کا یہ انداز ناپسند کیا جانے لگا، علمی سطح پر اختلافات اب بھی باقی تھے، اور انھیں باقی بھی رہنا چاہئے تھا، کیونکہ یہ ساری علمی بحثیں فکر و عمل کی ایک گرانمایہ میراث تھیں، زبان کے علمی اور عملی مسائل کی پیچ و پیچ گرہیں، اس وقت تک نہیں کھل سکتیں، جب تک ہمیں گزشتہ حالات و واقعات کے سیاق و سباق میں ان دونوں دبستانوں کے اصولِ زبان اور قواعد ادب اچھی طرح معلوم نہ ہو جائیں، دبستان بغداد کے یوں تو بہت سے اساتذہ اور مصنفین قابل ذکر ہیں جیسے [illegible]

ابوالقاسم الزجاجی متوفی ۳۳۰ھ ابوسعید سیرافی متوفی [illegible]ھ ابوالحسن [illegible] متوفی [illegible]ھ [illegible]
ابن جنی متوفی ۳۹۲ھ مگر ان میں سیبویہ کو بہت اہمیت حاصل ہے،

سیبویہ | سیبویہ عربی اصول و قواعد (گرامر) کے دبستان بصرہ کا امام اول تھا اس نے اس فن میں نہایت گران قدر اور یادگار خدمات انجام دی ہیں، الکتاب کی تصنیف اسکا عظیم کارنامہ ہے، یہ کتاب آج تک نحوی مسائل کا صحیفہ خیال کی جاتی ہے، زبان خلق نے اسکو امام النحاۃ کا خطاب دیا تھا، سیبویہ کے نحوی نظریات کو اس کے تلمیذ رشید اخفش نے بہت فروغ دیا۔

لیکن بایں ہمہ علوے مرتبت اور جلالت علم اہل سیر نے سیبویہ کے حالات وسوانح کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا، جس کا وہ واقعی مستحق ہے، راقم کے مطالعہ کے مطابق غالباً یاقوت حموی نے معجم الادبار میں سب سے زیادہ اس پر لکھا ہے، لیکن ان تمام ماخذوں میں تقریباً چند واقعات کی تکرار ہے، چنانچہ سیبویہ کے بارے میں ہماری معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ اسکا پورا نام عمرو بن عثمان بن قنبر، ابوبشیر اور ابوالحسن کنیت اور سیبویہ لقب ہے، دنیائے علم میں وہ اپنے اسی لقب سے مشہور ہے، وہ ایرانی نژاد تھا، اس لئے یہ لقب بھی فارسی ہے، اسے سیب کی بو" کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا، اس لقب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں، ایک خیال یہ ہے کہ بچپن میں اسکی ماں یہ لفظ کہکر اس کو گود میں نچایا کرتی تھی، کوئی کہتا ہے کہ اس کے جسم سے عطر کی مہک نکلتی محسوس ہوتی تھی، ایک قول یہ بھی ہے کہ سیبویہ کو سیب سونگھنے کی عادت تھی، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے دونوں رخسار سیب کے مانند نہایت خوبصورت تھے، اس لئے سیبویہ اس کا لقب پڑگیا، یہی زیادہ قرین قیاس ہے،

دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں فارس کے ایک گاؤں بیضاء میں اس کی ولادت ہوئی، اور بصرہ میں نشو ونما پائی، اپنے عہد کے مشاہیر اہل علم سے اکتساب فیض کیا،

اس کی زبان میں قدرے لکنت تھی، مگر اشہب قلم کی روانی نے اس کمی کی پوری تلافی کر دی تھی۔ سیبویہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ حکومت میں بغداد آیا، اور وہاں نحو کے مشہور امام کسائی سے بعض نحوی مسائل میں مباحثہ ہوا نحو کے دو ممتاز اسکولوں کے ان اساطین کے اس مناظرہ کو اتنی تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ تمام اہل سیر نے اس کی تفصیلات بہت نمایاں طور پر بیان کی ہیں، اس وقت سیبویہ کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی، پھر وہ بغداد سے بصرہ اور وہاں سے اپنی زاد بوم بیضاء واپس آگیا، اور وہیں نسبتہً کم عمری میں اس کی وفات ہوگئی۔ صحیح روایت کے مطابق وفات کے وقت اس کی عمر چالیس[۴] سال سے کچھ اوپر تھی،

ابن خلکان نے سیبویہ کو متقدمین و متاخرین علماء کے دونوں طبقوں میں نحو کا سب سے بڑا عالم قرار دیا ہے، جاحظ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ نحو کی تمام کتابیں سیبویہ کی تصنیف الکتاب کی رہین منت ہیں اور جاحظ جب معتصم کے وزیر محمد بن عبدالملک الزیات سے پہلی بار ملنے کے لئے گیا تو اس نے بہت غور و فکر کے بعد اس کی خدمت میں شایان شان تحفہ پیش کرنے کے لیے سب سے قیمتی چیز الکتاب ہی کو منتخب کیا تھا، ابن ندیم لکھتا ہے،

لم یسبقہ الی مثلہ احد	اس کتاب کے مثل نہ تو اس سے
قبلہ ولم یلحق بہ بعدہ	پہلے کوئی تصنیف لکھی گئی اور نہ
	اس کے بعد

نحو کے بکثرت علماء گزرے ہیں، جن کے حالات اور کارنامے معروف و مشہور ہیں مگر ان تمام علمائے نحو میں ایک سیبویہ کا نام لوگوں کی زبانوں پر آشنا رہا ہے کہ آج بھی

دنیائے عرب میں اگر کوئی اعرابی غلطی یا اصول نحو کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی اس غلطی کی تعبیر کے لیے لوگوں کی زبان پر عام طور سے بس یہ ایک جملہ آتا ہے،

"قد اساء الی سیبویہ واقض مضجعہ فی قبرہ" (اس نے سیبویہ کو تکلیف پہونچائی اور قبر میں اس کی خوابگاہ کو غبار آلود کردیا) اسی طرح اگر کوئی صحت اعراب اور سلامتی لغت کا دلدادہ اور زبان و بیان کا ماہر ہے، تو اسے سیبویہ العصر وارث علم سیبویہ، خلیفہ سیبویہ، جیسے الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔

الکتاب | جیسا کہ مذکور ہوا، سیبویہ کی مایۂ ناز تصنیف "الکتاب" ہے، جو بلا شبہ اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے، علماء نے اس کتاب کو معیار العربیہ، دستور العربیہ، عیار التعبیر قرآن النحو کے لقب دئے ہیں، یہ کتاب مسائل نحو کے اصول اور فروع کی جامع ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ ۹۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں اصلی اور ضمنی کل ۵۷۰ موضوعات قواعد پر مدلل بحث ہے، سیبویہ نے اس کتاب میں عربی زبان کے قواعد کے بارے میں اپنے پیشرو علماء کی آراء کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، قواعد زبان کے مسائل بیان کرتے ہوئے اس نے ہر مقام پر یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ یہ رائے کس عالم نحو یا ماہر لغت کی ہے، قواعد کے ایسے مسائل بھی اس میں پائے جاتے ہیں جن کی سند یا مروی عنہ کے ذکر سے سکوت ہے، مبصرین نے ایسے مسائل کو سیبویہ کی رائے قرار دیا ہے اور اسکے مجتہدات میں ان کو شمار کیا ہے سیبویہ نے مسائل قواعد کو شواہد و امثلہ سے واضح کرنے کی قدم قدم پر کوشش کی ہے، چنانچہ قرآن کریم کی ۳۰۰ آیات ۱۰۰۱ اشعار اور ۱۰۰ ارجاز کو پیش کیا ہے تاکہ موضوع کی وضاحت کا پورا حق ادا ہو جائے، ذیل میں دی ہوئی تفصیل سے یہ معلوم ہوگا کہ نحو کے کس استاد یا دبستان کا کتنی بار سیبویہ نے نام لیا ہے اور انکی آراء

کو بیان کیا ہے،

نمبر شمار	نام	تعداد ذکر	نمبر شمار	نام	تعداد ذکر
۱۔	خلیل بن احمد نحوی	۵۲۲	۶۔	ابوزید الانصاری	۹
۲۔	یونس بن حبیب	۲۰۰	۷۔	ہارون بن موسیٰ	۵
۳۔	ابوالخطاب الاخفش	۴۰	۸۔	عبداللہ بن ابی اسحاق	۴
۴۔	ابو عمرو بن العلاء	۴۴	۹۔	الکوفیون	۴
۵۔	عیسیٰ بن عمر	۲۲	۱۰۔	ہذیل	۱

کتاب سیبویہ کی طباعت واشاعت | الکتاب کی دو قسم کی اشاعتیں ہمارے سامنے ہیں، (۱) مستقل طباعت۔ (۲) کسی سابقہ اشاعت کی تصویر، چربہ یا محض نقل۔

کتاب کی مستقل اشاعت، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اب تک پانچ بار ہو چکی ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے اس کی طباعت ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی، اور رفتہ رفتہ ۱۸۸۹ء میں مکمل ہوئی، اس اشاعت میں مشہور مستشرق ہارتیخ دیرنبورج کا فرانسیسی زبان میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے،

دوسری بار اس کی اشاعت [illegible] میں کلکتہ سے ہوئی۔ پوری کتاب ایک جلد میں ہے اور صفحات کی تعداد ۴۱۰۴

تیسری بار ۱۹۰۰ء میں یہ مصر میں طبع ہوئی۔ اس طباعت کو سب سے زیادہ مستند قرار دیا جاتا ہے، اس کے حاشیہ پر ابوسعید السیرافی (۳۶۸ھ) کی تعلیقات بھی ہیں، اور کتاب کے نیچے الاعلم الشنتمری کی کتاب "تحصیل عین الذہب من معدن جواہر الادب فی علم مجازات العرب" کو بھی چھاپا گیا ہے، الاعلم الشنتمری نے شواہد کتاب

کی بڑی اچھی تشریح کی ہے، مثال اور تمثیلات کے سمجھنے میں یہ کتاب پوری مدد دیتا ہے،

چوتھی بار جرمنی کے مشہور شہر برلن میں ۱۹۰۰ء میں جان (COHN) کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی۔

پانچویں بار ۱۹۶۶ء میں عبدالسلام محمد ہارون کی شرح و تحقیق سے یہ کتاب قاہرہ (مصر) سے شائع ہوئی۔ اس کے کل صفحات ۴۴۴ ہیں، جو صرف جلد اول ہے، پھر دوسری جلد عبدالسلام مذکور کی شرح و تحقیق سے ۱۹۶۷ء میں شایع ہوئی جو ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، دونوں کتابیں مطبعۃ دار الکتب سے شائع ہوئی ہیں: النشرۃ المصریۃ مطبوعات، بابۃ ۶۶-۱۹۶۶ء و ۶۷-۱۹۶۶ء میں اس طباعت کا تعارف کرایا گیا ہے،

ان کے علاوہ بیچ بیچ میں الکتاب کی بار بار اشاعت ہوئی ہے، مگر یہ مستقل طباعت نہیں ہے، وہ ان اشاعتوں کے عکس اور چربے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، مثلاً،

۱۹۶۶ء میں الکتاب کا پہلا حصہ الاعلمی لائبریری، بیروت سے شایع ہوا، الاعلم الشنتمری کی تحصیل عین الذہب بھی اس میں شامل ہے، اس کے کل صفحات ۵۰۲ ہیں، یہ حروف استفہام کے بیان پر ختم ہوا ہے،

۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۷ء میں کتاب کے دونوں حصے المطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق مصر سے شایع ہوئے، ان میں ابوسعید السیرافی کی شرح اور الاعلم الشنتمری کی تحصیل عین الذہب بھی شامل ہے، یہ دونوں کتابیں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہیں،

الکتاب کے مخطوطے | الکتاب کے مخطوطے مصر، ہند، مغرب اور یورپ کے بہت سے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں،

(۱) مخطوطہ دار الکتب المصریہ:۔ یہ نہایت عمدہ لکھا ہوا مکمل مخطوطہ ہے، کتاب کی روایات اور اسانید سے متعلق ابتدائے کتاب میں مفید معلومات کا اضافہ ہے اس مخطوطے میں روایت کتاب کی مختلف اسناد کا متصل ذکر ہے، جس کا سلسلہ سیبویہ تک پہنچتا ہے، نحو ۱۴۰ کے تحت یہ نسخہ محفوظ ہے،

(۲) دار الکتب المصریہ کا یہ دوسرا مخطوطہ ہے، جو نحو ۱۳۱ کے تحت محفوظ ہے۔ نسخہ مکمل ہے، اور اسناد و رواۃ کے نام بھی ہیں،

(۳) یہ نسخہ عمدہ خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، دو اجزاء میں ہے، پہلے جزو میں ۴۹۴ صفحات ہیں، جو ابتدائے کتاب سے باب تغییر الاسماء المبہمہ پر ختم ہوتا ہے، دوسرا جزو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، جو باب الظروف سے شروع ہو کر آخر کتاب تک ہے، یہ مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں نمبر ۴۳۲۲ - ۵۳۳۲ کے تحت محفوظ ہے،

(۴) یہ ابو احمد اسحاق بن محمد کا نسخہ ہے لیکن نامکمل ہے، ابو جعفر احمد بن رستم الطبری کی روایت سے لیا گیا ہے، اس کی روایت ابو عثمان مازنی سے طبری تک پہنچتی ہے، یہ مخطوطہ مصر کی مطبوعہ 'الکتاب' کے پورے جزو اول اور دوسرے جزو کے ۱۹۹ صفحات پر مشتمل ہے، دار الکتب المصریہ میں یہ مخطوطہ نحو ۱۳۹ کے تحت محفوظ ہے،

(۵) یہ مخطوطہ بھی نامکمل ہے، اول اور آخر سے کچھ اجزاء غائب ہیں، مصری مطبوعہ نسخہ کے ج ۱، ص ۲۵۳ سے ج ۲، ص ۴۰۰ تک کے مسائل اس میں پائے جاتے ہیں، اس کی ابتداء میں یہ عبارت لکھی ہے،

" انتہ عن نسخۃ أبی العباس محمد بن یزید النحوی، عن ابی عمر الجرمی وأبی عثمان المازنی" اس کے بعد یہ عبارت درج ہے،

"قوبل به نسخة برواية أبي اسحاق ابراهيم بن السري الزجاج عن أبي العباس محمد بن يزيد المبرد بحضرة الشيخ ـــ ابي عبدالله بن بركات النحوي بالجامع العتيق بمصر في جمادى الآخرة من سنة ثمان وسبعين وثلاثمأة."

یہ نسخہ دارالکتب المصریہ میں نحو ۱۳۹ کے تحت محفوظ ہے، یہ نسخہ اسماعیل بن احمد بن ابی خلف القصار کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جو اس نے ۳۵۱ھ میں اپنے لئے لکھا تھا،

(۶) یہ مخطوطہ نامکمل ہے، اجزا کی قدیم تقسیم کے لحاظ سے صرف دو جزو تاسع و عاشر پر مشتمل ہے،

یہ نسخہ ابوالحسن احمد بن بصر کے نسخہ سے منقول ہے، اس میں نسخہ مطبوعہ مصر کی جلد دوم ص ۸، سے ۲۲۲ تک کی عبارت ہے، پرانے رسم الخط میں لکھا ہوا ہے، اوراق کی کل تعداد ۱۵۰ ہے، اصل مخطوطہ کتب خانہ سرزنیانہ میں پایا جاتا ہے، اس کی فوٹو کاپی معہد المخطوطات العربیہ میں پائی جاتی ہے، (بروکلمان ذیل ۱: ۱۶۰)

الکتاب کی شروح　سیبویہ کی "الکتاب" کی افادیت اور مقبولیت کا ہم آسانی اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر دور میں، اور اسلامی مملکت کے ہر خطہ کے علماء نے "الکتاب" سے گہری دلچسپی ظاہر کی، اور اس کے مطالب کی تشریح و توضیح میں نحو کے بڑے بڑے علماء نے پورا پورا حصہ لیا، نیز اسکے مشمولات کے مختلف گوشوں سے اپنی مصنفات میں سیرحاصل بحث کی ہے، کچھ کتابیں اس کی تردید میں بھی لکھی گئیں، لیکن یہ بھی منفی حیثیت سے اسکی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری تک

الکتاب پر مختلف پہلوؤں سے جس قدر کام ہوئے ہیں ان کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے ہم حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں ،۔

شروح (عام) شروح شواہد، شروح ابیات، ابنیۃ الکتاب، تلخیص و تجرید، رد کتاب، جواب اعتراضات ..... "ذیل کی فہرست سے الکتاب کی قدر و قیمت کا کافی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے ،

۱۔ شرح بکر بن محمد المازنی، ابو عثمان، متوفی ۲۴۹ھ ۔ یہ شرح تفسیر کتاب سیبویہ کے نام سے مشہور ہے، (۲) شرح ابراہیم بن سفیان الزیادی، متوفی ۲۴۹ھ (۳) ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش الاصغر، متوفی ۳۱۵ھ ۔ الکتاب پر اس کی دو شرحیں ہیں، ۱۔ شرح سیبویہ ۲۔ تفسیر رسالہ سیبویہ ، (۴) ابوبکر ابن السراج محمد بن السری البغدادی النحوی متوفی ۳۱۶ (۵) ابو القاسم عبداللہ بن اسحاق الزجاجی، متوفی ۳۴۰ھ ۔ شرح رسالہ کتاب سیبویہ (۶) ابوبکر محمد بن علی المعروف بلبرمان العسکری النحوی متوفی ۳۴۵ھ ۔ شرح کتاب سیبویہ نامکمل ۔ اس کی دوسری تالیف شواہد کی شرح میں ہے، (۷) ابوسعید حسن بن عبداللہ السیرافی، .... متوفی ۳۶۸ھ الکتاب پر اس کی حسب ذیل دو تصانیف ہیں، (۱) شرح کتاب سیبویہ ۔ (۲) المدخل الی کتاب سیبویہ ۔ (۸) احمد بن ابان اللغوی الاندلسی، متوفی ۳۸۲ھ (۹) ابوالحسن علی بن عیسی الرمانی ۳۸۴ھ ۔ الکتاب کی سلسلہ میں اس نے چھ کتابیں لکھی ہیں ۔ ان میں ایک تو جامع ہے، باقی پانچ کتابوں میں نحو کے خاص پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے ۔ ان میں الکتاب کا اختصار اور اس کی تہذیب بھی شامل ہے ۔ (۱۰) ابوالعباس محمد بن یزید المبرد، متوفی ۲۸۵ھ اس نے الکتاب کی شرح میں ایک تالیف چھوڑی ہے، (۱۱) یوسف بن سعید بن عبداللہ متوفی

شرح کتاب سیبویہ۔ (۱۲) احمد بن عبداللہ المعری، متوفی ۴۴۹ھ۔ اس نے ۵۰ کراسوں میں الکتاب کی شرح لکھی مگر مکمل نہیں ہوئی۔ (۱۳) ابن الباذش علی بن محمد النحوی، متوفی ۵۲۸ھ (۱۴) ابو الفضل البطلیوسی قاسم بن علی المعروف بالصفار متوفی بعد ۶۳۰ (۱۵) ابوالحسن علی بن محمد بن محمد بن علی الحضرمی الاشبیلی المعروف بابن خروف النحوی، متوفی ۶۰۹۔ اس کی شرح کا نام "تنقیح الالباب فی شرح غوامض الکتاب" ہے۔ (۱۶) ابو عمر عثمان ابن عمر المالکی المعروف بابن الحاجب متوفی ۶۴۶ھ (۱۷) ابو العباس احمد بن الاشبیلی متوفی ۶۵۱ھ (۱۸) ابوبکر یحیی بن خدامی المالقی، متوفی ۶۵۰ھ (۱۹) ابو الحسین عبیداللہ بن احمد بن احمد بن ابی الربیع العثمانی الاموی الاشبیلی متوفی ۶۸۸ھ (۲۰) ابو العباس احمد بن محمد العنابی، متوفی ۷۷۶۔ (۲۱) محمد بن علی الغفار الجزامی المالقی۔ مشکلات الکتاب کی شرح کا مصنف ہے،

شرح شواہد الکتاب | الکتاب کے سلسلہ میں اس موضوع پر حسب ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) ابو جعفر احمد بن محمد النحاس النحوی، متوفی ۳۳۸۔ اس کی ایک تالیف الکتاب کے شواہد کی شرح میں ہے۔ (۲) العلامہ جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری، متوفی ۵۳۸ھ۔ شرح شواہد الکتاب۔ (۳) الاعلم الشنتمری۔ اس نے بھی الکتاب کے شواہد کی شرح لکھی ہے۔ (۴) ابن ہشام محمد بن احمد اللخمی متوفی حدود ۵۰۰ھ نے الاعلم الشنتمری کی تصنیف کردہ شرح کے بارے میں کچھ مفید بحثیں کتاب کی شکل میں لکھی ہیں، اور نکات بیان کئے ہیں، (۵) ابو البقاء عبداللہ بن حسین العکبری متوفی ۶۱۶ھ اس کی بھی ایک کتاب شرح شواہد الکتاب کے بیان میں ہے۔ اس کی ایک دوسری تصنیف لباب الکتاب بھی ہے،

شروح ابیات : اس موضوع پر حسب ذیل مصنفین نے قابل ذکر تالیفات چھوڑی ہیں،
(۱) ابو اسحاق ابراہیم بن السری الزجاج النحوی متوفی ۳۱۰ھ (۲) ابو جعفر محمد بن عبد اللہ
الاسکافی، متوفی ۴۲۱ھ (۳) محمد بن علی الشلوبین، متوفی ۶۴۵ھ (۴)
ابو بکر محمد بن علی المراغی،

ابنیۃ الکتاب : اس موضوع پر ایک تالیف صرف ابو بکر محمد بن حسن الزبیدی کی ہے،

تلخیص و تجرید : (۱) اس موضوع پر اثیر الدین ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی کا نام
خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس نے صفار کی شرح کی تجرید کی، جس کا نام التجرید ہے،
اس کی دوسری تالیف اس سلسلے میں الاسفار الملخص من شرح سیبویہ للصفار ہے،
(۲) ابو البقا عبد اللہ بن حسین العکبری متوفی ۶۱۶۔ اس کی تلخیص کا نام لباب الکتاب ہے،
(۳) ابن الصائغ علی بن محمد الکنانی اشبیلی متوفی ۶۸۰ھ۔ اس نے ابن خروف
اور السیرانی کی شرح کی بہت عمدہ تلخیص لکھی ہے۔

(۴) ابو علی عمر بن محمد الشلوبینی، متوفی ۶۴۵ھ۔ اس نے الکتاب پر ایک قیمتی
حاشیہ لکھا،

(۵) ابو جعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی۔ الکتاب پر اس نے بھی ایک حاشیہ لکھا ہے،

رد کتاب - (۱) ہارون القرطبی، متوفی ۴۰۱۔ اس نے الکتاب کے عیوب یا عیوب
پر ایک کتاب چھوڑی ہے،

(۲) ابو العباس محمد بن یزید المبرد، متوفی ۲۸۵ھ، اس نے بھی الکتاب کے
رد میں ایک تالیف کی ہے،

جواب اعتراضات : ابن الصائغ علی بن محمد الکنانی الاشبیلی متوفی ۶۸۰۔ اس نے ابن الطراوۃ کے

الکتاب پر اعتراضات کے جواب لکھے ہیں۔

مآخذ

(۱) ابن الانباری　　نزہۃ الالبار فی طبقات الادباء

۲۔ ابن خلکان　　وفیات الاعیان

۳۔ ابن العماد　　شذرات الذہب جلد ۲

۴۔ بروکلمان　　تاریخ الادب العربی

۵۔ البغدادی، اسماعیل پاشا　　ہدیۃ العارفین

۶۔ جرجی زیدان　　تاریخ الآداب اللغۃ العربیہ

۷۔ حاجی خلیفہ　　کشف الظنون

۸۔ الزرکلی　　الاعلام

۹۔ الزیات　　تاریخ الادب العربی

۱۰۔ سیبویہ　　الکتاب

۱۱۔ السیوطی　　بغیۃ الوعاۃ

۱۲۔ ″ ″　　شرح شواہد المغنی

۱۳۔ کحالہ، عمر رضا　　معجم المولفین

۱۴۔ یاقوت الحموی　　معجم الادبار جلد ۶

۱۵۔ خطیب بغدادی　　تاریخ بغداد جلد ۱۲۔

۱۶۔ ابن ندیم　　الفہرست

۱۷۔ طاش کبری زادہ　　مفتاح السعادۃ جلد ۱

ابوریحان بیرونی

ترجمہ عمیر الصدیق

اسلامی تاریخ میں ابوریحان بیرونی جیسی جامع اور ہمہ گیر شخصیت خال خال ہی ملتی ہے، اس کو تاریخ جغرافیہ، ریاضیات، طبیعیات، فلکیات اور شعروادب وغیرہ میں یکساں مہارت اور دسترس حاصل تھی، لیکن باایں ہمہ جلالت مرتبت وعلوئے شان ابھی تک اردو میں اس کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا گیا جسکا وہ واقعی مستحق ہے، مگر عربی اور بعض یورپین زبانوں میں بیرونی کی شخصیت اور اس کے علمی کارناموں پر وقیع اور بلند پایہ تحقیقی کام ہوا ہے، بغداد یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر صبیح صادق حکیم نے مراکش کے موقر رسالہ "اللسان العربی" میں البیرونی پر ایک گرانقدر مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں بڑی جامعیت کے ساتھ بیرونی کی عبقریت اور ہمہ گیری پر روشنی ڈالی گئی ہے، فاضل موصوف نے اس سلسلہ میں نہ صرف البیرونی کے بیشتر دستیاب مصادر تک رسائی حاصل کی ہے، بلکہ بعض اہم کمیاب بلکہ نایاب مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے، اسی افادیت کے پیش نظر اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے، "مترجم"

بیرونی ان چند مسلمان علماء میں سے ہے، جکی شخصیت اور علم و فن میں کاملیت کا اعتراف مستشرقین نے بڑی فراخدلی سے کیا ہے، ایڈورڈ سخاؤ E. SACHAU جنہوں نے بیرونی کی کتابوں کا خاصہ مطالعہ کیا، اور اس کی چند کتابوں کو ایڈٹ کر کے شایع بھی کیا ہے، کہتے ہیں کہ تاریخ نے جن عظیم ترین عقلیت پسند شخصیتوں کا مشاہدہ کیا ہے، بیرونی انہی میں سے ہے، مستشرق کارلو نالینو NALLINO نے کہا کہ ماہرین فلکیات میں علم اور ذکاوت کے لحاظ سے بیرونی کا کوئی ہمسر نہیں، اطالوی مستشرق آلڈو میلی ALDOMIELI نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے کہ عبقریت اور کمال فن جسطرح بیرونی کی ذات میں جمع ہو گئے تھے، حق یہ ہے کہ پھر ایسا کوئی شخص نہ ہوا، امریکی مستشرق جارج سارٹن G. SARTON کی نظر میں بیرونی ایک فلسفی، ریاضی دان، ماہر جغرافیہ محقق، دانشور، اور اسلام کے عظیم ترین افراد میں سے ہے، ایک اور مستشرق میکس مایرہوف MAX MAYERHOF کا خیال ہے کہ ان عظیم سائنداؤں میں جن سے اسلام کا عہد زریں روشن اور تابناک ہے، بیرونی سرفہرست ہے۔ ویل ڈیورانٹ DURANT کی رائے ہے:

"ابو ریحان بیرونی عالم اسلام کا خوبصورت تحفہ ہے، وہ فلسفی و مورخ ہے، شاعر و ادیب ہے، سائنسدان و ریاضی داں ہے، علم افلاک اور علم الارض کا ماہر ہے، مسلمانوں میں اس کا وہی مقام ہے، جو یورپ میں لیونارڈ ڈاونشی کا ہے"

بیرونی، ذی الحجہ ۳۶۲ھ مطابق ستمبر ۹۷۳ء میں خوارزم میں پیدا ہوا لیکن ابن ابی اصیبعہ کا خیال ہے کہ بیرونی کی نسبت بیرون کی طرف ہے، اور یہ بیرون سندھ کا ایک شہر ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے یہ غلط فہمی شاید اس وجہ سے ہوئی کہ دریائے سندھ کے کنارے ایک شہر نیرون تھا، جسے نیرون کوٹ یا حیدرآباد بھی

کہا جاتا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اسے بیرون پڑھ لیا یا اس معاملہ میں اس نے شہرزوری کی تقلید کی ہے، جس نے نزہتہ الارواح میں بیرونی کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ "بیرون سندھ کا ایک شہر ہے۔" سمعانی نے انساب میں تصریح کی ہے کہ بیرونی وہ لوگ کہلاتے ہیں، جو خاص خوارزم کے نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق بیرون خوارزم سے ہوتا ہے، ابو ریحان بھی اسی نسبت سے مشہور ہوا۔ معجم الادباء میں یاقوت حموی نے بھی اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے، بیرونی کے خوارزمی ہونے کی ایک بڑی شہادت ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد تبریزی کے رسالہ المشاطہ لرسالۃ الفہرست سے ملتی ہے، جو بیرونی کے ایک مکتوب کی شرح کے طور پر لکھا گیا تھا، تبریزی نے لکھا ہے:

"امام الشیخ، استاذ الرئیس حکیم برہان الحق ابو ریحان بیرونی ذی الحجہ پنجشنبہ کے روز صبح کے وقت خوارزم میں پیدا ہوئے۔" اس سے بھی بڑی دلیل خود بیرونی کا یہ قول ہے کہ

وقت مولدی قد اتفق	میری پیدائش خوارزم شہر میں
بمدینۃ خوارزم	بروز پنجشنبہ ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ
وکانت الولادۃ یوم الخمیس	کو ہوئی۔
ثالث ذی الحجہ سنۃ ۳۶۲ھ	

(تجدید نہایات الاماکن، مقدمہ)

بیرونی کا سلسلۂ نسب معلوم نہیں، صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ باپ کا نام احمد تھا، اور خاندان عجمی تھا۔

علم کی تلاش و جستجو کا شوق اسے شروع ہی سے تھا، خوارزم میں بیس برس گزارنے کے بعد وہ بحر خزر کے ساحلی علاقہ میں چلا آیا، اور آل سامان کے مشہور فرمانروا نوح بن منصور کا مقرب بن گیا، یہیں اس کی ملاقات شیخ الرئیس ابن سینا سے بھی ہوئی اور

مختلف علمی مسائل پر مناظرے بھی ہوئے۔ آل سامان کے زوال کے بعد والی جرجان قابوس بن وشمگیر کے ہاں چلا آیا۔ یہ ایک علم دوست حاکم تھا۔ بیرونی اس سے بڑا خوش رہا اپنی کتاب آلاثار الباقیہ اسی کے نام معنون کی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں والی جرجان کا زوال ہوگیا، اور بیرونی پھر خوارزم واپس آگیا کچھ مدت بعد خوارزم پر محمود غزنوی نے حملہ کیا، اور جن سیاسی قیدیوں کو لیکر غزنہ روانہ ہوا ان میں یہ بیرونی بھی تھا، ایک روایت یہ ہے کہ بیرونی کے لیے سزاے موت تجویز ہوچکی تھی، لیکن اس کے علم اور بالخصوص فلکیات میں اس کی خصوصی دسترس کو دیکھتے ہوئے سلطان نے یہ حکم واپس لے لیا اور پھر اسے اپنے زمرۂ مقربین میں بھی شامل کر لیا، ہندوستان پر حملوں کے دوران بیرونی اس کا رفیق رہا، اور یہیں سے بیرونی کی نئی زندگی کا آغاز ہوا، اس نے سنسکرت پڑھی، اور ہندوستانی علوم پر دسترس حاصل کی پھر گہرے مطالعہ اور تحقیق کے بعد ہندوستان سے متعلق اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ الہند مرتب کی ۴۲۲ھ میں محمود کا انتقال ہوا، اور اس کا بیٹا مسعود جانشین ہوا، اس کے زمانہ میں بیرونی نے ایک اور مایۂ ناز کتاب قانون مسعودی تصنیف کی مسعود کے بیٹے مودود کے زمانہ میں اس نے اپنی آخری تالیف کتاب الصیدنہ مرتب کی، ۳ رجب ۴۴۰ھ ۱۳ دسمبر ۱۰۴۸ء کو غزنہ میں اسکا انتقال ہوگیا، غزنہ سے بیرونی کو بے حد محبت تھی اسے وہ اپنا وطن شمار کرتا تھا یہاں اُسے تمام علمی وسائل بہم تھے، اپنی کتاب تحدید نہایات الاماکن میں کتاب کے سبب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس سلسلہ میں جن مشکلات کا خیال تھا وہ قیام غزنہ کی وجہ سے بڑی حد تک آسان ہوگئیں، جہاں تک دلی لگاؤ اور قلبی عزت و احترام کا تعلق ہے غزنہ میرا وطن ہے، سائنسی تجربات اور رصدگاہوں کے

استعمال کا مجھے بہت پورا موقع ملا اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ کام کر سکا"،
اگرچہ بیرونی عقلی علوم کا ماہر تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ ایک کامیاب ادیب اور مستند اہل زبان بھی تھا، اسی بنا پر یاقوت حموی نے اس کا ذکر معجم الادباء میں کیا ہے،
بیرونی عربی زبان و ادب کا دلدادہ تھا، کئی زبانوں سے واقف بلکہ ان پر عبور حاصل ہونے کے باوجود عربی اس کی محبوب زبان تھی، اسی لیے اس نے تصنیف و تالیف کے لیے اسی زبان کو اختیار کیا، یاقوت حموی نے اسے ایک بامقصد زبان دان اور ادیب قرار دیا ہے، اور اس کی دو کتابوں شرح شعر ابی تمام اور کتاب التعلیل باصالۃ الوہم فی معانی النظم کا اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ شاعر بھی تھا اسکی شاعری اپنی سادگی، عام فہم الفاظ اور مطالب کی وضاحت کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتی ہے، ماحول اور رواج کے مطابق اس نے قصائد بھی کہے ہیں، ...... لیکن ان میں بھی نصیحت، خیرخواہی اور علم پر ناز کا انداز زیادہ نظر آتا ہے، اس کے قصائد شعری اغراض سے پاک ہیں مثلاً مدح میں وہ کہتا ہے،

اتاکم نوبت لصب فی زیارتکم ان کان مجلسکم خلوا من الناس
فانتم الناس لا ابغی بکم بدلا وانتم الراس والانسان بالراس
وکدکم لمعال تنهضون بها وغیرکم طاعم مسترجع کاسی
لدی الممکاید ان راجت مکاسبکا مینسی الالہ ولیس اللہ بالناسی

اسی طرح فخر کے موقع پر کہتا ہے،

مضی اکثر الایام فی ظل نعمۃ علی رتب فیها علوت کراسیا
بجهد شاوت الجابین ائمۃ فما اقتبسوا فی العلم شیء اقتباسا

فسائل بمقداری هنود اعشری	وبالغرب من قد قاس قدماً عما
فلم یثنهم عن شکر جهدی نعاً	بل اعترفوا طراً وعافوا انتکاسیا

اسکے اشعار پند وحکمت سے بھی خالی نہیں

ومن حام حول المجد غیر مجاهد	توی طاعا للمکرمات کاسیا
وبات قریر العین فی ظل راحة	ولکنه عن حلة المجد عاریا

بیرونی چوتھی صدی ہجری کا شاعر ہے، یہ دور الفاظ کے دروبست اور شان وشوکت کے اہتمام کا خاص دور ہے، بیرونی پر بھی اس کا اثر ہوا، مثلاً ان اشعار میں تجنیس کا استعمال وہ بڑے شوق سے کر رہا ہے،

فلا یغررک منی لیس مس	تراہ فی دروس واقتباس
فانی اسرع الثقلین طراً	الی خوض الرزی فی وقت باس

ایسے ہی کہتا ہے۔

تنغصت بالتباعد طیب عیشی	فلا شی امر من الفراق
کتابك ازهو الفرج المرجی	اطب لما الم من الفراق

بیرونی کے چند اشعار ایسے بھی ہیں، جن سے ہزل اور پھکڑپن کا اظہار ہوتا ہے یہ اشعار یقیناً اس کے شایان شان نہیں ہیں، لیکن یہ اسکا عام ذوق نہیں، مزاح کے طور پر یا ہجو کے جواب میں یہ اشعار آگئے ہیں،

ادبی خصوصیات کے ساتھ بیرونی صف اول کا مورخ بھی ہے، تاریخ الہند میں وہ ہندوستان اور اس سے متعلق تمام امور کی تصویر کشی بڑی چابکدستی سے کرتا ہے، اس کے لیے اس نے پہلے سنسکرت زبان پر عبور حاصل کیا پھر ہندوستان کے

حالات کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد "تحقیق ما للہند من مقولۃ معقولۃ فی العقل او المرذولۃ" کے نام سے وہ بے نظیر کتاب مرتب کی جو آج تک قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مستند ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ الہند میں بیرونی ہندوستان کی زبان کا عربی زبان سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "بہت سے امور قوموں کے درمیان مشترک ہوتے ہیں، لیکن یہ لوگ (ہندوستانی) ساری چیزوں میں ہم سے مختلف ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تو زبان ہی ہے، عربی ہی کی طرح یہ زبان بھی بڑی وسیع ہے، ایک ہی شے کے مختلف مشتقات سے کئی کئی نام ہیں، ایسا بھی ہے کہ مسمی کئی ہیں اور ان کے لیے اسم صرف ایک، جو صفات کے اختلاف سے اپنے فرق اور محل استعمال کو ظاہر کرتا ہے، ہندوستانی اس پر فخر کرتے ہیں گو زبان میں اس قسم کی تعقیدات، عیب شمار کی جاتی ہیں"۔ اسی طرح بیرونی کی مورخانہ مہارت اور دوربینی اس کی کتاب الآثار الباقیہ سے بھی نمایاں ہے۔ جس میں اس نے مختلف قوموں کے سنین، جشن اور مخصوص تیوہاروں کا ذکر کیا ہے۔ بدقسمتی سے بیرونی کی کئی تاریخی کتابیں ضایع ہو گئیں۔ مثلاً تاریخ فرق، تاریخ خوارزم اور تاریخ غزنوین، یہ کتابیں ابتدائی دور ہی سے نایاب ہیں۔ تاریخ خوارزم سے یاقوت حموی باخبر تھا، لیکن معجم البلدان کی تدوین کے وقت تلاش بسیار کے باوجود اسے پا نہ سکا۔

سائنس کے میدان میں بھی بیرونی کے کارنامے ایسے شاندار ہیں کہ آج بھی ماہرین فن انگشت بدنداں ہیں، آج سے صدہا سال پہلے اس نے زمین کی کشش کا انکشاف کر لیا تھا اس نے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہوتی تو اس پر پہاڑوں اور درختوں کا وجود قائم نہ رہتا۔ بیرونی اس کا جواب

دیتا ہے، ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ زمین ہر چیز کو مرکز کی جانب کھینچتی ہے۔" اسی طرح قانون مسعودی میں وہ لکھتا ہے "لوگوں کا اپنی جگہ کھڑا رہنا اور وزنی اشیاء کا نیچے کی طرف آنا اسی کشش ارض کی وجہ سے ہے۔" بیرونی نے وزن نوعی کی تحدید کی بھی کوشش کی اور اس کے لیے اس نے ایک مخروطی آلہ استعمال کیا، اور ایسی مہارت اور دقت نظر سے کام لیا کہ ماہرین فن حیرت زدہ ہیں مستشرق الڈومیلی نے اس عمل کو بیان کرنے کے بعد اس کی دقت نظری کی دل کھول کر داد دی ہے، شمس و قمر کی روشنی سے متعلق اس نے وہی خیالات ظاہر کئے ہیں، جو آج صدیوں بعد سائنسدان پیش کر رہے ہیں، وہ چاند کو بذات خود روشن نہیں کہتا بلکہ اس کی روشنی سورج سے مستعار سمجھتا ہے، مد و جزر کے اسباب کی وضاحت بھی کی ہے، کتاب الہند میں اس موضوع پر ہندوستانیوں کے نظریات و خیالات کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے: "علماء ہند اگرچہ مد و جزر کے طبعی اسباب نہیں جان سکے مگر وہ یہ جانتے ہیں کہ یومیہ مد و جزر ماہتاب کے طلوع و غروب سے اور ماہانہ مد و جزر ماہتاب کی روشنی کی کمی اور زیادتی سے تعلق رکھتا ہے۔"

ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی بیرونی بہت ممتاز ہے، ہندوستان یورپ اور افریقہ کے بارے میں تو اس کی معلومات حیرت انگیز ہیں، وہ اس زمانہ کے جغرافیہ دانوں کی بہ نسبت شمالی مشرقی یورپ خصوصاً تاتار، اور اسکنڈی نیویا کے باشندوں کے بارے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہے، ان علاقوں کے باشندوں کو وہ صرف ان کے مشہور نام یعنی روسی سے ہی خطاب نہیں کرتا بلکہ الورنک کے نام سے بھی ان کا ذکر کرتا ہے، اس نے روسیوں اور انگریزوں کے ہاں تلواروں کی صنعت اور سائبیریا سے متعلق نادر خیالات کا اظہار کیا ہے، بیرونی پہلا شخص ہے جو دریائے

... GARA اور ان اقوام کا ذکر کرتا ہے جو خط استوا کے انتہائی جنوب میں آباد ہیں، (تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ الادب الجغرافی العربی، کراتشکوفسکی) یہ انکشافات وتحقیقات آج اتنی اہم نظر نہیں آتی ہیں، لیکن صدیوں پہلے ان تحقیقات کے لیے بیرونی کو کیا کچھ نہ کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ دشوار نہیں ہے، بیرونی نے صرف اپنی ذاتی کاوش سے جنوبی افریقہ اور موزمبیق جیسے دور دراز علاقوں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کیں، اس زمانہ میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بحر اٹلانٹک اور بحر ہند کے اتصال میں براعظم افریقہ کا جنوبی حصہ مانع ہے، بیرونی نے اس خیال کی پرزور تردید کی اور اس کے لیے اس نے جو دلیل دی اس سے اس کی تلاش وتحقیق کا اندازہ ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جبل الطارق کے پاس چند شکستہ بحری جہازوں کی تختیاں پائی گئی ہیں جو لوہے کی کیلوں کے بجائے رسی سے جوڑی گئی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بحر ہند سے بہتی ہوئی آئی تھیں، کیونکہ بحر اٹلانٹک میں چلنے والی بحری کشتیاں صرف لوہے کی کیلوں سے جوڑی جاتی ہیں، قانون مسعودی کے تیسرے مقالہ میں اس نے حیرت انگیز وسعت مطالعہ اور دقت نظر کے ساتھ ان دونوں سمندروں کے اتصال اور پھر اس علاقہ کی جغرافیائی صورت حال کے بارے میں بحث کی ہے،

ریاضی میں بھی بیرونی ایک ماہر فن کی حیثیت رکھتا ہے، جدولوں سے کام لینے کا طریقہ سب سے پہلے اسی نے ایجاد کیا تقریباً ۷۰۰ برس بعد گریگوری۔ نیوٹن تھیوری کے نام سے اس کا یہی طریقہ مشہور ہوا، اس کے علاوہ ریاضی کے بیشتر اہم اور بنیادی اصول وقواعد اس نے پیش کیے جیسا کہ جیک۔ ایس ریسلر نے بڑی تفصیل سے انھیں شمار کرایا ہے،

معاشیات میں بھی بیرونی کے چند اہم نظریے ہیں، ڈاکٹر محمد یحییٰ ہاشمی نے بیرونی کی کتاب الجماہیر کی تحقیق و ترتیب کے دوران اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اس باب میں بیرونی مبادلہ میں سہولت کی غرض سے ایک مستحکم قیمت (سکہ) اختیار کرنے کی ضرورت پر زور ڈالتا ہے، لیکن وہ سونے اور چاندی کی اہمیت میں مبالغہ اور غلو کے بارہ میں بھی متنبہ کرتا ہے، اس نے ثابت کیا کہ ان اشیاء کی قیمت حقیقی نہیں بلکہ نسبتی اور اضافی ہے، اس طرح دنیائے معاشیات میں بیرونی نے ایک بہت ہی اہم نظریہ پیش کیا، بون یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کلاوزنغک نے اعتراف کیا ہے کہ جدید معاشی نظریہ اور بیرونی کے مذکورہ نظریہ میں بہت تشابہ ہے، جدید نظریہ کا بھی ماحصل یہی ہے کہ سونے چاندی کی قیمت معدنی نہیں بلکہ اعتباری ہو یعنی قیمت وری ہے، طبعی نہیں، بیرونی نے کنز اموال پر سخت اعتراض کرتے ہوئے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے، والذین یکنزون الذھب وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللہ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یہاں بیرونی نے فِیْ سَبِیْلِ اللہ کی تفسیر یوں کی ہے، فی سبیل انتفاع الناس بتردد ھا فی ایدیھم اثمانا لمصالحھم" (ان لوگوں کے فائدہ کی غرض سے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں ان کی ضروریات کے لیے آتا جاتا رہے) اسی وجہ سے بیرونی سونے چاندی کے برتنوں کی تحریم کا قائل ہے، کیونکہ اس طرح زر مبادلہ کا کام دینے کے بجائے اسب بیکار پڑا رہتا ہے،

بیرونی کا فلکیات میں بھی بڑا بلند مرتبہ تھا، بیرونی کا مطالعہ کرنے والے اسکی اس حیثیت کو نمایاں انداز میں پیش کرتے ہیں، نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ جو مراغہ میں تھی اور جمشید غیاث الدین کی رصدگاہ جو سمرقند میں تھی، ان کی بناء و تشکیل بیرونی

ہی کی تالیفات کی رہین منت ہیں، آلات کے بارے میں بیرونی کی ایجاد و اختراع اور صلاحیت کار غیر معمولی تھی، ڈاکٹر جارج سارٹن نے اس کی اس حیثیت کا اعتراف کیا ہے،

وہ ایک اعلیٰ درجہ کا محقق بھی تھا، وہ کسی بھی بات کو تب تک تسلیم نہیں کرتا تھا، جب تک کہ دلائل و شواہد سے اس کی قطعیت ثابت نہ ہو جائے، وہ قانون مسعودی کے شروع میں رقمطراز ہے "کہ کسی بھی قضیہ میں دلیل کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسم میں روح کی ہوتی ہے، وہ آراء و افکار میں - نیت اور خواہش نفس کے اثر سے اکثر جگہ تنبیہ کرتا رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ مکانیت (تحیز) اور خواہش ایک محقق اور مورخ کو حقیقت پسندی سے دور کر دیتی ہے،

تصنیفات ۱- آثار باقیہ - مستشرق کراتشکوفسکی لکھتا ہے، مشرق کے سارے علمی خزانوں میں اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں"، ویل ڈورانٹ بھی اس کی تائید کرتا ہے، یہ کتاب تعصب سے دور اور صاف ستھرے مطالعہ کا نتیجہ ہے، بیرونی نے یہ کتاب ۱۰۰۰ء میں تالیف کی جبکہ اس کی عمر ۲۰ برس کی تھی، اس کتاب کا موضوع ایرانیوں، شامیوں، یہودیوں، مسیحیوں زردشتیوں، مجوسیوں اور عربوں کے رسم و رواج، جشن، تیوہار اور تقویمات وغیرہ ہے، اس کتاب کی تالیف میں اس نے بعض ایسے مصادر سے استفادہ کیا جو اب نایاب ہیں، بعض جگہ بڑی نادر اور قیمتی روایتوں اور حکایتوں کا ذکر کیا ہے، اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا رجحان ایرانی قومیت کی جانب تھا، لیکن اس کے باوصف وہ اس یقین کا بھی اظہار کرتا ہے، کہ عربی زبان ہی وہ واحد زبان ہے، جس میں ایک علمی زبان بننے کی صلاحیت ہے، اس کتاب کو مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ نے عربی متن اور جرمن مقدمے کے ساتھ ۱۸۷۸ء

میں (Leipzig) لیپزگ سے شایع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن لیپزگ سے ہی ۱۹۲۳ء میں (Harrasowitz) ہراسوفتز آس کا انگریزی ترجمہ شایع کیا، ۱۸۶۹ء روسی مستشرق میکائل مرسلیف نے ایڈٹ کرکے لندن سے شایع کیا۔

۲۔ کتاب الہند۔ اس کتاب کے بارے میں مستشرق روزن (Rozen) کا خیال ہے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے یکتاے روزگار ہے، مشرق ومغرب دونوں ہی کے قدیم علمی لٹریچر میں اس کی کوئی نظر نہیں۔" ڈمیلی نے لکھا ہے کہ "بیرونی نے آسانی سے ایک ایسی کتاب لکھ دی جو قبولیت کی اعلیٰ حدود تک جا پہونچی" عربی اور ہندوستانی ادب میں یہ کتاب ایک بنیادی مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، خصوصاً ہندوستانیوں سے متعلق تاریخ جغرافیہ اور تمدنی معلومات میں یہ کتاب حرف اول بھی ہے، اور حرف آخر بھی جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اس کتاب کا دوسرا نام "تحقیق ماللہند من معقولۃ فی العقل او المرذولۃ" ہے بیرونی نے اس کتاب کے ۸۰ ابواب قائم کیے ہیں، جن میں ہندوستانیوں کے اصول، خدا اور موجودات پر اعتقاد، روحوں کے احوال، مختلف طبقوں کا ذکر اور شریعتوں کی منسوخی وغیرہ کا ذکر ہے، اسی طرح زبان وادب میں صرف ونحو، شاعری اور دیگر اصناف کا ذکر ہے، دریاؤں نہروں کے ساتھ ساتھ تیرتھ یاترا، روزہ، صدقہ ممنوع ومباح اشیاء، کھانے پینے کی چیزوں، شادی بیاہ، سزاؤں، کفاروں، میراث، اور تیوہاروں کا بھی ذکر ہے قدیم ہندوستانی عالموں کی رایوں کا موازنہ مسلمان، یونانی اور ایرانی علماء کی رایوں سے کیا ہے، تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور علوم وفنون میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے ہندوستانی عالموں کی مستند کتابوں کے حوالے اور اقتباسات پیش کرتا ہے وہ خود لکھتا ہے "یہ کتاب صرف دلائل براہین کو پیش کرنے اور مختلف قسم کے اقوال

وانکا جمع کر دینے کے لیے نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے واقعاتی کتاب ہے۔ ہندوستان کی ہر بات کو بیٹے انداز میں پیش کیا گیا ہے، کہیں کہیں ان سے مماثل یونانیوں کے اقوال بھی ذکر کئے ہیں، اس سے مقصد یہ ہے کہ ان دونوں عظیم قوموں کی ذہنی ہم آہنگی یا قربت کا اندازہ ہو جائے، چند مقامات پر صوفیہ اور نصاریٰ کے بعض گروہوں کے ان خیالات کو بھی پیش کر دیا ہے، جو مسلک حلول و اتحاد میں ان ہندی فلاسفہ کے نظریات سے قریب ہیں۔" بیرونی کا طرز بیان محققانہ ہے اور مبالغہ عبارت آرائی سے پاک ہے،

ڈاکٹر سخاؤ نے اس کتاب کو بھی عربی متن کے ساتھ جرمن زبان میں ۱۸۸۷ء میں شایع کیا، ۱۸۸۸ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا، لندن سے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۰ء میں شائع ہو گیا، اس سے پہلے ہندوستان سے متعلق جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ بیرونی کی علمی تحقیقات کے سامنے بچوں کا کھلونا معلوم ہوتی ہیں۔

۳۔ قانون مسعودی۔ یہ بھی بیرونی کی اہم کتاب ہے، اس کتاب کا نام بیرونی نے القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم رکھا، اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کیا، اس سلسلہ میں ایک روایت ہے، کہ جب اس نے یہ کتاب سلطان کے حضور میں پیش کی تو سلطان نے ہاتھی بھر چاندی انعام دی، لیکن بیرونی نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اس رقم خطیر کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی، اس کتاب کا بیشتر حصہ فلکیات سے متعلق ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے فلکیات میں کتاب الخازن پر اعتماد کیا ہے، مقدمہ ہی سے اس کی اجتہادی صلاحیت اور دقت نظری اور مہارت فن کا اندازہ ہوتا ہے، قوانین استکمال کی

اس نیوٹن، گرگیوری تھیوری کے وجود میں آنے سے چھ سو برس پہلے بیرونی نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے، مستشرقین نے اس کتاب پر بھی کافی داد تحقیق دی ہے، اس سلسلہ میں کارل شوائے (Carlschoy) اور رمزی رائٹ (Ramzy-Wright) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان محققین نے کتاب کے فلکیاتی حصہ کا خصوصی مطالعہ کیا ہے، ایک اور مستشرق ای، ویڈمان (Wiedmann) نے اس کتاب کی نویں اور دسویں فصلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا، قانون مسعودی کو مکمل شائع کرنے کا فخر دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کو حاصل ہے، جس نے ۱۹۵۴ء میں تین جلدوں میں یہ کتاب شائع کی ۱۴۸۴ صفحات کی اس مکمل کتاب میں ڈاکٹر امام ابراہیم احمد کا کتاب کے تیسرے مقالہ پر ایک محققانہ مضمون بھی شامل ہے، اس کتاب کے چند نادر نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) نسخہ پیرس:- یہ نسخہ ۵۰۱ھ / ۱۱۰۸ء کا ہے۔ (۲) نسخہ استنبول:- یہ نسخہ ۱۱۳۶ء کا ہے، دائرۃ المعارف نے اس نسخہ کے مطابق قانون مسعودی شائع کی ہے، (۳) استنبول کے کتب خانہ بایزید کا نسخہ:- یہ نسخہ ۱۱۴۳ء میں لکھا گیا، (۴) نسخہ برلن:- اس نسخہ کا سنہ کتابت ۱۱۹۶ء ہے، برلن کی ٹوبن گن یونیورسٹی میں موجود ہے، (۵) لندن کے برٹش میوزیم کا نسخہ، یہ ۱۱۰۴ء میں لکھا گیا، (۶) قاہرہ کے مصری دار الکتب کا نسخہ، اس کی تاریخ کتابت ۱۲۷۴ء (۷) نسخہ آکسفورڈ، یہ ۱۰۸۲ء کا تحریر شدہ ہے، یہ قدیم ترین ہونے کے ساتھ صحیح ترین بھی ہے، یہاں یاقوت حموی کا یہ جملہ قابل ذکر ہے کہ "القانون المسعودی عفی علی اثر کل کتاب صنف فی تنجیم او حساب" نجوم و ریاضی میں جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں قانون مسعودی کے سامنے سب ماند پڑ جاتی ہیں،

۴۔ تحدید نہایات الاماکن :۔ اس کتاب میں خلق عالم، علوم کی نشو و نما، کرۂ ارضیہ، مسافات، طول و عرض وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، اس میں اسکندریہ کی بطلیموس، ابرخس اور بروذس اور بغداد کی شماسیہ، بتانی اور ابوالوفا کی رصد گاہوں کا بھی ذکر ہے، کتاب میں بیرونی نے علمی معلومات کے ساتھ سمت قبلہ کے متعلق اپنی تحقیقات پیش کی ہیں، یہ کتاب محمد بن تاویت طنجی نے بڑی عالمانہ تحقیق کے ساتھ ایڈٹ کر کے انقرہ سے ۱۹۶۲ء میں شایع کی، ان کے پیش نظر کتاب کا وہ مخطوطہ تھا، جو استنبول کے کتب خانہ سلطان محمد فاتح میں موجود ہے، اور جس کا سنہ کتابت ۴۱۶ھ ہے، یعنی بیرونی کی زندگی ہی میں اس کی وفات سے ۲۰ سال قبل لکھا گیا ہے، اسی کتاب پر ایک روسی مستشرق ڈاکٹر بولجاکوف نے بھی ایک تحقیقی کام کیا ہے، جسے نومبر ۶۲ء میں معہد المخطوطات العربیہ نے شایع کیا۔

۵۔ کتاب الصیدنہ :۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب طبی موضوع سے متعلق ہے، زندگی کے آخری دور میں اس نے یہ کتاب مرتب کی، کتاب کے آغاز میں ہی لکھتا ہے کہ صیدنہ، صیدلہ کی نسبت زیادہ معروف ہے، ایک جگہ عربی زبان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بڑے دلچسپ انداز سے کرتا ہے، اس کا جملہ ہے "والہجو بالعربیۃ احب الی من المدح بالفارسی"۔ فارسی کی مدح سے زیادہ مجھے عربی کی ہجو پسند ہے، کتاب میں بیرونی نے پارہ کے سلسلہ میں ایسے خیالات ظاہر کیے ہیں جن کی بنیاد پر بعد میں محققین نے آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ وغیرہ کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کیں۔ ... اٹھایا ہے، مستشرق میکس مایرہوف نے تفصیلی مطالعہ کے بعد اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ اس کتاب کو ۱۹۳۲ء میں شایع کیا، صدیوں پہلے ۱۲۱۱ء میں ...

ابوبکر علی بن عثمان اماینی نے اسے فارسی میں منتقل کیا تھا یہی نسخہ معروف و رائج تھا،
آخر ترکی کے شہر ایک ہ، و صہ میں ایک ناقص عربی نسخہ کا انکشاف ہوا، اس نسخہ میں مولف
نے بہت سے ان معانی اور مفردات کی وضاحت کی ہے، جنھیں بیرونی نے ہندی فارسی
بلوچی، سندھی، افغانی، سریانی اور یونانی زبانوں میں مختلف لہجوں کے ساتھ ہی
ذکر کیا تھا، بغداد کے میوزیم میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، اس کے حاشیوں
پر اس نسخہ کے سب سے پہلے مالک انتامیں ماری الکرملی کی لکھی ہوئی تعلیقات موجود
ہیں، عراقی کی المجمع العلمی نے اس کا ایک عکس شایع کیا ہے، اس کتاب کی ۵ فصلیں
قاہرہ میں شایع ہو چکی ہیں، اس وقت روس کے ایک نامور ماہر کیمیا عبداللہ کا
دیوف، تاشقند کی بیرونی یونیورسٹی میں اسی کتاب پر مزید تحقیق کام کر رہے ہیں۔

۶۔ استخراج الاوتار :- اس کتاب کا موضوع الجبرا اور ہندسہ کے مسائل
ونظریات ہیں، کتاب کا بنیادی موضوع ارشمیدس کی ایک قدیم تھیوری ہے،
اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہیں، ایک خدابخش لائبریری پٹنہ میں، اور دوسرا مراد ملا
کے کتب خانہ استنبول میں ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے خدابخش لائبریری
والے نسخہ کو جو ۶۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے، شایع کر دیا ہے، لیکن ابھی مزید تحقیق وتصحیح کی
ضرورت ہے، مستشرق سارٹر نے اسے جرمن زبان میں منتقل کیا

۷۔ الجماہر فی معرفۃ الجواہر :- معدنیات وبلوریات میں یہ کتاب خصوصی
اہمیت کی حامل ہے، مضامین کے درمیان عربوں کے بہت سے ایسے اشعار
پیش کیے ہیں جو معادن، جواہر بلور وغیرہ کے بارے میں کہے گئے ہیں، جیوکیمسٹری
میں یہ کتاب بڑی اہم سمجھی جاتی ہے، بیرونی نے اس کتاب میں پہلا مختلف پتھروں

اور دھاتوں کے وزن نوعی کا ذکر کیا ہے، پتھروں کے بہت سے ایسے لغوی ناموں کا بھی ذکر ہے، جو اب لغات و معاجم میں نہیں ملتے۔ ایک فائدہ اور بھی ہو کہ اس کے ذریعہ غزنہ اور مشرقی خراسان کے بہت سے عربی دواؤں سے واقفیت ہوجاتی ہے، اس کتاب کے تین نسخے ہیں، ایک نسخہ راشد آفندی کے کتب خانہ میں ہو اس میں غلطیاں بہت ہیں، دوسرا نسخہ میڈرڈ کے اسکوریال لائبریری میں ہے، ادارۂ مخطوطات عربیہ کی ایک ٹیم نے اس نسخہ کا فوٹو لے کر اسے محفوظ کر لیا ہے تیسرا نسخہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ توپ خانہ میں ہے، اور یہ مستند ترین نسخہ سمجھا جاتا ہے، اسے بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد نے ۱۳۵۵ھ میں شایع کر دیا ہے،

مندرجۂ بالا کتابوں کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے بڑے رسالے۔ بیرونی کی یادگار ہیں جن میں سے بعض طبع ہو چکے ہیں اور بعض قلمی شکل میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں،

مراجع :- بیرونی کی تصانیف کے علاوہ اس مقالہ میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے،

(۱) کتاب الانساب سمعانی۔ (۲) تاریخ الادب الجغرافی العربی ترجمہ صلاح الدین عثمانی۔ (۳) تاریخ الحضارۃ الاسلامیہ، ماجد عبدالمنعم۔ (۴) تراث العلمی العربی، قدری حافظ طوقان، (۵) الحضارۃ العربیہ، ترجمہ غنیم عبدون (۶) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ابراہیم الشنتاوی، (۷) طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ (۸) العلم عند العرب الدومیلی، (۹) قصۃ الحضارۃ ول ڈیورانٹ، (۱۰) معجم الادبا یاقوت رومی، (۱۱) مناہج العلماء المسلمین فی البحث العلمی، ترجمہ انیس فریحہ،

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

یہ مقالہ ملی کنونشن کی تعلیمی کمیٹی میں ۳ اکتوبر ۸۰ء کو آزاد بھون نئی دہلی میں پڑھا گیا،

از مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ملی کنونشن میں اہل فکر کو جن مسائل پر غور کرنا ہے، ان میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا مسئلہ بھی ہے، اس پر گفتگو کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں، مثلاً تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لیا جائے اس کے وجوہ و اسباب تلاش کئے جائیں۔ ۴۷ء کے بعد سے اس کی ترقی و تنزلی۔ رفتار سے روشناس کرایا جائے۔ دینی و دنیوی تقسیم کرکے اس پر تبصرہ کیا جائے، اور پھر مستقبل کے لیے لائحہ عمل کی نشاندہی کیجائے وغیرہ۔

بلاشبہ تعلیمی پسماندگی کا عنوان متعلقہ تمام مباحث کو شامل ہے، اور آپ حضرات سے توقع ہے کہ تمام مباحث پر سیر حاصل گفتگو کرکے مستقبل کے لیے مؤثر لائحہ عمل تیار کریں گے لیکن مجھے اس وقت چند اہم باتوں کی طرف توجہ دلانی ہے (۱) سب سے پہلی بات تعلیمی میدان میں قدیم و جدید کی کشمکش ہے اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں "اس کشمکش" نے عرصہ سے ایک طوفان برپا کر رکھا ہے کہ ہر قدیم شے دین بن گئی جو محبوب ہے، اور ہر جدید شے دنیا بن گئی جو مذموم ہے منطق و قدیم فلسفہ دین ہے، ... سائنس و جدید فلسفہ دنیا ہے، تیر اندازی و شوٹ دین ہے، اور این۔ سی۔ سی و فوجی تربیت،

دنیا ہے، عبادت و اخلاق کی تعلیم دین ہے، اور ریسرچ و تحقیق کی تلقین دنیا ہے، غرض جس پر قدامت کی چھاپ ہو وہ سب دین ہے، اور جدت کی جس پر مہر لگی ہو وہ سب دنیا ہو نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تصور مسلمانوں کو زندہ رہنے کے قابل کبھی نہیں بنا سکتا لامحالہ انکو مسجد و مدرسہ کی چہار دیواری میں محدود ہونا پڑے گا، اور پھر بھی انکی عزت و ناموس کا سودا ہوتا رہے گا،

اسلام دین فطرت ہے وہ نہ قدیم و جدید کی بحث میں الجھا ہے اور نہ چیزوں کی اچھائی و برائی کا یہ تصور دیتا ہے، بلکہ اس کے پیغمبر (فداہ ابی و امی) صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ	ہر اچھی و دانائی کی بات دانشمند کی
الحکیم فحیث وجدھا	گم شدہ پونجی ہے، جہاں بھی وہ ملے
فھو احق بھا[۱]	اس کا وہ زیادہ مستحق ہے،

ایک روایت میں "ضالۃ المؤمن"[۲] ہے، یعنی مؤمن کی گم شدہ پونجی ہے جس کو اپنی سمجھکر لینا، قبول کرنا چاہئے کسی قسم کی تنگدلی و احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، محدثین نے اس حدیث کو کتاب العلم میں ذکر کیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ "علم" اس کا اولین محل ہے،

اسلام نے امت مسلمہ کو ایک مقام و منصب عطا کیا ہے، جس کے پیش نظر اس نے دو قسم کے علم کی طرف رہنمائی کی ہے،

(۱) وہ علم جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے،

(۲) وہ علم جس کا تعلق عقل انسانی سے ہے،

---

[۱] ترمذی و ابن ماجہ و مشکوٰۃ کتاب العلم [۲] ترمذی کتاب العلم و ابن ماجہ کتاب الزہد

قرآن میں ہے۔

اقرأ باسم ربك الذی	اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے
خلق خلق الانسان من علق	پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے
اقرأ وربك الاکرم الذی	پیدا کیا۔ آپ پڑھیے آپ کا رب
علم بالقلم علم الانسان	نہایت کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے
مالم یعلم[1]	علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو
(علق)	جانتا نہ تھا،

یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ انسان کی پیدائش جس مادہ سے ہوئی اس کے اعتبار سے اگرچہ وہ کسی عزہ شرف کا مستحق نہیں ہے لیکن علم کی بدولت وہ ترقی کی ہر منزل پر پہنچ سکتا ہے،

دوسری جگہ ہے،

وعلم آدم الاسماء کلھا[2]	اور اللہ نے آدم کو کل الاسماء سکھائے

مفسرین کے بیان کے مطابق "الاسماء" سے مراد اشیاء کی ذات ان کے خواص علم کے اصول صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیات وغیرہ ہیں[3]

ظاہر ہے کہ انھیں پر ریسرچ اور تحقیق کر کے موجودہ علم و فن کے مختلف شعبے قائم ہوئے ہیں، پھر علم سے مراد علم تفصیلی نہیں، علم اجمالی ہے، علماً اجمالیا ولیس المراد العلم التفصیلی[4] جس سے صلاحیت کی طرف نشاندہی ہے جو پیدائش ہی کے وقت انسان کے اندر ودیعت کر دی گئی تھی، پھر انسان کی غیر محدود خواہشوں اور ضرورتوں کے تحت مختلف علوم

---

[1] علق ع ۱ [2] بقرہ ع ۴ [3] قاضی عبداللہ بیضاوی ع ۴ [4] الرازی تفسیر کبیر ع ۴ [5] قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری مدکوع ۴ ص ۵۵

وفنون کی شکل میں یہ صلاحیت ظاہر ہوتی رہی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح علم وحی کی تفصیلات بیان کیں اسی طرح عقلی علوم کی چیزوں سے استفادہ کر کے رہنمائی کی، شاید آپ کو یہ سنکر تعجب ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اپنے زمانہ کے جدید ترین قوت وطاقت کے آلات استعمال فرمائے وہ یہ تھے،

دبّابہ۔ یہ خاص قسم کی گاڑی تھی، جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑہ منڈھ کر بنائی جاتی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔[۱]

ضبر۔ لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس کے ذریعہ پیٹھ کی تیر سے حفاظت ہوتی تھی۔[۲]

منجنیق۔ یہ ایک قسم کی مشین تھی، جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں پر برسائے جاتے تھے، اور قلعہ شکنی کا کام لیا جاتا تھا،[۳]

حسک۔ یہ ایک خاردار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا ہتھیار تھا، جس کو قلعہ اور لشکر کے چاروں طرف بکھیر کر راستہ کو مخدوش کیا جاتا تھا،[۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آلات کو برآمد کر کے غزوۂ طائف میں استعمال فرمایا[۵] بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود چلائی اور حسک اپنے ہاتھ سے بکھیری۔

ابن ہشام کہتے ہیں۔

حدثنی من اثق بہ ان رسول اللہ　　جس شخص پر میں اعتماد کرتا ہوں

---

[۱] ابو القاسم عبد الرحمن السہیلی الروض الانف شرح سیرۃ النبویہ لابن ہشام فصل ذکر تعلیم اہل الطائف

[۲] ایضاً [۳] لسان العرب [۴] القاموس المحیط۔ [۵] تقی الدین احمد بن علی مقریزی امتاع الاسماع

اول من رمی فی الاسلام بالمنجنیق رمی اہل الطائف[1]	اس نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ اسلام میں سب سے پہلے طائف والوں پر رسول اللہؐ نے منجنیق چلائی ،

مقریزی کہتے ہیں۔

ونصب رسول اللہ المنجنیق علی حصن الطائف[2]	رسول اللہ نے طائف کے قلعہ پر منجنیق نصب کی۔

دوسری جگہ ہے۔

ونثر رسول اللہ الحسک حول الحصن[3]	رسول اللہ نے قلعہ کے گرد حسک بکھیری۔

جس منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا، اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگائی گئی تھی، اور بعض کے نزدیک حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے بنایا تھا[4]

طائف فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا، اور "جرش" جا کر مذکورہ بالا ایجادات میں مہارت حاصل کی[5]،

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا، جو اس وقت کی دوسری بڑی طاقت "رومن امپائر" کے قبضہ میں تھا۔ اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا، شرجیل بن حسنہ

---

[1] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ذکر غزوۃ الطائف۔ [2] امتاع الاسماع حصن الطائف [3] امتاع الاسماع حصن الطائف [4] امتاع اسماع حصن الطائف [5] ابن ہشام السیرۃ النبویہ ذکر غزوۃ الطائف والروض الانف ذکر تعلیم اہل الطائف

نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسے فتح کیا تھا[۱] جرش فتح ہونے کے بعد ہتھیار سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو انھوں نے اسے اور زیادہ ترقی دی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی تفصیل سے کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہونا چاہئے، بلکہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ تفصیل ذکر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مذہب کے غلط تصور نے ایک بڑے طبقہ میں یہ خیال عام کر دیا ہے کہ صرف مروجہ مذہبی مراسم و اعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا، جس کو دنیا والے انتھک جد و جہد اور محنت و قربانی سے حاصل کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات قدرت کے قانون عدل کے خلاف ہے جبتک اس خیال کی اصلاح نہ ہوگی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی طرف توجہ نہ ہوگی،

(۳) دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانی ہے، وہ تعلیم حاصل کرنے کی دشواری اور اس کی گرانباری ہے، ہماری قوم کے بہت سے ذہین و ہونہار بچے اس بنا پر تعلیم نہیں حاصل کر پاتے کہ ان کا درسگاہوں میں داخلہ نہیں ہوتا، تاریخ کا یہ مسلمہ فیصلہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کے لئے گہوارہ تیار کرتی اور پھر خود ہی اپنی موت کے لیے قبر کھودتی ہے، محض حکومت کے سہارے نہ کوئی قوم زندہ رہتی اور نہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرسکتی ہے، ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ خود اپنی قائم کردہ درسگاہیں ہوں، جن میں طالب علم کے داخلہ کی سہولتیں فراہم ہوں، لے دے کے ایک عظیم درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہے، اول تو کروڑوں کی قوم کے لیے وہ تنہا کافی نہیں ہے، پھر قوانین و ضوابط کے مطابق وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے وقف نہیں ہے اس کو اپنے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی کھلے رکھنے پڑتے ہیں، اور علاوہ ازیں اس وقت وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ آگے اس کی کیا نوعیت ہوگی،

---

[۱] فتوحات شام و مسائر نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعربی حاشیہ ۳۲۲

ان حالات کے پیش نظر اس کی حیات جاری رکھنے کے سبب تہ جبتک بہت سی مزید چھوٹی بڑی درسگاہیں قائم نہ کی جائیں گی تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں پیش رفت نہ ہو سکے گی، ابتک تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں جتنی کوششیں ہوئیں وہ یکطرفہ تھیں، علمائے مذہب نے خالص مذہبی درسگاہیں قائم کیں، اور دنیا کے سربراہوں نے دنیاوی اغراض کے لیے اسکولوں کالجوں اور یونیورسیٹیوں کے قیام کی کوشش کی، شاید اسی بنا پر وہ کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں ضرورت ہے کہ یہ کوششیں دو طرفہ ہوں تعلیم علم وحی اور عقلی علوم کے نمائندے ملکر جامع درسگاہیں قائم کرنے کی جدوجہد کریں، اسلام دین و دنیا کی تفریق سے ناآشنا ہے وہ دنیا کو مطیۃ الآخرہ (آخرت کی سواری) سمجھتا ہے، اس کے نزدیک عبادات میں بھی دنیاوی مصالح پیش نظر ہیں،

لان العبادات لاتؤدی — کیونکہ عبادات ان کے (دنیاوی مصالح)

الا بھن وما لایتم الواجب — بغیر پوری نہیں ہوتیں اور جس کے بغیر

الا بہ فھو واجب۔ — واجب کی ادائگی نہ ہو وہ بھی واجب ہے

دونوں نمائندوں کی متحدہ کوشش سے توقع ہے کہ وہ اجازت نامہ (ویزا) بھی مل جائے جس کی برابر خواہش اور کوشش رہتی ہے یعنی عقلی علوم کی مملکت میں وحی الٰہی کے داخلہ کا "ویزا" اور وحی الٰہی کی مملکت میں عقلی علوم کے داخلہ کا اجازت نامہ۔

درسگاہیں قائم کرتے وقت ان مکاتب سے غفلت نہ برتنا چاہیے جو ہماری ملی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، خصوصاً ان علاقوں میں جہاں [illegible] آکر مرتد ہو گئے تھے پھر علماء کی کوششوں سے [illegible] ان کے بچے دین کی ابتدائی تعلیم [illegible]

اوقاف کی جانب سے خاصا کام ہوا ہے، اللہ ان کی محنت کو قبول فرمائے، لیکن یہ کام اس قدر وسیع، ہمہ گیر اور کثیر المصارف ہے کہ تنہا ایک جماعت کے بس کا نہیں ہے، ملی کنونشن کو بھی اس کی طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے،

اسی طرح تعلیم کی گرانباری کا مسئلہ بھی بے حد اہم ہے قوم کی مفلوک الحالی ظاہر ہے جو لوگ نان شبینہ کے محتاج ہوں اور جن کے قوت لایموت کا حصول بھی دشوار ہو ان سے کس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تعلیم کی موجودہ گرانباری کو برداشت کرسکیں گے قوم کے صاحب ثروت اصحاب کا فرض ہے کہ اس کے لیے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کریں یہ کوئی وقتی مسئلہ نہیں ہے، کہ ہنگامی چندہ سے کام چل جائے اس کے لئے کروڑوں کی رقم جمع کرنی پڑے گی اور اسے ایسے نفع بخش کاروبار میں لگانا پڑے گا کہ روز روز کی دریوزہ گری سے نجات ملے اور قوم کے ہونہار بچے غربت کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہ رہیں ان بچوں کی امداد کے ساتھ ان کے اندر یہ احساس بھی پیدا کرنا پڑے گا کہ جب وہ برسر روزگار ہو جائیں تو اپنی امدادی رقم کو قومی فنڈ میں واپس کریں، تاکہ آئندہ نسلوں کے کام آئے۔

(۳) تیسری بات جس کی طرف توجہ دلانی ہے، وہ ملازمتوں کا مسئلہ ہے، مقصد کے لحاظ سے شاید سب سے زیادہ مظلوم و محروم علم ہے، جو برائے زندگی کے بجائے برائے ملازمت رہ گیا ہے، ہماری قوم کے کتنے ہی ہونہار نوجوان ہیں، جو ملازمت کی ڈگری کو علم کی سند بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن فکر معاش سے مجبور ہو کر اپنی صلاحیتوں کی خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے قابل بھی نہیں رہتے ہیں، جبتک ملازمت کا مسئلہ حل نہ ہوگا تعلیمی پسماندگی کا مسئلہ حل ہونے کی

زیادہ توقع نہیں ہے،

تیس سال سے ہم حکومت کو آزما رہے ہیں، اور اس کے وعدوں پر جی رہے ، اور بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس پسماندہ قوم کی ملازمتوں کے لیے حکومت نے "نرم گوشہ" تو کیا رکھتی قوم کے نوجوان اپنی جدوجہد سے اگر دوسرے ممالک میں جو ملازمتیں تلاش کرتے ہیں تو وہاں کو جانے میں بھی حکومتی سطح پر طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اب غالباً وقت آگیا ہے کہ اس کنونشن کے ذریعہ سیٹوں کے "رزرویشن" کا مطالبہ کیا جائے جس طرح دوسری پسماندہ قوموں کے لیے رزرویشن موجود ہے، اسی طرح دوسرے ممالک کی ملازمتوں میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں، یا مسلم بچوں کو بھیجنے میں جانبداری سے کام لیا جا رہا ہے انکو دور کرنے کی منظم جدوجہد کی جائے۔

آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں "حسن" کی کمی نہیں "آن" کی کمی ہے، جبتک ہماری زندگی میں "آن" نہ پیدا ہوگی نہ کوئی کوشش بارآور ہوگی اور نہ کسی مطالبہ میں جان پیدا ہوگی، اور سب سے آخر میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے سوال کریں گے کہ تم میں سرمایہ دار و زردار تھے، ملت کے محافظ و قائد تھے، جماعت کے امیر و خانقاہ کے شیوخ تھے، گریجویٹ آفیسر و نامور پروفیسر تھے ان سب کی موجودگی میں میرا نام لینے والے کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے ان کے لئے کیا انتظام کیا تھا، وہ تعلیم سے محروم و معاش سے مجبور تھے، ان کے لیے کتنے ادارے قائم کئے تھے، ہمیں توقع ہے کہ اس جواب دہی کے تصور کے ساتھ پسماندگی کے مسائل حل کریں گے،

مقالات شبلی تعلیمی

سلسلۂ مقالات کی تیسری اہم جلد جس کا موضوع صرف تعلیم ہے قیمت

اسد اللہ وجہی کے مذہبی عقائد

از۔ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی صاحبہ، حیدرآباد

قطب شاہی دور کے باکمال شاعر اور نثر نگار اسد اللہ وجہی کی ادبی سرگرمیاں محتاج تعارف نہیں۔ قطب مشتری، اور سب رس اس کی ادبی عظمت کی شاہد ہیں، سب رس تو گولکنڈہ کے ادبی گلستان کا گل سرسبد ہے، وجہی کے فن کے ہر پہلو پر نقادوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، لیکن جہاں تک اس کی شخصی زندگی کا تعلق ہے، محققین اس راستے پر زیادہ دور تک نہ چل سکے، اس لئے حیات وجہی کے اکثر گوشے ابھی تک پردۂ خفا ہی میں ہیں، اس کے مذہبی عقائد کے متعلق تو اور بھی مبہم باتیں بیان کی جاتی ہیں، کیونکہ سب رس، اور قطب مشتری کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں متضاد تصویریں سامنے آتی ہیں، مثنوی قطب مشتری میں وجہی نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ حضرت علیؓ کا ذکر کیا ہے، اس میں نعت تو صرف چھبیس اشعار پر مشتمل ہے، لیکن حضرت علیؓ کی منقبت میں پچاس اشعار ہیں، سب رس و قطب مشتری دونوں تصانیف میں ذکر معراج کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کی برتری و فضیلت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس سے شبہ ہوتا ہے، کہ شاید وجہی کا تعلق شیعہ فرقے سے رہا ہو، مثنوی قطب مشتری میں اس قسم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

خلافت تے اونچا ترا نام تھا	خلافت تجے جس تا عار تھا
بڑا تو یچ آخر بڑا توں اصل	توں ظاہر میں آخر ہے باطن ازل

نہ تھا دل تر اخر دی پانے — خلافت کیا دین بنہا لنے
تر امرتبا اونچ تے اونچ ہے — اول توں ہو آخر کوں بی تونچ ہے
بڑا توں بڑے ہر تے سب یو کام — خلافت ہوی ختم تجہ پر تمام
علیؓ کا محب نیں جکوی سچ توں جان — حرامی پنے کا وہی ہے نشانؒ[1]

لیکن سب رس میں وجہی نے خلفائے راشدینؓ کا ذکر بھی احترام کے ساتھ کیا ہے:

ابا بکر صدیقؓ صادق ہیں خاص — کئے خارجیاں کوں شریعت میں راس
عمرؓ جب نبی کے امت میں ہوئے — یہودی ہو بنے جو تھے سر نوے
جمع کر جو عثمانؓ قرآن کوں — شرم کا دتے زور ایمان کوں
تو نیا کفر علیؓ بت لئے ذوالفقار — خدا بعد محمدؐ بھی چاروں ہیں یارؓ[2]

سب رس میں بھی ذکر معراج کے ساتھ ہی حضرت علیؓ کا ذکر ملتا ہے، لیکن ساتھ ہی خلفائے راشدینؓ کی بزرگی و عظمت کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے،

"ابابکرؓ عمرؓ ہور عثمانؓ جنوں کی نیکی جانتا سب جہاں حضرتؐ کے یاراں ہیں بزرگواراں ہیں، ایکس تے ایک سب پہلے جیوں خدا رسولؐ فرمایا تھا، یوں چلے۔ لاف نہیں کیے۔ خلاف نہیں کئے، حق پر چلنہارے ایچ اچھے ہیں، خدا کے پیارے ایچ اچھے ہیں، حضرتؐ کے یار جنو سول حضرت کرتے تھے پیار۔ آخر بعد از حضرت کے بیٹے حضرتؐ کی ٹھار۔"[3]

اگر وجہی شیعہ تھا تو خلفائے راشدینؓ سے ایسی عقیدت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

۱؎ قطب مشتری، مرتبہ۔ مولوی عبدالحق، ص ۱۰۳ ۲؎ سب رس، مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۰ ۳؎ سب رس، مرتبہ۔ مولوی عبدالحق۔ ص ۹۰

میرا خیال ہے کہ قطب مشتری میں شیعہ عقائد کا اظہار صرف وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا، کیوں کہ قطب شاہی حکمران خصوصاً محمد قلی قطب شاہ مذہب اثنا عشری کا پابند ہی نہیں بلکہ اس میں غلو رکھتا تھا، ہلال محرم کے نمودار ہوتے ہی ماتم کا اہتمام شروع ہو جاتا تھا، شاہی توشک خانے سے سیہ لباس تقسیم کیے جاتے، شاہی صرفے سے عزاداری کا انتظام کیا جاتا، بڑے پیمانے پر غم حسینؓ منایا جاتا، اس ماحول میں محض مصلحت اندیشی کی بنا پر وجہی نے جس کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اپنی تصانیف میں بادشاہ کے مذہبی رجحانات کا خیال رکھا، قطب مشتری کا ہیرو خود محمد قلی قطب شاہ ہے، وجہی کے لیے ضروری تھا کہ اپنے مذہبی عقائد کو پس پشت ڈال کر بادشاہ کی خوشنودی کو مد نظر رکھے، یہی وجہ ہے کہ قطب مشتری میں وجہی نے بار بار حضرت علیؓ کا ذکر کیا ہے، ورنہ در اصل وہ سنی تھا، اسی لیے اس نے خلفائے راشدینؓ کا ذکر احترام سے کیا ہے، اس کے علاوہ اب تک وجہی کے صرف دو مرثیے دریافت ہوئے ہیں، ان میں سوز و گداز کی وہ گرمی نہیں جو کہ ایک شیعہ شاعر کے حقیقی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے، ان مرثیوں میں سے ایک کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے:

یہ مرثیہ حضرت حسینؓ کے نام سے معنون ہے، اس میں وجہی نے نہایت سیدھے سادے انداز ...... میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے، وہ بہت ہی پرگو و مشاق شاعر تھا، اگر چاہتا تو اس صنف میں بھی بلند پایہ مضامین لکھ سکتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف مرثیے کی صنف کو بھی برتنے کے لیے قلم بند کر دیا ہے، دوسرا مرثیہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی ایک بیاض (مخطوطہ نمبر ۹۰۹) میں محفوظ ہے، اس میں بھی مرثیے کا مخصوص مرکزی خیال مفقود ہے، اس میں حسینؑ کے غم میں مبتلا ایک عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے،

جس کے کچھ اشعار یہ ہیں

کالی نہ گوری چیر بندی پیٹی ہے، جوں کالا سندری
کالے لٹاں کالے بھواں کالی گلے میں گلسری

نیلے ہوے نیلم سنگل لعلاں کے دل میں لہو جمیا
موتیاں کوں سب رو رو پلکیں کھاج ہوی سب بھری

زلفاں دو سر گرداں ہو دو طرف پیچاں کھا پڑے
بھرتے ہیں آہاں گھنگرو کمری تے پکڑیا ہتر پڑی

ٹکڑے دسن نا بات کے تل کالے خشخش لب کھجور
عاشور کا یو تا ریز اعشاق خاطر دھن کری

ماتم کوں سب سنگار کر بولیا وجہی گن تمام
کیسی شاعری کیا گن لکھیا دیکھ طبع کی زور اوری

مرثیے میں ان امور کا ذکر اس کی تقدیس آمیز فضا کے لیے بالکل موزوں نہیں بلکہ ایک طرح سے یہ اس کی تضحیک ہے، وجہی کے اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھنے کا سب سے بڑا ثبوت سب رس کا وہ نسخہ ہے جو کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے، اس نسخے کے کاتب نے جو ترقیمہ لکھا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وجہی نہ صرف سنی تھا، بلکہ چشتیہ سلسلہ کا مرید تھا، ترقیمے کی عبارت اس طرح ہے۔

تمت الکتاب سب رس گفتہ ملا وجہی ساکن حیدرآباد ملا وجہی چشتی کہ پیر شاہ علی متقی کہ پیر میاں شاہ باز ایم۔ محمد چشتی گذاشت تحریر فی التاریخ بست و چہارم ماہ شوال بدست ضعیف و نحیف حب اللہ چشتی ساکن شاہجہان آباد غلام فخر اللہ خادم حضرت غریب اللہ ۱۱۸۳ھ

---

[1] سب رس مملوکہ ادارۂ ادبیات حیدرآباد مخطوطہ نمبر ۴۹

غزل

از

جناب ڈاکٹر سلام صاحب سندیلوی شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

اپنے داغوں کا ترے سامنے خرمن رکھ دوں
میری خواہش ہے ترے ہاتھ پہ گلشن رکھ دوں

اشک برساؤں ترے عارضِ گلگوں پر میں
جی میں آتا ہے کہ انگارے پہ ساون رکھ دوں

اپنی راحت کے لئے کیوں میں اسے دوں زحمت
شاخِ بوسیدہ پہ کیوں بارِ نشیمن رکھ دوں

کچھ زباں سے نہیں کہتی ہے غمِ دل شبنم
اس کے منہ میں ذرا برگِ گلِ سوسن رکھ دوں

آپ کرتے ہیں زمیں پر مہ و انجم کی تلاش
آپ کے سامنے اشکوں سے بھرا دامن رکھ دوں

شرم کی وجہ سے نظارہ نہیں کرتی ہو
چشمِ نرگس پہ ذرا پلکوں کی چلمن رکھ دوں

کتنے تارے ہیں مگر پھر بھی ہے ظلمت ہر سو
چرخ پر داغِ جگر کا مہ روشن رکھ دوں

کچھ تو ہمدردی کے جذبات کو دو وقعت ہو
سنگ میں آئینے کے قلب کی دھڑکن رکھ دوں

غیر کے دل کا بھی ارمان نکل جائے سلام
برق کے سامنے خاشاکِ نشیمن رکھ دوں

مطبوعات جدیدہ

حلال و حرام ۔ مترجمہ جناب شمس پیرزادہ صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰ قیمت تحریر نہیں ۔ پتہ ۔ الدار السلفیہ جامع مسجد بلڈنگ مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ بمبئی ۱۱۰۰۰ ۴

یوسف القرضاوی قطر کے ممتاز عالم، مشہور خطیب اور نامور مصنف ہیں وہ جامع ازہر مصر کے فاضل اور اس وقت ٹریننگ کالج دوحہ میں پروفیسر ہیں، انھوں نے دینی و فقہی مسائل پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، ان میں فقہ الزکوٰۃ اور الحلال والحرام فی الاسلام زیادہ اہم ہیں زیر نظر کتاب اسی موخر الذکر کا اردو ترجمہ ہے، یہ چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں حلال و حرام کی اہمیت اور اس کے بعض اصول و ضوابط کو تحریر کیا گیا ہے کہ تحلیل و تحریم کا اصل حق صرف خدا کو ہے، دوسرے باب میں انفرادی زندگی کے اہم مسائل مثلاً کھانے پینے کی چیزوں پہننے کے کپڑوں، سکونتی مکانات، کسب معاش کے ذرائع، تجارت، ملازمت، زراعت اور صنعت و حرفت کے علاوہ رقص و تصویر گری وغیرہ کے متعلق اسلام کے قوانین تحلیل و تحریم بیان کئے گئے ہیں، تیسرے باب میں خاندانی زندگی سے متعلق حلال و حرام کی تفصیل پیش کی گئی ہے، اس میں نکاح، طلاق اور زنا کے علاوہ زوجین، والدین اور اولاد کے حقوق کا ذکر بھی آگیا ہے، چوتھے باب میں اوہام و خرافات، سحر و تعویذ اور شگون وغیرہ پر اعتقاد کو باطل ثابت کیا گیا ہے، اور جاہلی عصبیت، شراب، کھیل کود، تفریح اور مسلمانوں کے باہمی روابط نیز غیر مسلموں کو

تعلقات کے بارہ میں حلال و حرام مسائل بیان کئے گئے ہیں، کسی ایک کتاب میں حلال و حرام کے تمام مسائل کا احاطہ مشکل ہے، تاہم مصنف نے بہت سے ضروری مسائل کی حلت و حرمت واضح کر دی ہے، گو ان میں بیشتر مسائل کا فقہ کی عام کتابوں میں بھی ذکر موجود ہے، لیکن وہ متفرق ابواب میں الگ الگ تھے، مصنف نے ان کو یکجا کر دیا ہے، متعدد جدید مسائل الکٹرک شاک، بند ڈبوں کا گوشت، سونے کا قلم اور گھڑی کے استعمال، فوٹو گرافی، تعدد ازدواج فیملی پلاننگ، سود، بیمہ، لاٹری اور فلم وغیرہ کے بارے میں احکام بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے جابجا ان احکام کی حکمتیں بھی واضح کر دی ہیں، وہ کسی متعین فقہی مسلک کے پابند نہیں ہیں اس لئے ممکن ہے کہ خاص خاص مسلکوں سے وابستہ اشخاص کے نزدیک ان کی بعض رائیں درست نہ ہوں، تاہم انھوں نے اپنے خیالات کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل لکھے ہیں اور آج کل کے جدت پسندوں کی طرح مغرب سے مرعوب نہیں ہیں،

انیسیات:۔ مصنفہ پروفیسر سید مسعود حسین رضوی ادیب، مرتب جناب صباح الدین عمر صاحب تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت نفیس صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۳ روپیہ ۵۰ پیسے ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ،

میر انیس مرحوم اردو کے ایک بلند پایہ شاعر تھے، پروفیسر سید مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم ان کے بڑے عقیدت مند تھے، چند مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے متعلق انھوں نے وقتاً فوقتاً متعدد مضامین بھی لکھے تھے، زیر نظر کتاب ان ہی مضامین کا مجموعہ ہے، اسے مرحوم کی زندگی ہی میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی تجویز کے مطابق اس کے سابق سکریٹری صباح الدین عمر صاحب نے خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کر لیا تھا، لیکن اب اشاعت کی نوبت آئی ہے، مضامین دو طرح کے ہیں، پہلی طرح کے مضامین میں میر صاحب کی سیرت و شخصیت کے خط و خال

نمایاں کئے ہیں، پہلے مضمون میں ان کی زندگی کے عام حالات، تعلیم، شعر گوئی اور ادبی خوبیاں بیان کی
اور مرثیہ خوانی کے انداز، سفر حیدرآباد اور علالت و وفات کے متعلق معلومات ہیں اور
دوسری طرح کے مضامین میں ان کی شاعری پر مختلف حیثیتوں سے بحث کر کے ادبی
محاسن نمایاں کئے ہیں اور مرثیہ کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی ان کے کمال کا
اظہار کیا گیا ہے، ایک مضمون میں میر صاحب کے ایک اہم اور مشہور مرثیہ "جب
قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تجزیہ کر کے اس کی خصوصیات دکھائی ہیں آخری
مضمون میں ان کے سات نادر خطوط نقل کئے گئے ہیں، اس کی ابتدا میں ان کی خطوط نگاری
کی خصوصیات اور ساتوں خطوط کا خلاصہ دے دیا ہے گو یہ میر صاحب پر کوئی مستقل اور
جامع کتاب نہیں ہے، تاہم اس سے ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلو سامنے آجاتے
ہیں، اس سے ان پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، اتر پردیش اردو اکادمی نے اپنے
سلسلۂ مطبوعات کی ابتدا اسی کتاب سے کی ہے، جو فال نیک ہے،

زرگل :- مرتبہ مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف تقطیع متوسط کاغذ
کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۲۲ قیمت عــلہ پتہ (۱) انجمن ترقی اردو بک ڈپو
اردو بازار دہلی (۲) سنٹرل بک ڈپو دریبہ بازار دہلی۔

مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم کے لائق فرزند مولوی حفیظ الرحمٰن واصف کو دینی
علوم اور شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے، انھوں نے موزوں طبیعت بھی پائی ہے اس لئے
کبھی کبھی مشق سخن بھی کرتے ہیں، اب انھوں نے "زرگل" کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام شائع
کیا ہے، جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے، ان کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے، اور داغ
مرحوم کے خلیفۂ خاص نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے شاگرد ہیں، ان کی غزلوں میں

قدیم طرز تغزل کی خصوصیات کے علاوہ [illegible] بیان کی لطافت بھی ہے، کچھ قومی اور مذہبی
نظموں کے [illegible] مرثیے قطعات اور رباعیات بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جن سے
مصنف کے حسن بیان اور شدت تاثر کا اندازہ ہوتا ہے، امید ہے کہ قدیم رنگ سخن
کے قدردان اس مجموعہ سے محظوظ ہوں گے۔

قرآن کی روشنی۔ از۔ مولوی فدا حسین صاحب ناشر مکتبۂ قرآن کدہ شہاب
خان اٹاوہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۰۴، قیمت ۸؎

مصنف نے یہ کتاب ان لوگوں کے لیے لکھی ہے، جو عربی زبان سے ناواقف ہیں
اور ان کے لیے اس کا موقع بھی نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ترجموں اور تفسیروں کو پڑھ سکیں
ایسے مصروف لوگوں کے لیے انھوں نے مختلف عنوانات کے ماتحت سلیقہ کے ساتھ
قرآن مجید کی آیات کے ترجمے عام فہم زبان میں لکھ دیئے ہیں، تاکہ معمولی استعداد کے لوگ
بھی تھوڑا سا وقت صرف کرکے قرآنی ہدایات سے واقف ہو جائیں۔

مجموعۂ حمد و نعت۔ اس مختصر کتاب میں مولوی فدا حسین صاحب نے اسکول کے بچوں اور عام
شائقین کے لیے مختلف شعراء کے حمد و نعت کے پر اثر اشعار جمع کر دیے ہیں یہ کتاب بھی
مکتبۂ قرآن کدہ شہاب خان اٹاوہ سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

آئینۂ محرم۔ یہ چھوٹے سائز کا ۴۸ صفحات کا رسالہ ہے جس میں مولوی فدا حسین صاحب نے محرم کی حیثیت صحابہ
کرام کی عظمت اور شہادت کی اہمیت بیان کی ہے اس کے بعد محرم کی بدعات تعزیہ علم [illegible] کے مفاسد
بیان کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں علماء دین، مفتیان کرام اور ائمۂ مجتہدین کی کتابوں کے اقتباسات
[illegible] کو ثابت کیا ہے اس سلسلہ میں حضرت سید [illegible] حضرت [illegible] حضرت [illegible]
مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے بیانات [illegible] مولانا [illegible]
مولانا عبد الحی اور مفتی احمد رضا خاں کے فتاوی نقل کیے گئے ہیں [illegible] بدعات کے [illegible]
ہے یہ کتاب [illegible] بالا سے مل سکتی ہے